مقالات

حضرت ضیاء الامت

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور- کراچی ○ پاکستان

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقالات

Marfat.com

مقالات
جلد اوّل

از

حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مقالات	حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مرتبہ	پروفیسر حافظ احمد بخش
	فاضل دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور
تعداد	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	ستمبر 2011ء
کمپیوٹر کوڈ	KM 4
قیمت	-/500 روپے کامل سیٹ

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔فون: 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: 37247350 فیکس: 37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32630411-32212011۔021۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

Marfat.com

فہرست مضامین

انتساب	5
عرض ناشر	7
حضرت ضیاء الامت ایک انقلاب آفریں شخصیت	13
اسوۂ حسنہ	75
حضور نبی رحمت بحیثیت معلم اخلاق	85
سرورکائنات کا نظام اخلاق	101
اتباع سنت نبوی قرآن کریم کی روشنی میں	121
قرآن سحاب انقلاب	137
اسلام دین فطرت	153
عدل وانصاف قرآن کی روشنی میں	175
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاشی انقلاب	209
اسلام کا سیاسی نظریہ اور بیعت صدیق	223
فاروق اعظم اور اہل بیت	253
اسلام اور تصوف	279
اسلام میں تصوف کا مقام	307
خواجہ شمس العارفین اور ان کا عہد	319
حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی	385

Marfat.com

اِنتساب

دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف

کے اُن غیور اور پر عزم فضلاء کے نام

جو

حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

مدظلہ العالی کے خُونِ جگر کا ثمرہ ہیں۔

عرضِ ناشر

مقالات، یہ حضور ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری کے رشحات قلم کا مجموعہ ہیں۔ جن کو آپ نے مختلف ادوار میں تحریر فرمایا۔

یہ ایک ایسا گلدستہ ہے جس سے ارباب ذوق اپنے مشام جان کو معطر کرتے رہیں گے۔

یہ مضامین کا ایک ایسا مرقع ہے جس سے طلباء اور علماء یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔

یہ دل سے نکلی ہوئی ایسی باتیں ہیں جو اثر آفرینی سے مالا مال ہیں اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے دم لے جانے کی پوری صلاحیتیں رکھتی ہیں۔

ضیاء القرآن پبلی کیشنز کی جانب سے پہلے ان مقالات کی اشاعت ہوتی رہی مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ عربی عبارات پر اعراب لگا دیئے جائیں تا کہ قارئین کے لیے سہولت پیدا ہو جائے۔

حوالہ جات کی تخریج کر دی جائے تا کہ تحقیق سے وابستہ افراد کے لیے اس سے استفادہ ممکن ہو جائے۔

ہم نے ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے طباعت جدید کا بیڑا اٹھایا اور ہماری کاوش آپ احباب کی نذر ہے۔

امید ہے یہ آپ کے معیار پر پوری اترے گی اور آپ کی محبتوں کے صلہ کے ہم مستحق ٹھہریں گے۔

محمد حفیظ البرکات شاہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

Marfat.com

حضرت ضیاء الامت

ایک انقلاب آفریں شخصیت

از

پروفیسر حافظ احمد بخش (ایم۔اے)

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

احیائے اسلام کے سلسلہ میں یوں تو بے شمار تحریکیں اس برصغیر پاک و ہند میں ابھریں اور اس کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا، لیکن وہ فکری و روحانی انقلاب، جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا، وہ حضرت غوث العالمین بہاء الحق والدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ اور سلسلہ چشتیہ کے مہر عالمتاب فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ ہی تحریک کا مرہون منت ہے۔ جہاں ایک طرف خلوتیانِ میکدہ اپنے سبو بھرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف جلوتیانِ مدرسہ کے کدو بھی خالی نہیں لوٹائے جاتے۔ یہ تحریک جس میں مدرسہ و خانقاہ ایک ہی سلسلہ کی دو حسین کڑیاں تھیں، کئی سو سال تک اپنی شان و شوکت اور اثر آفرینی کے سبب عالم اسلام کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ یہاں تک کہ انگریزی استعمار نے جہاں اسلامی تمدن و ثقافت کے بعض دوسرے بنیادی عناصر کو نشانہ بنایا وہاں یہ مقدس تحریک بھی ان کی منظم سازش سے نہ بچ سکی۔

مدرسہ اور خانقاہ کو ایک دوسرے کی ضد ثابت کرنے کے لئے زیر زمیں سرگرمیاں جاری رہیں اور آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھاتی رہیں۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی کے پانچویں دہے میں قوم کو انگریز کی غلامی سے نجات تو مل گئی، لیکن اس کی نظریاتی یلغار برابر جاری رہی۔

اسے حسن اتفاق کہا جائے یا ان اولیائے کاملین کی پر خلوص مساعی جمیلہ کا صلہ، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے مقدس مشن کو حیاتِ تازہ بخشنے کے لئے ایک ایسے مردِ کامل کا انتخاب فرمایا جو اگر ایک طرف حضرت غوث العالمین سے نسبی رشتہ میں منسلک ہے تو دوسری طرف سلسلہ ارادت کے لحاظ سے خانوادۂ چشت اہل بہشت سے مربوط۔

وہ مجمع بحرین...... شخصیت، جسے یہ سعادتِ عظمیٰ حاصل ہو رہی ہے وہ کون ہیں؟

Marfat.com

وہ ہیں میری گفتگو کا عنوان

مفکر اسلام ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

اس سے پہلے کہ میں اس فکری و اصلاحی تحریک کا مفصل جائزہ آپ کی خدمت میں پیش کروں، میں چاہتا ہوں کہ حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان اور حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

خاندان

آپ کا سلسلہ نسب حضرت غوث العالمین بہاء الحق والدین ابو محمد زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

پیر محمد کرم شاہ بن پیر محمد شاہ بن پیر امیر شاہ بن پیر شاہ بن شمس الدین بن عبداللہ شاہ بن محمد غوث ساکن بھیرہ بن غلام محمد حسین شاہ بن شیخ محمد بن شیخ محمود بن شیخ احمد بن شیخ نظام الدین بن شیخ شمس الدین لاہوری لقب کروڑی بن شیخ صدر الدین بادشاہ بن شہر اللہ صاحب سجادہ بن شیخ یوسف بن شیخ عماد الدین بن شیخ رکن الدین سمرقندی بن صدر الدین حاجی بن شیخ اسماعیل شہید بن شیخ الاسلام حضرت مولانا صدر الدین قتال عارف باللہ فرزند اکبر و خلیفہ الشیخ الکبیر المنیر غوث العالمین شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا الہاشمی الاسدی السہر وردی الملتانی قدس سرہٗ العزیز۔ (ابر کرم از گل محمد فیضی)

بھیرہ شریف میں آمد

حضرت غوث العالمین کے خاندان نے مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند میں مختلف مقامات پر حق کی شمعیں فروزاں رکھیں۔ ان مردانِ باصفا میں سے ایک مقتدر شخصیت حضرت دیوان فتح شاہ صاحب لاہور سے بھیرہ منتقل ہوئے اور یہاں آ کر رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع فرمایا۔ اس خاندان کی قدر و منزلت لوگوں کے دلوں میں ویسے بھی کم نہ تھی، لیکن اس کی عزت و شہرت کا پرچم اس وقت انتہائی بلندیوں پر لہرا رہا تھا جب حضرت پیر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند حضرت پیر امیر شاہ صاحب رحمہ اللہ ''شمس

Marfat.com

سیال'' کی تجلیات سے تیرہ و تاریک ماحول کو نورِ اسلام سے منور فرما رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میدان فقر کے اس امیر کو تین فرزند عطا فرمائے:

☆ حضرت پیر محمد صدیق شاہ صاحب

☆ حضرت پیر محمد شاہ صاحب

☆ حضرت پیر فتح شاہ صاحب

آپ نے اپنی نیابت کے لئے منجھلے صاحبزادے پیر محمد شاہ صاحب کو منتخب فرمایا۔

حضرت پیر محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اس مردِ مجاہد کا تعارف کراتے وقت فوراً حضرت علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جہاں ایک طرف آپ کی قد آور شخصیت ''امیر جند اللہ'' کے روپ میں نظر آتی ہے جو ایڈمنسٹریشن کی پوری صلاحیتوں سے آراستہ بھی ہے اور سطوتِ فاروقی کا مظہر اتم بھی، وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری حسن کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ سرو کی مانند رعنا قد، چاند کی طرح روشن اور گول چہرہ جس پر ہمہ وقت ذکر الٰہی کے انوار برستے تھے۔ اور بقول شیخ عبدالغنی الزمزمی:

''میں نے حرم پاک میں لاکھوں آدمی دیکھے ہیں لیکن جو حسن و جمال میں نے حضرت پیر محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھیروی کے رخِ انور میں دیکھا ہے وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا''۔

یوں تو آپ کے بے شمار کارنامے ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر ہیں، تحریک پاکستان ہو یا جہادِ کشمیر، آپ ہمیشہ صف اول میں نظر آتے ہیں، لیکن وہ احسان جس کا امت مسلمہ کبھی شکریہ ادا نہیں کر سکتی، وہ ہے آپ کی خصوصی توجہ و تربیت کا نتیجہ!

''مفکر اسلام ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت''

Marfat.com

ولادت باسعادت

آپ نسباً ہاشمی قریشی اور مسلکاً حنفی ہیں۔ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ بمطابق یکم جولائی 1918ء شب دوشنبہ بعد از نمازِ تراویح بھیرہ شریف میں آپ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔

نام

پیر کھارا کوہستانِ نمک کے دامن میں ایک گاؤں ہے، جو حضرت پیر کرم شاہ المعروف ''ٹوپی والے'' کے فیض کی وجہ سے مرجع خلائق ہے۔

چونکہ اس جلیل القدر ہستی کے ساتھ آپ کے خانوادہ کی رشتہ داری بھی تھی، اس لیے آپ کے جدامجد حضرت پیر امیر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہی کی نسبت سے آپ کا نام محمد کرم شاہ رکھا۔

کنیت

آپ کی کنیت ''ابوالحسنات'' آپ کے بڑے صاحبزادے محمد امین الحسنات شاہ جو پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ان دنوں جامعہ عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں زیر تعلیم ہیں، کے نام سے منسوب ہے۔ (1)

تعلیم

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر بھیرہ ضلع سرگودہا کے اندر ہی حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے والد محترم کے قائم کردہ ''دارالعلوم محمدیہ غوثیہ'' میں دینی تعلیم کا آغاز فرمایا۔ حضرت پیر محمد شاہ صاحب نے اس نجیب وسعید فرزند کی تعلیم کے لئے جو خصوصی انتظامات فرمائے، اس کی نظیر دورِ جدید میں مشکل سے ہی ملے گی۔ ابتداءً مختلف علوم میں ماہر اساتذہ کی خدمات بھیرہ

1۔ اس وقت قبلہ پیر محمد امین الحسنات شاہ صاحب مدظلہ العالی، حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین بھی ہیں اور دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے مہتمم بھی۔

Marfat.com

شریف میں ''دارالعلوم محمدیہ غوثیہ'' میں ہی حاصل کی گئیں۔ مثلاً:

☆ حضرت العلامہ مولانا محمد قاسم صاحب

☆ استاذ المناطقہ مولانا محمد دینؒ صاحب بدھوی

☆ استاذ المنقول والمعقول مولانا غلام محمود صاحب ساکن پپلاں ضلع میانوالی

کے علاوہ کئی اصحابِ فن یہاں تشریف لا کر آپ کو پڑھاتے رہے۔ جونہی کسی فن کی کوئی کتاب مکمل ہوتی، اس کے امتحان کے لئے اس فن کے قابل ترین استاد کی خدمات حاصل کی جاتیں۔

جب آپ نے علومِ متداولہ کی تکمیل کر لی تو آپ کے والد معظم نے دورۂ حدیث کیلئے برصغیر پاک و ہند کی مختلف درس گاہوں کا جائزہ لیا اور ان لافانی ہستیوں کے متعلق معلومات حاصل کیں جو مخالف ہواؤں کے تند و تیز جھونکوں کے باوجود ملک کے اطراف و اکناف میں شمع اسلام روشن کیے درس حدیث دینے میں مشغول تھے۔ نظر انتخاب عقل و عشق اور علم و طریقت کے حسین سنگم حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہ العزیز پر پڑی۔

قابل ترین اساتذہ کی انتھک محنت اور آپ کے والد گرامی کی خصوصی توجہ سے آپ کی شخصیت کافی حد تک نکھر چکی تھی، لیکن حضرت صدر الافاضل کی آغوش تربیت نے صدف کا کام کیا اور اس قطرۂ نیساں کو ایسا گوہر شاہوار بنایا کہ ایک خصوصی محفل میں خود ہی فرماتے ہیں:

''میں آج مطمئن ہوں کہ میرے پاس جو امانت تھی وہ میں نے موزوں فرد تک پہنچا دی ہے''۔

اور کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ دستارِ فضیلت حضرت دیوان صاحب آلِ رسول اجمیری سے بندھوائی۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

(اقبال)

Marfat.com

۱۹۴۵ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔اس اثناء میں بے شک آپ علم وآگہی کا ایک بے پایاں خزانہ سمیٹ چکے تھے، لیکن آپ کے والد معظم اس عقاب کو علم ومعرفت کی جن بلندیوں پر محو پرواز دیکھنا چاہ رہے تھے، ابھی وہ منزل نہیں آئی تھی۔اس لیے آپ کو ۱۹۵۱ء میں مزید تحصیل علم کے لئے جامعہ ازہر (مصر) بھیج دیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب آپ کے والد محترم پیری کے ایام بسر فرما رہے تھے، لیکن اس مردِ مجاہد کی یہ ہمت اور دین وملت کے ساتھ درد کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب آپ نے اپنے لخت جگر کو مصر کے لیے روانہ فرمایا تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''میں زندگی کے اس مرحلہ میں آپ کو تحصیل علم کے لیے ملک سے دور اتنی لمبی مسافت پر روانہ کر رہا ہوں، جب کہ آپ میرے لیے بہترین سہارا بن سکتے ہیں لیکن میں اپنی ذاتی مجبوری پر دین کی خدمت کو ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دین حنیف کی تعلیم مکمل کر کے آپ اس کو لوگوں تک صحیح طریقہ سے پہنچائیں''۔

جب حضرت ضیاء الامت کے قیامِ مصر کے دوران آپ کا مرض شدت اختیار کر جاتا تو آپ اپنے ارادت مندوں کو فرماتے ہیں:

''اگر میں بیماری کے عالم میں داعی اجل کو لبیک بھی کہہ دوں تو میرے بیٹے کو خبر نہ کرنا تاکہ وہ اطمینان اور یکسوئی سے اپنی تعلیم مکمل کر سکے''۔

یہ اس مجاہد ملت اور دین کا درد رکھنے والے والد کے جذبات تھے۔

اگر ایک طرف آپ کے والد معظم نے آپ کے لئے اتنی قربانیاں دیں اور تعلیم کے لیے عمدہ سے عمدہ ترین انتظامات فرمائے، تو دوسری طرف حضرت ضیاء الامت مدظلہ العالی نے بھی محنت کا حق ادا کر دیا۔خود ہی ارشاد فرماتے ہیں:

''میری زندگی میں بہت سی راتیں ایسی آئی ہیں کہ جب میں نمازِ عشاء کے بعد مطالعہ میں مصروف ہوتا، کتابیں اپنے اسرار ورموز میرے سامنے منکشف کرتی جاتیں۔اسی محویت

Marfat.com

کے عالم میں صبح کے مؤذن کی آواز مجھے رات کی تنگ دامانی کا احساس دلاتی''۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت ضیاء الامت کے تعلیمی دور میں دربارِ عالیہ پر ایک عجیب سی کیفیت دیکھی جاتی۔ حضرت پیر محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نمازِ عشاء کے بعد اپنے بنگلہ میں نوافل ادا کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ آپ کے لختِ جگر مٹی کے تیل کا دیا جلائے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ پروانے جوق در جوق شمع پر گرنا شروع ہو جاتے، لیکن یہ پروانے اس سراپا احساس طالب علم کی طبیعت پر ناگواری کی بجائے مقابلہ کی حس کو ابھارنے کا سبب بنتے۔ اب عشق کا امتحان شروع ہو جاتا، کہ آیا اس ظاہری شمع کے پروانے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا شمع علم کا پروانہ۔ اور چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ ظاہری شمع کے پروانے رات کے آخری حصہ میں رفو چکر ہو جاتے، لیکن شمع علم کا یہ پروانہ ساری رات اسی محویت کے عالم میں گزار دیتا۔

حصولِ علم کا شوق اور محنت کا یہ جذبہ بیرونِ ملک جا کر اور زیادہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔ آپ دورانِ تعلیم اتنی جان سوزی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ پورے چھ سال کا کورس ساڑھے تین سال کے عرصہ میں مکمل کر لیتے ہیں اور قیامِ ازہر کے دوران تعلیمی میدان میں وہ کردار پیش کرتے ہیں کہ اساتذہ وطلباء سبھی کی نظروں میں مقبول اور محترم بن جاتے ہیں۔ جامعہ میں تحقیقی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اکثر اوقات مختلف موضوعات پر مناقشہ کی صورت بنتی، جس میں صرف اساتذہ ہی حصہ لے سکتے تھے، لیکن حضرت ضیاء الامت نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے اساتذہ کے دلوں میں اتنا مقام پیدا کر لیا تھا کہ دورانِ مناقشہ آپ کو بھی اساتذہ کے دوش بدوش اس میں حصہ لینے کی اجازت دی جاتی اور اکثر اوقات آپ کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔

آپ کے اساتذہ کرام نے ازراہِ قدردانی آپ کو مختلف سرٹیفکیٹ عطا کیے، جن میں سے تین کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کا عربی متن اور اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

الأستاذ محمد كرم شاه «الباكستاني» كان تلميذا لي في مادة أصول الفقه في كلية الشريعة بالأزهر. وما أن عرفته حتى أحببته من كل قلبي لما وجدته فيه من حرص على البحث الدقيق والإقبال على طلب العلم فضلا عما جبل عليه من خلق كريم وأدب عظيم

وأنني لفخور بتلمذته وأتمنى له مستقبلا زاهرا وأرجو الله جلت قدرته أن ينفع به الإسلام والمسلمين لا في الباكستان فحسب بل في العالم الإسلامي كله

محمد مصطفى شلبي

الأستاذ في كلية الشريعة

بالأزهر

١٦ من ذي القعدة ١٣٧٣ هـ

١٩ من يوليه ١٩٥٤ م

بسم الله الرحمٰن الرحیم

الاستاذ محمد کرم شاہ الباکستانی تلمیذاً الی فی مادۃ اصول الفقہ فی کلیۃ الشریعۃ بالازہر وما ان عرفتہ حتی احببتہ من کل قلبی لما وجدتہ فیہ من حرص علی البحث الدقیق والاقبال علی طلب العلم فضلا عما جبل علیہ من خلق کریم وادب عظیم وانی لفخور بتلمذتہ واتمنی لہ مستقبلا زاہرا وارجو اللہ جلت قدرتہ ان ینفع بہ الاسلام والمسلمین، لا فی الباکستان فحسب، بل فی العالم الاسلامی کلہ۔

۱۹۔ذی القعدۃ ۱۳۷۳ھ	محمد مصطفیٰ شلبی
۱۹۔یولیو سنہ ۱۹۵۴ء	الاستاذ فی کلیۃ الشریعۃ بالازہر

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جامعہ ازہر کے کلیۃ الشریعۃ میں استاذ محمد کرم شاہ پاکستانی علم اصولِ فقہ میں میرا شاگرد تھا۔ جونہی میری اس سے شناسائی ہوئی، میں دل کی گہرائیوں سے اس کے ساتھ محبت کرنے لگا، کیونکہ میں نے اس میں بحث دقیق کی حرص اور حصولِ علم کے لیے بے پناہ شوق پایا۔ مزید برآں قدرت نے اس کی فطرت کو خلق کریم اور ادب عظیم کی خوبیوں سے آراستہ فرمایا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر و ناز ہے کہ یہ میرا شاگرد ہے اور میں اس کے لیے ایک درخشاں مستقبل کی امید رکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کے وجود سے وہ اسلام کو اور ملت اسلامیہ کو نفع پہنچائے، نہ صرف پاکستان میں بلکہ سارے عالم اسلام میں۔

محمد مصطفیٰ شلبی

Marfat.com

صديقي الروحي، وتلميذي العالم الألمعي الأستاذ محمد كرم شاه

لقد التقينا على مائدة الرحمة الروحية، التقينا يوم أشعرتني بغيرتك للحق ودين الله، وحسبتك في الدفاع عن حياضه، والذود عن حرماته، وكانت الصلة من بعد امتداداً لذلك اللقاء الروحي، واستمراراً لذلك المعنى الإسلامي السامي، وما التقيت بك ساعة إلا أحسست منك بعلو النفس وسمو الخلق والاتجاه إلى معالي الأمور، والبعد عن سفسافها، فكنت أشعر كأني أنقاد لسعادة متجددة، وألمس فيك الروح الإنساني الذي يتسامى عن الأثقال الأرضية ويعلو عليها.

لقد أشعرتني يا بني أن الشرق مشرق الروح كما هو مشرق الشمس، ونور الحياة كما هو منبعث حرارتها، ومصباح الوجود، كما هو منار الأرض.

ولقد أشعرتني يا بني أن الإسلام أمة واحدة لا تقطع وحدتها مباعدة الأقطار ولا اختلاف الأمصار، فكنت كلما التقيتك رأيت فيك الإسلام سراجاً منيراً، ورأيت فيك الإسلام الموحد، ورأيت فيك الأمل، وأذهبت رؤيتك عني الألم والحزن.

لقد أسعدتني في المدة التي أقمت فيها في مصر، والآن وأنت تودعني أحس بأن قطعة من نفسي تزايلني، وكأن اقتطع قطعة من روحي، فأستودعك الله وأرجو لك التوفيق، وأضرع إلى المولى العلي القدير أن يشيع مقدمك، وأن يجزيك عما احتسبت من خير، وأن يجعل جهدك لدينه نصيراً، ولشرعه ولبيانه، سميع النداء، مجيب الدعاء.

القاهرة في ١٩ من ذي القعدة ١٣٧٣هـ
الموافق ١٩ من يوليه ١٩٥٤م

محمد أبو زهرة
أستاذ الشريعة الإسلامية بجامعة القاهرة

بسم الله الرحمن الرحیم

صدیقی الروحی وتلمیذی الالمعی الاستاذ محمد کرم شاہ

لقد التقینا علی مائدۃ الرحمن الروحیة. التقینا یوم اشعرتنی بنصرتك للحق فی دین الله وحمیتك فی الدفاع عن حیاضه والذود عن حرماته وکانت الصلة من بعد امتدادًا لذلك اللقاء الروحی واستمرارًا لذلك المعنی الاسلامی السامی وما التقیت بك ساعة الا احسست منك بعلو النفس وسمو الخلق والاتجاه الی معالی الامور والبعد عن سفسافها فکنت اشعر فی کل لقاء بسعادة متجدده والمس فیك الروح الانسانی الذی یتسامی عن الاثقال الارضیه ویعلو علیها، لقد اشعرتنی یا بنی ان الشرق مشرق الروح کما هو مشرق الشمس ونور الحیاة کما هو منبعث حرارتها ومصباح الوجود کما هو منار الارضین ولقد اشعرتنی یا بنی ان الاسلام امة واحدة لاتقطع وحدتها مباعدة الاقطار واختلاف الامصار فکنت کلما التقیت بك رأیت فیك الاسلام سراجا منیرا ورأیت فیك الاسلام الموحد ورائیت فیك الامل واذهبت روئیتك عنی الالم والحزن لقد اسعدتنی

Marfat.com

فى المدة التى اقمت فيها بمصر. و الآن انت تودعنى فاحس

بان قطعه من نفسى تزايلنى وكانى اقتطع قطعة من روحى

فاستودعك الله وادعولك بالتوفيق و اضرع الى المولى

العلى القدير ان يثيبك بقدر نيتك وان يجزيك عما

احتسبت من خير وان يجعل فيك لدينه نصيرا و

لشرعه وليا، انه سميع النداء مجيب الدعاء.

القاهرة فى ١٩ من ذى القعدة ١٣٧٣هـ — محمد ابو زهرة

الموافق ١٩ من يوليو ١٩٥٤م — استاذ الشريعة الاسلامية

بجامعة القاهرة

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میرے روحانی دوست، میرے ذکی اور ذہین شاگرد، الاستاذ محمد کرم شاہ!

ہماری ملاقات خداوند رحمٰن کے روحانی دستر خوان پر ہوئی۔ہم اس روز ملے جب تو نے اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے حق کی نصرت اور دینی اقدار کے دفاع کے لیے اپنی حمیت اور اس کی ناموس کی نگہداشت کے لیے غیرت کا مجھے شعور دلایا۔اس کے بعد یہ باہمی تعلق، اس روحانی ملاقات اور بلند اسلامی مفہوم کا تسلسل تھا، جب بھی میں نے تجھ سے ملاقات کی میں نے تجھ میں بلند نگاہی، رفعت کردار، اعلیٰ مقاصد کی طرف میلان اور بے مقصد امور سے دوری کا احساس کیا۔ہر ملاقات کے بعد میں ایک نئی سعادت کا احساس کرتا تھا اور تجھ میں ایک انسانی روح کو پاتا تھا جو کہ ان دنیوی بوجھوں سے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ تھی اور میرے بیٹے! بے شک تو نے مجھے یہ شعور دلایا کہ مشرق جس طرح مطلع آفتاب ہے اسی طرح روح کے طلوع کا افق بھی ہے اور مشرق جس طرح حرارت کا سرچشمہ ہے اسی طرح زندگی کے اجالے کا منبع بھی ہے اور جس طرح یہ زمین میں ایک روشنی کا مینار ہے، اسی طرح عالم ہست و بود کا روشن چراغ ہے۔اے میرے فرزند ارجمند! تو نے مجھے اس شعور سے بہرہ ور کیا کہ اسلام ایک امت ہے اور اس کی وحدت کو ملکوں کی دوری اور شہروں کا اختلاف منقطع نہیں کرسکتا۔اور میں جب بھی تجھ سے ملاقات کیا کرتا تو مجھے تیری ذات میں اسلام، ایک آفتاب کی طرح درخشاں نظر آتا اور میں تجھ میں وہ اسلام

Marfat.com

دیکھتا جو بکھرے دلوں کی شیرازہ بندی کرنے والا ہے۔ اور مجھے تجھ میں روشن مستقبل کی امید نظر آتی اور ہر بار تیری ملاقات مجھ سے رنج والم کو دور کرنے کا باعث بنتی اور جتنا عرصہ تو مصر میں اقامت پذیر رہا تو مجھے سعادت بخشتا رہا اور آج جبکہ میں تجھے الوداع کہہ رہا ہوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا میرے نفس کا ایک حصہ مجھ سے جدا ہو رہا ہے اور گویا میری روح کا ایک ٹکڑا الگ ہو رہا ہے۔ پس میں تجھ کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور تیرے لیے توفیق کی دعا کرتا ہوں اور اس عظمتوں والے اور قدرتوں والے مالک کے حضور عجز و انکساری سے التجا کرتا ہوں کہ وہ تیری نیت کے برابر تجھے اجر دے اور جس ثواب کی تو نے امید کی وہ بطورِ جزا تجھے عطا فرمائے، اور تجھے اپنے دین کا مددگار اور شریعت کا معاون بنائے، بے شک وہ التجا کو سننے والا اور دعا کو قبول کرنے والا ہے۔

محمد ابو زہرہ

Marfat.com

القاهرة - المنيرة - في العشرين من ذي القعدة سنة ١٣٧٣ هجرية.
العشرين من يوليه سنة ١٩٥٤ ميلادية.

أي صديقي ومريدي وصفيي الأستاذ الأديب
والسيد الحسيب النسيب، ولدي، محمد كرم شاه

إن كان من الأهل فداء الأبناء، ومن الصديق لبعد من الأصدقاء، ومن الخليل تشتيت الخلان، ومن النديم انفراد بعد الندمان؛ - فليس من الهين فراق الرائد للمريد، ولا الصفي لمن صافاه، ولا المخلص لمن وافاه؛ فقد جمعتني بك يا بني صلة من دراسة للأدب، وفنون القول، وفلسفة الاجتماع، ومباحث النفس، وطرائق التربية؛ - فكنت خلال تدريسي لك ومناقشاتي معك، ومساجلاتي إياك في كثير من الرياض من أفانين العلم؛ - مثالا رفيعا للأديب المطبوع، والذواقة اللامع، واللوذعي الموهوب، وصاحب النفس الصافية، ونموذج التربية الرفيعة، يرفرف على كل أولئك علم الإسلام الخفاق، في غيرة من أصوله ومناهجه، ونزعة إلى الجهاد في سبيله، لا تعرف الملل ولا يعتريها الكلال.

فلست أنسى ما حويت انفعالك مرارا من أجل دين السلام والمحبة، وطالما كنت أستثيرك. فلا أرى من نظراتك إلا الحيار المحبوب في ميادين أهل العلم بين رائد ومريد، ولكني أجد خلال ذلك منك النظرة النافذة، والفكرة الصائبة، والرأي السديد؛ - تلتقي كل أولئك من استحياء غامر، وفي أدب جم، يثلج صدري، ويطمئن خاطري من رجال وهبوا أرواحهم لله،

يجولون فيما وراء البحار، مجتازين الوهاد والقفار، سعيا وراء مجد الدين الحنيف، وإعلاء كلمة الله العزيز.

أمَّ بحث!!

لقد أبعدتك عني ظروف الحياة، ومتاعب أكلافها، ومشاغل أعمالها ومتبعات أعبائها، فكان لا مناص من التسليم بما أراد الله، وعُدت إلى ديارك الحبيبة إلينا وإليك، فَلْتَقعد عكفًا من أعلام وطنك الأغر تعلي فيه كلمة الله، وتنشئ جيلا ملما الفضيلة والخير ونور المعرفة، ذاكر مصر، كنانة الله في أرضه، وأصدقاءك فيها من رفاقه وأساتيذ بذلوا معك جهد المقل نحو مريد عظيم، وسيد ظريف كريم ولئن تفصلك عن إتمام دراستك الجامعية بعدٌ في الدار ولا شطط في المزار، وإنا جميعا لفي خدمتك؛ فلم يبعد التراسل حبيبا، ولم يعد أحدٌ بالمواصلات غريبا.

نعلي بركة الله رحلتك، وفي رعاية المولى ظعنك وإقامتك، وفي ظلال الدوحة الهاشمية الطاهرة مُحَيّاك ونضالك.

متعك الله بين أصولك، وأقر عينيك بفروعك، وأثمرت شجرتك حتى تزكو وتينع بفضل رب كريم، ومالك برٌ رحيم.

والسلام عليك وعلى معقل الإسلام من وطنك، ورحمة الله وبركاته

صديقك ومفتيك ورائدك

أحمد زكي

أستاذ الأدب العربي، وفلسفة التربية والاجتماع

بمعاهد التربية المصرية.

Marfat.com

اى صديقى ومريدى وصفى الاستاذ الاديب والحبيب النسيب

ولدى محمد كرم شاه

ان هان على الاهل فراق الابناء وعلى الصديق البعد عن الاصدقاء وعلى الخليل تشتيت الخلان وعلى النديم انفراط عقد الندمان فليس من الهين فراق الرائد للمريد ولا الصفى لمن صافاه ولا المخلص لمن وافاه. فقد جمعتنى بك يا بنى صلة المدارسة للادب وفنون القول وفلسفة الاجتماع ومباحث النفس وطرائق التربية فكنت خلال تدريسى لك ومناقشاتى معك و مساجلاتى اياك فى هاتيك الرياض من افانين العلم مثالا رفيعا للادب المطبوع والذواقة اللامع واللوذعى الموهوب فى صاحب النفس الصافية ونموذج التربية الرفيعة يرفرف على كل، اولئك علم الاسلام الخفاق فى غيرة على اصوله ومذاهبه و نزعة الى الجهاد فى سبيله لا تعرف الملل ولا يعتريها الكلال فلست انسى ما حييت انفعالك مرارًا من اجل دين السلام والمحبة و طالما كنت استفزك فلا ارى من نظراتك الا الحياء المحبوب فى ميادين اهل العلم بين رائد ومريد ولكنى اجد خلال ذلك منك النظرة النافذة والفكرة الصائبة والراى السديد تلقى كل اولئك على استحياء غامر وفى ادب جم يثلج صدرى ويطمئن خاطرى على رجال

Marfat.com

وهبوا ارواحهم لله، يجولون فيما وراء البحار مجتازين الوهاد و القفار سعيا وراء مجد الدين الحنيف و اعلاء كلمة الله القدير.

يا بنى لقد ابعدتك عنى ظروف الحياة ومتاعب اكلافها ومشاق احمالها وتبعات اعبائها فكانه لامناص من التسليم بما اراد الله وعدت الى ديارك الحبيبه الينا واليك، فلتعد علما من اعلام وطنك الاغر تعلى فيه كلمة الله وتنشئ جيلا على الفضيلة والجهد ونور المعرفة ذاكرمصر كنانة الله فى ارضه واصدقائك فيها من رفاق واساتيذ بذلوا معك جهد المقل نحو مريد عظيم و سيد غطريف كريم ولن يفصلك عن اتمام دراستك الجامعية بعد فى الدار ولاشطط فى المزار وانا جميعا لفى خدمتك فلم يبعد التراسل حبيبا ولم يعد احد بالمواصلات غريبا. فعلى بركة الله رحلتك وفى رعاية المولى ظعنك واقامتك و فى ظلال الدوحة الهاشمية الطاهرة محياك.

متعك الله بين اصولك واقرعينك بفروعك و اثمرت شجرتك حتى تزكو وتينع بفضل رب كريم وخالق بر كريم

والسلام عليك وعلى معقل الاسلام من وطنك ورحمة الله وبركاته

صديقك وصفيك و رائدك

احمد زكى

استاذ الادب العربى، وفلسفة التربية والاجتماع

Marfat.com

القاہرہ، المنیرہ

۲۰ ذی قعد ۱۳۷۳ھ، ۲۰ جولائی ۱۹۵۴ء

میرے پیارے دوست، میرے ممتاز شاگرد، الاستاذ الادیب،

السید الحسیب النسیب، میرے فرزند دلبند محمد کرم شاہ!

اہل خانہ کے لیے اپنی اولاد کی جدائی، دوست کے لیے دوستوں سے دوری، ایک محب کے لیے حلقہ احباب کا منتشر ہو جانا، ایک ہمنشین کے لیے ہمنشینی کے رشتے کا ٹوٹ جانا آسان ہو تو ہو لیکن ایک ارادت مند کے لیے اپنے رہبر سے، ایک محبّ کے لیے اپنے محبوب سے، ایک مخلص کے لیے اپنے وفا کیش ساتھی سے جدا ہونا آسان بات نہیں۔

اے میرے فرزند! ادب، فنون گفتگو، فلسفہ، اجتماع، علم نفسیات کے اہم مباحث اور فن تربیت کے طریقوں کی تدریس کے رشتہ نے مجھے تیرے ساتھ ملنے کا موقع فراہم کیا۔ ان گوناگوں علوم کے گلستانوں میں جب میں تدریس کے وقت تیرے ساتھ بحث مباحثہ کیا کرتا اور ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنے دلائل پیش کرتے تو مجھے یوں معلوم ہوتا کہ تو ایک پیدائشی ادیب کی اعلیٰ و ارفع مثال ہے، تو فصاحت و بلاغت کے نکات کا غیر معمولی ذوق رکھتا ہے۔ خداداد صلاحیتوں کا امین، پاکباز نفس کا مالک اور بلند تربیت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اور ان تمام اخلاق حسنہ پر اسلام کا لہرانے والا پرچم مجھے تجھ پر سایہ فگن نظر آتا۔ اثنائے گفتگو مجھے محسوس ہوتا کہ تیرے دل میں دین کے اصولوں کے بارے میں غیرت و حمیت کا ایک بے پایاں جذبہ ہے اور اس کے راستے میں جہاد کا شوق فراواں ہے۔ ایسا شوق جو اکتاہٹ کو نہیں جانتا۔ اور ایسا جذبہ جسے طویل جدوجہد درماندہ نہیں کر سکتی۔

جب تک میں زندہ رہوں گا، میں تیرے ان انفعالات کو فراموش نہیں کر سکوں گا جو امن اور محبت کے دین کے بارے میں تجھ میں رونما ہوا کرتے۔ بسا اوقات میں تجھ سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتا، لیکن اس وقت بھی تیری نگاہوں میں مجھے حیاء کے بغیر کوئی چیز نظر نہ آتی۔ یہ حیا

Marfat.com

علم کے میدانوں میں استاد اور شاگرد کے درمیان از حد پسندیدہ صفت ہے۔

میں یوں محسوس کرتا کہ تیری نگاہ حقیقت شناس، تیرا فکر صائب اور تیری رائے صحیح ہے۔ بایں ہمہ تو اپنی رائے کا اظہار بڑے باحیا انداز سے کرتا، اور ادب کا دامن تیرے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹتا۔ ان نادر صفات کو دیکھ کر میرا سینہ ٹھنڈا ہوتا میرا دل مطمئن ہوتا کہ میرا ان لوگوں سے واسطہ ہے جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی جانیں وقف کر دی ہیں، اور اس کے دین کے علم کے حصول کے لیے سمندر پار سفر کی زحمت گوارا کر رہے ہیں۔ راستہ کے نشیب و فراز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انہیں صرف ایک ہی شوق ہے کہ اس دین حنیف کی شان اونچی ہو اور اللہ تعالیٰ کا حکم سر بلند ہو۔

اے میرے فرزند! زندگی کے حالات، مشکلات کے بوجھ اور ذمہ داریوں کا بار گراں تجھے مجھ سے دور کر رہا ہے۔ اب میرے لیے کوئی چارہ کار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں۔ میری دعا ہے کہ تو اپنے وطن کی طرف جو ہمیں بھی بہت عزیز ہے اور تجھے بھی بہت پیارا ہے، اس شان سے لوٹے کہ تو اپنے روشن جبین وطن کے جھنڈوں میں سے ایک جھنڈا ہو، تاکہ وہاں تو اللہ کے نام کو بلند کرے اور ایک ایسی نسل تیار کرے، جو فضیلت حق اور نورِ معرفت سے آراستہ و پیراستہ ہو۔

اپنے وطن جا کر مصر کو بھی یاد رکھنا، جو اللہ کی زمین میں اللہ کا ترکش ہے اور اپنے ان مصری دوستوں کو بھی فراموش نہ کرنا، جو تیرے ہم سبق رہے ہیں یا تیرے استاد جنہوں نے تیری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی مقدور بھر محنت اور کوشش کی۔

فرزند عزیز! یہ جدائی اور بعد مسافت تمہیں اپنی جامعی (1) تعلیم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے باز نہ رکھے۔ ہم تیری ہر خدمت کے انجام دینے کے لیے حاضر ہیں۔ اگر سلسلہ مراسلت منقطع نہ ہو تو کوئی دوری حائل نہیں ہوتی۔ خط و کتابت کے باعث انسان ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتا۔

1۔ آپ نے جامعہ ازہر کے علاوہ جامعہ قاہرہ میں بھی داخلہ لے رکھا تھا۔

Marfat.com

پس میری دعا ہے کہ تیرا یہاں سے سفر بھی اللہ تعالیٰ کی برکت کے ساتھ ہو اور اپنے وطن میں تیری واپسی اور وہاں تیرا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں ہو اور پاک ہاشمی خاندان کے سرسبز و شاداب شجر سایہ دار میں تیری جد و جہد کا سلسلہ جاری رہے۔

اللہ تعالیٰ تجھے اپنے والدین کے سایہ عاطفت سے بہرہ اندوز فرمائے اور اپنی اولاد کے باعث تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے، تیرا شجر حیات ثمر بار ہو، وہ پھل بڑھے اور پختہ ہو، اس رب کے فضل سے جو کریم ہے، اس خالق کی مہربانی سے جو مہربان اور رحیم ہے، تجھ پر بھی اور تیرے وطن پر بھی جو اسلام کا قلعہ ہے، سلامتی ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔

تمہارا دوست اور استاذ

احمد زکی

استاذ الادب العربی وفلسفہ التربیۃ والاجتماع

Marfat.com

زمانہ طفولیت میں آپ کے والدین نے حضرت خواجہ ضیاء الدین صاحب سیالوی سے آپ کو بیعت کرایا۔ بعد ازاں شیخ الاسلام والمسلمین حضرت خواجہ محمد قمر الدین صاحب سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے تجدید بیعت فرما کر آپ کو خرقہ خلافت عطا فرمایا۔

قبلہ پیر صاحب پر جو شفقت و مہربانی حضرت خواجہ صاحب فرماتے ہیں، اس کا اندازہ حضور پیر سیال کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جو آپ نے آستانہ عالیہ سیال شریف میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''پیر محمد کرم شاہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پیر سیال کے روضہ کا مینار ہے''۔

حضرت خواجہ پیر سیال کی اسی شفقت کا نتیجہ ہے کہ قبلہ پیر صاحب کے سامنے جب بھی شمس سیال کے خانوادے کا تذکرہ آتا ہے تو فرطِ ادب واحترام سے آپ کی گردن جھک جاتی ہے۔ پیر سیال کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے آپ کی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ ''ضیائے حرم'' میں پیر سیال کے ملفوظات، آپ کے خاندان کے سوانحی خاکے اور تبلیغی مشن سے متعلق وقتاً فوقتاً خصوصی فیچر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور خواجہ شمس العارفین کے صد سالہ عرس پاک کے موقع پر تو ادارہ ضیائے حرم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے شمس العارفین نمبر شائع کر کے تاریخ کے صفحات پر اپنی ارادت و محبت کے ان مٹ نقوش ثبت کر دیے ہیں۔ اسی نیاز مندی اور جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ حضور پیر سیال قبلہ پیر صاحب کو ایسے پیار بھرے القابات سے نوازتے ہیں جو ایک ارادت مند کے لیے سرمایہ زیست ہوتے ہیں۔ اس کی عمدہ ترین مثال تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے سلسلہ میں جیل سے رہا ہو کر سیال شریف پہنچنے پر حضور پیر سیال کے یہ الفاظ ہیں:

''مبارک ہو آپ نے آج سے سنت یوسفی بھی ادا کر لی ہے''۔

Marfat.com

حضرت ضیاء الامت کے دین وملت کے بارے میں احساسات

''تکمیل علم کے بعد میں نے جب اپنے گردو پیش پر نظر ڈالی تو مجھے بڑا روح فرسا اور دلخراش منظر دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ اسلامی تمدن وثقافت کے جو چراغ نور افشانی کر رہے ہیں، تہذیب مغرب کے تند وتیز جھونکے رفتہ رفتہ انہیں بجھاتے چلے جارہے ہیں۔ وہ رنگین پھول جو گلشن اسلام میں کھل کھل کر نور ونکہت برسا رہے ہیں، مادیت کی بادِ صرصر انہیں افسردہ اور پژمردہ کرتی چلی جارہی ہے۔ اب تک مغرب کے سرمایہ داری نظام نے اسلامی چمن کو جی بھر کر لوٹا اور اس مقدس نظام کے حسن وخوبی کے جو آثار کیپٹلزم کی یلغار سے بچ گئے انہیں اب سوشلزم ملیامیٹ کردینا چاہتا ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ، رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ کریم کے متعلق جو غیر متزلزل عقیدہ راسخ تھا، اس کو بیخ وبن سے اکھاڑ دینا چاہتا ہے۔

یہ تو بیرونی خطرات تھے جنہوں نے ملت اسلامیہ کو چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا تھا۔ اگر اندرونی حالات تسلی بخش ہوتے، فکر وعمل کی وحدت برقرار ہوتی تو ان خطرات کا منہ پھیر دینا کوئی مشکل بات نہ تھی، لیکن داخلی طور پر حالات از حد تشویشناک تھے۔ کہیں عقیدۂ ختم نبوت کے منکر ہیں جو مجموعی طور پر امت مسلمہ کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور کہیں شمع رسالت کے اولین پروانوں پر جھوٹے بہتان لگانے والا گروہ، ملت اسلامیہ کی فکری اور نظریاتی یک جہتی کو درہم برہم کررہا ہے اور ایک ایسا فرقہ بھی پر پرزے نکال رہا ہے جس کے پیش نظر تقدس نبوت اور احترامِ رسالت کے عقیدہ سے مسلمانوں کو محروم کرنا ہے، ان کے سارے مذاکرے، ان کے سارے مواعظ، ان کی ساری تصنیفات اس ایک امر پر مرتکز ہوکر رہ گئی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اس کے مقامِ رفیع سے نیچے اتار کر ایک عام انسان کے دوش بدوش کھڑا کردیا جائے۔ ان کی اسی روش نے انکار سنت کو جنم دیا ہے۔ وہ کسی کافر کو تو مسلمان کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، البتہ شرک سازی کی مہم چلانے میں یہ بڑے بے باک ہیں۔ تمام وہ آیتیں جو مشرکین عرب کے حق میں نازل ہوئی تھیں ان کو

Marfat.com

غلامانِ مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء پر منطبق کرتے ہیں اور ہر اس خوش نصیب کو جسے عشق حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دولت سرمدی ارزانی ہوئی ہے، اس کو دائرۂ اسلام سے خارج کرنا اپنے موحد ہونے کے لیے شرطِ اول قرار دیتے ہیں۔

یہ سارے فرقے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے سوادِ اعظم سے نکلے ہیں۔ فتنہ پردازوں نے اس رفیع الشان محل سے اینٹیں اکھاڑ اکھاڑ کر نئے گھرانے تعمیر کیے ہیں۔ یہ فتنہ پرداز عیار بھی ہیں اور منظم بھی۔ یہ بڑی چابکدستی سے بڑے بڑے عہدوں کو ہتھیانے میں مصروفِ کار ہیں۔ ملک کی صنعتوں پر چھا رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اپنی اجارہ داری قائم کر رہے ہیں اور میدانِ صحافت میں تمام کلیدی مراکز پر انہوں نے اپنا تسلط جما لیا ہے۔

اور دوسری جانب اہلسنت، جن کے اکابر نے ظلمت کدۂ ہند کے گوشہ گوشہ میں اسلام کی شمعیں فروزاں کیں، جن کے "اللہ اکبر" کے نعرۂ مستانہ سے صحرا، جنگل اور پہاڑ گونج اٹھے، جن کے غیور اور بہادر علماء وصلحاء نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فیصلہ کن کردار ادا کیا، جن کے بزرگوں نے تحریک پاکستان میں قائداعظم کے شانہ بشانہ کام کیا، ان کی حالت قابل رحم ہے۔ صنعتیں ان کے قبضہ سے نکلتی جا رہی ہیں، ان کے نوجوانوں پر اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے اس ہوشیاری سے بند کیے جا رہے ہیں کہ اس محرومی کا کسی کو شعور تک نہیں۔ ان کے گنتی کے چند سکول اور کالجز ہیں، وہ بھی قومی شعور سے بے بہرہ اور بیگانہ ہیں۔ ان کے دینی ادارے کسمپرسی کے عالم میں ہیں اور جمود نے ان کو ہر قسم کی تگ ودو سے محروم کر دیا ہے اور میدانِ صحافت سے تو گویا کسی منظم سازش کے تحت انہیں نکال باہر کر دیا گیا ہو۔

اس عظیم، نجیب اور سعید سوادِ اعظم کا یہ حال دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا اور یہ حوصلہ شکن حالات اور سنگین مسائل جو مجھے چاروں طرف سے سر اٹھاتے نظر آتے۔ میں تصور کر کے کانپ گیا کہ اگر یہ صورتِ حال کچھ عرصہ جاری رہی تو معاملہ ہمیشہ کے لیے تلپٹ ہو جائے گا۔

یہ سوادِ اعظم جس کا میں ایک ادنیٰ فرد ہوں، جس کی محبت میرے رگ وپے میں سمائی

Marfat.com

ہوئی ہے، جس کے دینی عقائد پر میرا پختہ ایمان ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے دین جزوی طور پر قبول نہیں کیا، بلکہ کلی طور پر قبول کیا ہے، جن کے سینوں میں نورِ توحید درخشاں ہے، جن کے دلوں میں عشق محمدی ﷺ کی شمع فروزاں ہے، جن کی روح صحابہ کرام، اہل بیت عظام، اولیائے امت اور علمائے ربانیین کی الفت سے سرشار ہے، وہ اگر خائب وخروم ہوکر زندہ رہنے پر مجبور ہو جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ میں یہ تصور کر کے لرز جاتا تھا۔ مجھے یہ احساس کچھ کرنے پر مجبور کرتا۔ اگر میرا بس چلتا تو ایسا صور پھونکتا اور بار بار پھونکتا کہ سارے سونے والے سن جاگ اٹھتے اور اگر کوئی سونا چاہتا تو میں اس کے لیے سونا ناممکن بنا دیتا۔ اگر میرے مقدور میں ہوتا تو میں ایسی دلدوز چیخ مارتا کہ پتھر دلوں میں شگاف ہو جاتے اور احساس زیاں سے سب بے چین و بے قرار ہو جاتے۔ طوفان بن کر آتا اور فتنہ وفساد کے شعلوں کو بھسم کر کے رکھ دیتا۔ نسیم سحر بن کر چلتا، خوابیدہ غنچوں کو جگاتا۔ دل گرفتہ عنادل کو گدگداتا اور انہیں حیات آفریں نغموں پر مجبور کر دیتا۔ لیکن میں ایک ذرۂ بے مقدار ایسا نہ کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ملت کے ساتھ جو عشق ہے اس عشق کی لاج کیسے رکھوں؟ میں نے خیال کیا کہ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ ان بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے کے لیے، اس ناسازگار ماحول کو سازگار بنانے کے لیے مجھے چند جانباز، غیرت مند، جفاکش اور باہمت ساتھیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسے جوانمرد ساتھی جو باطل کی گوشمالی کرنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ جن کا علم سمندر کی طرح بیکراں اور جن کی سیرت مہر عالمتاب کی طرح روشن اور بے داغ ہو۔ جن کی عقاب آلود نگاہ سے اس سارے ابلیسی نظام میں ہلچل مچ جائے۔ جو تن آسان نہ ہوں بلکہ جفاکش ہوں، بے حس نہ ہوں، بلکہ پرلے درجے کے حساس ہوں، ضمیر فروش نہ ہوں، بکاؤ مال نہ ہوں بلکہ مسند فقر و درویشی پر بیٹھ کر دولت قارون پر تھوکنا بھی گوارا نہ کریں''۔ (تلخیص از عصر حاضر اور ہماری ذمہ داریاں)

ان مندرجہ بالا احساسات کی روشنی میں آپ اس ہمہ پہلو شخصیت کے کردار کی جھلک دیکھ سکتے ہیں، لیکن کیا سارے جذبات ہی تھے جو ابھرے اور سرد آہوں میں تحلیل ہو کر رہ

Marfat.com

گئے؟

نہیں، بلکہ اس سراپا عمل شخصیت نے اپنے جذبات کی عملی تصویر قوم کے سامنے پیش کر کے یہ واضح کر دیا۔

صف جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ میدانِ عمل میں

اگرچہ برصغیر پاک و ہند میں انگریز کی آمد ہی سے اسلامی تمدن و ثقافت کے بارے تشکیک کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی وہ نقطہ انتہا ہے جہاں پہنچ کر امت مسلمہ کی زبوں حالی نے کچھ زیادہ ہی تشویشناک صورت اختیار کر لی۔ انگریز نے مسلمانوں کو بغاوت کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر مظالم کی حد توڑ دی۔ ہزاروں جید علماء کو تختہ دار پر کھینچ دیا گیا۔ مختلف فنون پر مشتمل لاکھوں کتابیں سمندر میں غرق کر دی گئیں۔ تمام قابل ذکر درس گاہوں کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم کے ذریعہ پوری ہو گئی اور کالج کی طرف رجوع کرنے والا مسلمان طالب علم اسلامی شعائر کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا۔

ان مسلم کش اقدامات نے پورے برصغیر کے اندر اسلامی وحدت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کا ملی وجود خطرے میں پڑ گیا اور وہ مستقبل سے انتہائی مایوس نظر آنے لگے۔

ان حالات میں مسلمان علماء نے اپنی ذمہ داری محسوس کی اور مختلف مقامات پر انفرادی طور پر ایسے ادارے قائم کیے جہاں اسلامی روایات کے مطابق مسلمان طلباء کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے انتظامات کیے گئے۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ بھی ہے، جس کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں غازیٔ اسلام حضرت پیر محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی۔ آپ نے علوم

Marfat.com

دینیہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلباء کے لیے دار العلوم سے متصل ایک پرائمری سکول بھی قائم کیا جو آج تک محمدیہ غوثیہ پرائمری سکول کے نام سے کام کر رہا ہے۔

اگرچہ یہ دینی درس گاہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دیتی رہی، تاہم انگریز کے استعماری ہتھکنڈے اس قسم کی دانش گاہوں کے پنپنے میں بہت بڑی رکاوٹ بنے رہے۔

۱۹۴۷ء میں اگرچہ ایک مملکت ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے نام سے وجود میں آ گئی لیکن حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کو وقت نے مہلت نہ دی اور وہ اس سلسلہ میں کوئی مثبت اقدام کرنے سے قبل ہی اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔

بعد میں آنے والی قیادت میں اگرچہ بعض دردمند اصحاب بھی موجود تھے، لیکن علوم اسلامیہ کی ترویج کے سلسلہ میں کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا جا سکا۔

یہ ۱۹۵۷ء کا سال ہے۔ قوم ایک طرف دس سالہ جشن آزادی پاکستان منا رہی ہے اور دوسری طرف جنگ آزادی میں شہید ہونے والے مجاہدین کا خون ذی شعور افراد کو ذمہ داریوں کا احساس دلا رہا ہے۔ ان دل دردمند کے مالک اصحاب میں سے ایک حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری بھی ہیں۔ آپ بھی ملت اسلامیہ کو درپیش حالات کا جائزہ لے رہے ہیں اور اس سوچ میں منہمک کہ ''امت'' کی اس ڈگمگاتی ناؤ کو کیسے سہارا دیا جا سکتا ہے جو اپنے دامن میں ہزاروں فتنے سمیٹے ہوئے ہے۔

خداوند قدوس نے بروقت آپ کی رہنمائی فرمائی اور آپ نے مجاہدین جنگ آزادی کے مبارک مشن کو حیات تازہ عطا کرنے کے لیے علماء کا ایک ایسا گروہ تیار کرنے کا ارادہ فرمایا جو ہر قسم کے باطل نظریات کا طلسم توڑ کر رکھ دے۔ کیونکہ شہداء کے خون کا حقیقی صلہ در حقیقت اس نظریہ کا پرچار ہے جس کے لیے انہوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں:

Marfat.com

میرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاوِدانہ

چنانچہ اسی صد سالہ جشن جنگ آزادی کے موقعہ پر آپ نے دار العلوم محمد یہ غوثیہ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ جس کا نصاب اس نہج پر مرتب کیا گیا کہ یہاں سے فارغ التحصیل علماء قدیم وجدید دونوں قسم کے علوم سے بہرہ ور ہوں تا کہ کسی ماحول میں بھی وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ کیونکہ دورِ جدید میں اسلام کی لو کو مدھم کرنے کے لیے جو باطل نظریات جنم لے رہے ہیں، ان کا تعلق زیادہ تر سیاسی اور معاشی نظریات سے ہے۔ اس لیے حضرت ضیاء الامت نے دار العلوم کا نصاب مرتب کرتے وقت اپنے طلباء کے لیے معاشیات اور سیاسیات کی تعلیم لازمی کر دی۔

دار العلوم محمد یہ غوثیہ کے اندر طلباء کو درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ فاضل عربی اور دورۂ حدیث کے علاوہ بی۔ اے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ درس گاہ اب اپنے تیئس تعلیمی سال پورے کر چکی ہے (1) اور خدا کے فضل و کرم سے یہاں سے فارغ التحصیل علماء زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔

☆ فوج کے اندر بطورِ خطیب و نائب خطیب کام کر رہے ہیں۔
☆ ملک کے اطراف و اکناف میں خطابت کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔
☆ مختلف کالجز میں بطورِ پروفیسر مصروف کار ہیں۔
☆ بیرون ملک تبلیغی مشن میں مصروف ہیں اور
☆ ہر میدان میں کامیاب و کامران۔

دار العلوم میں اس وقت موجود طلبہ کی تعداد تین صد سے زائد ہے جو ملک کے مختلف حصوں (کشمیر، بہاولپور، ڈیرہ غازی خاں، ملتان، کراچی، فیصل آباد، جہلم، راولپنڈی، میانوالی، سیالکوٹ، حافظ آباد، لاہور وغیرہ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ طلبہ کے قیام و طعام کا

1۔ یہ مقالہ 1980ء میں لکھا گیا۔

Marfat.com

انتظام دار العلوم کے ذمہ ہے۔ طلبہ کو لائبریری کی طرف سے کتابیں بلا معاوضہ مہیا کی جاتی ہیں۔ طلباء سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی، جبکہ غریب طلباء کو علاج معالجہ کی سہولیات کے علاوہ وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔

دار العلوم کی موجودہ عمارت چالیس کمروں پر مشتمل ہے، جو طلباء کی موجودہ تعداد کے لیے ناکافی ہے۔ قریب ہی ۵۲ کنال رقبہ کی اراضی خریدی گئی ہے، جس میں کم از کم پانچ صد طلباء کے قیام کے لیے ہاسٹل کے علاوہ اساتذہ کے رہائشی کوارٹرز، کچن بلاک، ایک لائبریری ہال اور کھیلوں کے گراؤنڈ بنانے کا پرگرام ہے۔ عمارت کا نقشہ تیار ہو گیا ہے۔ اس عظیم منصوبے پر کام عنقریب شروع ہو جائے گا۔

اس وقت پندرہ اساتذہ جو مختلف مضامین میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں، تدریس کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں، جو صرف تعلیم کے اوقات میں ہی نہیں بلکہ زائد اوقات (Over Time) میں بھی طلباء کے تعلیمی معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ان کو دار العلوم کی طرف سے معقول مشاہرہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ معاشی پریشانیوں سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مصروف رہیں، لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو ادارہ کا ملازم نہیں سمجھتا، بلکہ اس مقدس تحریک کا ایک کارکن۔ اور یہ بھی حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کے حسن سلوک اور خلوص کا ثمرہ ہے۔

اس گہوارۂ دانش کی کامیابی کی بنیادی وجہ حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کی ذاتی دلچسپی اور ادارہ کے ساتھ خصوصی لگن ہے۔ آپ کو حکومت (1) کی طرف سے کئی بار مختلف عہدوں کی پیشکش کی گئی، لیکن آپ نے ہر بار یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں اپنے والد صاحب کے قائم کردہ دار العلوم کے ذریعے ہی دین وملت کی خدمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے خوابوں کی اس تعبیر کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا ہے۔

1۔ آپ نے وفاقی شرعی عدالت کی طرف سے رجم کو حد قرار نہ دینے کے بعد وفاقی شرعی عدالت میں بطور جج شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

Marfat.com

دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا اکثر حصہ راقم الحروف کی موجودگی میں تیار ہوا ہے۔ جب بھی تعمیر کے سلسلہ میں لپائی یا لنٹر وغیرہ ڈالنے کا وقت آتا تو حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ خود اور آپ کے صاحبزادگان اپنے سروں پر تگاریاں اٹھائے مسجد نبوی والی سنت ادا کرتے نظر آتے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے سے بڑا کام اتنا جلدی انجام پذیر ہو جاتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔

ذیلی برانچیں

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف چونکہ اس وقت اندرونِ ملک اور بیرونی سطح پر کافی ترقی حاصل کر چکا ہے، اس لیے داخلہ کے وقت مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلباء کی بھیڑ ہو جاتی ہے۔ عوام اہلسنّت کی سہولت کے لیے حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ نے ملک کے مختلف علاقوں میں دارالعلوم کی ذیلی برانچیں کھولنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ اس پروگرام کے تحت اب مندرجہ ذیل برانچیں مرکزی دارالعلوم سے وابستہ ہو کر دین وملت کی خدمت میں مصروف ہیں:

(۱) دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سیالکوٹ چھاؤنی

(۲) دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانیہ، پنجاب کالونی، کراچی نمبر ۶

(۳) جامعہ رضویہ انوار العلوم، ۲۴ ایچ واہ کینٹ

(۴) دارالعلوم چشتیہ غوثیہ منڈی بہاؤالدین

(۵) دارالعلوم ریاض المدینہ گوجرانوالہ

(۶) دارالعلوم ضیاء القرآن بوکن شریف، ضلع گجرات

(۷) دارالعلوم محمدیہ غوثیہ چک شہزاد اسلام آباد

(۸) دارالعلوم محمدیہ رضویہ پنڈ دادنخاں

(۹) دارالعلوم قمر العلوم، گجرات

Marfat.com

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ اور صحافت

قیامِ پاکستان کے بعد صحافت کے میدان میں بامقصد صحافت کی نمائندگی کچھ زیادہ ہی تشویشناک تھی، جس کے بارے میں حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کے احساسات کا جائزہ لینے کے لیے آپ کا یہی فقرہ کافی ہے۔

''میدانِ صحافت سے تو گویا کسی منظم سازش کے تحت اسلام کی حقیقی نمائندہ قوتوں کو نکال کر باہر کر دیا گیا ہے''۔

جہاں احساس زیاں کی یہ کیفیت ہو وہاں ردِعمل بھی اتنا ہی وقیع ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے واقعی اس کا مناسب حل تلاش کیا اور اس وقت جب کہ پوری پاکستانی قوم ایک کشمکش کی زندگی بسر کر رہی تھی، دورِ ایوبی ختم ہو چکا تھا، سرمایہ داری کی چکی میں پسی ہوئی قوم شدت درد سے کراہ رہی تھی اور نظریاتی طور پر ڈانواں ڈول، اشتراکیت کے سائے لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ محمد عربی ﷺ (فداہ ابی وامی) کی غیور قوم کو اشتراکی عیار روٹی، کپڑا اور مکان کا جھانسہ دے کر اس کے غیر متزلزل عقائد میں رخنے ڈال رہے تھے کہ ضیاء الامت زید مجدہٗ کی دوررس نگاہوں نے ان سر پر منڈلاتے ہوئے خطرات کو بھانپ لیا اور میدانِ صحافت میں ایک ماہنامہ ''فقر غیور'' اور ''عشق خود آگاہ'' کا نقیب بنا کر قوم کی نذر کیا، جسے اہل دل ''ضیائے حرم'' کے نام سے جانتے ہیں۔ ضیائے حرم نے واقعی ''فقیر غیور'' اور ''عشق خود آگاہ'' کا نقیب بن کر دکھایا اور سوشلزم کے امڈتے ہوئے سیلاب کے سامنے سد سکندری کا کام دیا۔ ضیائے حرم کو مطلع صحافت پر نمودار ہوئے تقریباً گیارہ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس مدت میں اس ماہنامہ نے پاکستانی قوم کو درپیش ہر قسم کے مسائل کا تجزیہ بڑے احسن انداز میں کیا ہے اور ہر میدان میں خواہ وہ معاشرتی ہو یا مذہبی، سیاسی ہو یا معاشی، اس نے اپنا مضبوط موقف پیش کیا ہے۔

ضیائے حرم کے سیاسی کردار کی جھلکیاں اگلے عنوان ''ضیاء الامت کا سیاسی کردار'' کے تحت آپ ملاحظہ کر سکیں گے۔ یہاں اتحاد بین المسلمین، اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی اقدار کے

Marfat.com

احیا اور اہل سنت کے فرائض منصبی کے بارے میں چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ اور اتحاد بین المسلمین

رزم گاہِ حیات میں کسی قوم کا اتحاد و اتفاق ہی اس کی سر بلندی اور فیروز مندی کا سبب ہوا کرتا ہے۔ اس قوم کو میدانِ کارزار میں روند ڈالا جاتا ہے جو بے اتفاقی یا انتشار کا شکار ہو۔ اس کے افراد کی خوبیاں اور ندرت طرازیاں بے کار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کی نگاہوں میں ہی نہیں خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو جاتی ہے۔ احساس کمتری اس کو یوں گھیر لیتا ہے کہ اس کے نظریات، معتقدات اور اس کے درخشاں ماضی کو بری طرح مسخ کیا جاتا ہے، لیکن اس کی رگِ حمیت نہیں پھڑکتی۔ اس کے منجمد خون میں جوشِ عمل پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علمی، تحقیقی اور تخلیقی فخر روزگار کارنامے مٹ رہے ہوتے ہیں، لیکن اسے احساس تک نہیں ہوتا اور پھر کوئی اس کا بہی خواہ اس کی بے حسی پر اس کا یوں ماتم کرتا ہے:

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یہ نفاق و انتشار سیاسی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور فکری و اعتقادی بھی۔ جہاں تک سیاسی چپقلش یا شکر رنجی کا تعلق ہے، اس کے چاک تو حسن تدبیر سے رفو ہو سکتے ہیں، لیکن فکری و اعتقادی پراگندگی اپنے اندر جو ہولناک انجام لاتی ہے وہ قوموں کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ واقعات کے آئینے میں ان ہوش ربا حالات کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اس کی خاطر عملی اقدام کرتے ہوئے ماہنامہ ضیائے حرم اکتوبر ۱۹۷۰ء میں فرماتے ہیں:

''ہر مسلمان اپنی ملت کی زبوں حالی پر اشکبار ہے، ہر دل اپنی موجودہ پستی پر خون کے آنسو بہا رہا ہے، ہر زباں شکوہ سنج ہے کہ ہم میں اتحاد نہیں، ہماری صفیں انتشار کا شکار ہیں۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی موجودہ صورتِ حال سے نالاں ہے اور اس کو بدل دینے کے لیے بے

چین۔ اگر واقعی ہمارا یہ احساس مذاق نہیں، بلکہ اپنے اندر سنجیدگی اور متانت رکھتا ہے تو آؤ! سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں، کندھے کے ساتھ کندھا جوڑ کر قدم بڑھائیں، اپنی بدنظمی اور پراگندگی کو نظم و ضبط سے بدل دیں، ایک دوسرے کی عیب جوئی چھوڑ دیں، ایک دوسرے کے متعلق بدگمانیاں ترک کر دیں، ایک دوسرے سے کھچے کھچے نہ رہیں، شکووں اور شکایتوں کے دفتر تہہ کر دیں، بدگمانیوں کی عادت چھوڑ کر شیر و شکر ہو جائیں، فیاضِ ازل نے جس کسی کو جو صلاحیت مرحمت فرمائی ہے، اسے دین متین کی سربلندی کے لیے وقف کر دیں، ضیائے حرم کے صفحات کو اپنی تحقیقی اور تعمیری کاوشوں سے رشک صد طور بنا دیں۔ ان میں اپنی نگارشات کے موتی سجا کر اپنی قوم کے نونہالوں کی خدمت میں بطورِ ارمغان پیش کریں، ہم ان عظمتوں کی نشاندہی کریں اور اپنے نوجوانوں کو ان رفعتوں کا پتہ بتائیں جو بندۂ مومن کی میراث ہیں، دشت ظن و تخمیں میں بھٹکنے والے آہو کو سوئے حرم لے چلیں۔ وہ عندلیبیں اور قمریاں جو کسی غلط فہمی کے باعث شاخِ مغیلاں پر آشیاں بند ہو چکی ہیں، انہیں بتائیں کہ تمہارے بغیر چمن اداس ہے، غنچے اداس ہیں، کلیاں اداس ہیں۔ آؤ! اپنے گلشن میں آؤ۔ اپنے روح پرور نغموں سے چمن کی فضا کو معمور کر دو۔ یہ ناچیز اپنے ان بچھڑے ہوئے رفیقوں کو خصوصی طور پر دعوت دیتا ہے، جنہیں عقل سلیم، فہم رسا اور قلم معجز رقم کی انمول نعمتیں بخشی گئی ہیں، کہ وہ آئیں اور اس ماہنامہ کے دامن کو اپنے علم و حکمت کے موتیوں سے تابدار بنائیں''۔

یہ تھی وہ دعوت جو آپ نے قوم کے ان افراد کے سامنے پیش کی جو دین و ملت کا درد رکھتے ہیں اور آپ کی یہ دعوت آج بھی اسی طرح ہے۔ ضیائے حرم کے صفحات آج بھی فرقہ واریت کی قیود سے آزاد ہیں اور اس کی پالیسی ''خذ ما صفا و دع ما کدر'' آج بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ محوِ عمل ہے، لیکن ان ساری رواداریوں اور وسعت نظری کے باوجود حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ عقائد اہل سنت کی ترویج اور ان کے اظہار میں کسی مداہنت کے روادار نہیں اور بقول طالب ہاشمی:

Marfat.com

''حضرت موصوف حنفی مسلک کے ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ انہوں نے ہر جگہ اپنے مسلک کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے زاویہ نگاہ سے تو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن ان کے خلوص اور اپنے مسلک سے سچی وفاداری میں مطلق کسی شبہ کی گنجائش نہیں''۔

آپ نے ۱۹۷۰ء میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز فرمایا۔ اس وقت سے لے کر آج تک لادینی نظریات کے خلاف جب بھی قوم نے اتحاد کی ضرورت محسوس کی، حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ ان کوششوں میں کسی سے پیچھے نظر نہیں آتے اور اس سے تو کسی کو مجالِ انکار نہیں کہ تحریک ختم نبوت (۱۹۷۴ء) اور تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ (۱۹۷۷ء) میں ضیائے حرم نے صحافتی دنیا میں جو کردار پیش کیا، کوئی اور ماہنامہ اس کی نظیر لانے سے قاصر ہے۔

قوم اگرچہ مندرجہ بالا دو بڑی تحریکوں میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئی، لیکن یہ اتحاد دائمی اور پائیدار ثابت نہ ہوسکا۔ ہوسکتا ہے اس میں بیرونی سازشوں کا بھی اثر ہو، لیکن اس کا بنیادی سبب اتحاد کے لیے کسی ٹھوس بنیاد کا فقدان ہے۔

حضرت ضیاء الامت مدظلہ العالی نے جب بار بار اس اتحاد کو قائم ہوتے اور ٹوٹتے دیکھا تو فروری ۱۹۷۶ء کے سربراہان کے عنوان کے تحت پائیدار اتحاد کے لیے اپنا پانچ نکاتی فارمولا پیش فرمایا، جس کی تلخیص پیش خدمت ہے:

۱۔ اتحاد کے داعی کو اپنی دعوت کی سچائی اور افادیت پر اتنا پختہ یقین ہونا چاہیے کہ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے کسی طرح ہراساں نہ ہو۔

۲۔ زیادتی کرنے والے فریق کو روکا جائے۔ جس کی حق تلفی ہو، اس کی حق رسی کی جائے، خواہ اس کا تعلق کسی جماعت یا مکتب فکر سے ہو۔ یعنی حقوق و فرائض کا پلڑا متوازن رہنا چاہیے۔

۳۔ ہر ایک فریق کو اتنا وسیع الظرف ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے فریق کی بات سنے، اس میں دیانت داری سے غور و فکر کرے اور جس چیز کو حق جانے اسے اپنا لے۔

۴۔ عظمت رسالت اور تقدس نبوت ہی دین کی بنیاد ہے۔ اگر کسی بھی مکتب فکر کے

Marfat.com

لٹریچر میں کوئی ایسی عبارت ہو، جس سے دین کی اس بنیاد پر اشارۃً یا صراحۃً حرف آتا ہو، اسے حذف کر دینا چاہیے، کیونکہ کوئی بھی غیرت مند مسلمان ایسی صورت حال سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔

۵۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی کے وقت ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور فرزندانِ اسلام پر شرک و کفر کے فتوے لگانے سے بھی باز نہیں آتے۔ اس سلسلہ میں ایسے ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں کہ اس قسم کی غیر محتاط زبانیں بند ہو جائیں۔

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کے اس پانچ نکاتی پروگرام کو سامنے رکھ کر قوم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوسکتی ہے، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی مصلحتوں اور دین سے دوری اور تنگ نظری نے ہمیشہ اس معاملہ کو سلجھانے کی بجائے زیادہ الجھایا ہے۔

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ اور اہلسنت

اگر چہ یہ آپ کی انتہائی خواہش ہے کہ پوری ملت اسلامیہ ایک ہی وحدت میں مربوط ہو اور غیر اسلامی قوتیں جہاں بھی اسلام کے خلاف برسر پیکار ہیں، ان کا دنداں شکن جواب دیا جائے۔ لیکن گروہی تعصبات اور فکری انتشار نے صورتِ حال کو کچھ زیادہ ہی ابتر کر دیا ہے۔ اسی افراتفری کے عالم میں حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کے نزدیک اہل سنت کا اتحاد و اتفاق ہی موجودہ حوصلہ شکن حالات میں اصلاحِ احوال کا پیغامبر بن سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے اندر رواداری اور وسعت نظری ہے۔ وہ اگر برسر اقتدار آئیں گے تو کسی اقلیت کے حقوق تلف نہیں کیے جائیں گے، بلکہ جس طرح پہلے کئی سو سال تک ان کی حکومت کے زیر سایہ ساری اقلیتیں امن و آشتی سے زندگی بسر کرتی رہی ہیں، ان سے اب بھی اسی سلوک کی توقع کی جاسکتی ہے۔

آپ فرمایا کرتے ہیں کہ اہل سنت کے اتحاد میں دین کا بھلا ہے۔ کیونکہ اہل سنت ہی وہ خوش نصیب ہیں جنہوں نے دین جزوی طور پر نہیں، کلی طور پر قبول کیا ہے۔ اہل سنت کے

Marfat.com

اتحاد میں ملت کا بھلا ہے، کیونکہ یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کے اندر جذبہ جہاد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ شہادت حاصل کرنے کے بعد انسان مر کر مٹی نہیں ہو جاتا، بلکہ اسے ''حیاتِ ابدی'' مل جاتی ہے۔ اگر اہل سنت متحد ہو جائیں گے تو ملک کی نظریاتی اور علاقائی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی۔ ان ہی نیک جذبات کے ساتھ آپ اہلسنت کو جھنجھوڑتے ہیں اور دعوتِ اتحاد دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

آپ پاکستان کا سواد اعظم ہیں۔ آپ ملک کی آبادی کا تقریباً اسی فیصد ہیں۔ اسی نسبت سے پاکستان کی بقا، اس کے استحکام اور اس میں بسنے والے تمام افراد کی خوشحالی کی ذمہ داری بھی آپ پر عائد ہوتی ہے۔ پاکستان کے مستقبل کے ساتھ آپ کا مستقبل وابستہ ہے۔ کیا آپ اپنا فرض اجتماعی حیثیت سے ادا کر رہے ہیں؟ معاف کیجئے! ہرگز نہیں۔

ہماری صفیں انتشار کا شکار ہیں۔ ہم آپس میں بلاوجہ کھچے کھچے رہتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں اہل غرض کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم میں اجتماعی شعور مفقود ہے۔ ہم اپنے ذاتی مفاد کے لیے تو ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، لیکن ملی سطح پر بہت کم سوچتے ہیں۔ ہماری انفرادی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان میں یک جہتی کا فقدان انہیں بے اثر بنا دیتا ہے۔ اس میں اہلسنت کے خواص و عام دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے جائز حقوق کی نگہداشت سے بھی قاصر ہیں۔ ہماری حق تلفیاں کی جاتی ہیں، لیکن ہم اس کا سدباب نہیں کر سکتے۔ عددی اکثریت جب بدنظمی، بے حسی اور بے تدبیری کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ مات کھا جاتی ہے اور اقلیتیں اپنی تنظیم کے باعث بازی جیت لیتی ہیں۔

اے سنت مصطفوی کے پاسبانو! تمہارے وجود سے گلشن اسلام میں بہاریں ہیں۔ گلستانِ وجود میں تمہاری ہستی ہی شمع محفل ہے۔ خدارا! اپنا فرض پہچانیے اور اپنی انانیت پر اپنی ملت کی عزت کو قربان نہ کیجئے۔ ان سنگین حالات میں اپنی بھرپور اجتماعی کوششوں سے ملک کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کو خاک میں ملائیے''۔ (سردلبراں اگست ۱۹۷۱ء)

Marfat.com

اہل سنت کو اخلاقی اقدار کی پابندی اور اصلاحِ احوال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سب سے زیادہ ذمہ داری اہل سنت پر عائد ہوتی ہے۔ پاکستان میں ان کی غالب اکثریت ہے۔ اکثریت کے اگر حقوق ہوتے ہیں تو اس کے فرائض بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ سدھر جائیں گے، گناہوں سے نفرت کرنے لگیں گے، نیکیوں سے پیار کرنے لگیں گے، زندگی کے جس شعبہ سے وہ وابستہ ہوں وہاں راست بازی، دیانت داری اور جفاکشی کے چراغ روشن کرتے رہیں گے تو برائی کی قوتیں خود ہی معرکۂ حیات میں ہتھیار ڈال دیں گی۔ گناہوں کو حسین پردوں میں چھپا کر فروغ دینے کا دھندا کرنے والے ہمیشہ کے لیے نامراد ہو جائیں گے۔ نیکی کا نور پھیلے گا اور ملک کا گوشہ گوشہ وادیٔ ایمن بن جائے گا۔ اپنے تشخص کو برقرار رکھنے میں وہ کسی مداہنت کے روادار نہیں ہوں گے، لیکن کسی پر زیادتی، کسی کی دل شکنی، کسی کی حق تلفی، کسی کو اس کی آئینی مراعات سے محروم کر دینے کا وہ تصور بھی نہیں کریں گے اور جب ملک کا سوادِ اعظم مئے خودی سے سرشار، بیدار، فرض شناس اور عدل وانصاف کا علمبردار بن جائے گا تو ہر طرف ذہنی اور قلبی آسودگی، ہر طرف سچی اور پائیدار مسرتوں کی چاندنی پھیل جائے گی۔ وہ جماعتیں، جن کی تعداد قلیل ہے، وہ اگر سنبھل اور سنور بھی جائیں تو اس سے ملک کا مقدر تو نہیں بدل جائے گا، لیکن شومیٔ قسمت ملاحظہ ہو کہ اہل سنت، جن پر اصلاحِ احوال کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے، یہی انتشار اور ہر قسم کی خرابیوں کا شکار ہیں۔ ساری جماعتوں کی رونق ان کے دم قدم سے ہے، لیکن ان کا اپنا گھر سونا پڑا ہے۔ لوگ ان کی مرمری سلوں، منقش اور رنگدار اینٹوں اور مرصع دروازوں کو اکھیڑ اکھیڑ کر لے جا رہے ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رہے ہیں۔

اور

اہل سنت کو پہلے تو اس کا احساس تک نہیں، اور اگر ہے تو اتنا نحیف ونزار کہ سرد آہوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر آنسو بن کر ٹپکتا ہے تو طوفان بن کر امڈتا نہیں۔ دامن کے

Marfat.com

کسی گوشہ میں گرتا ہے اور خشک ہو جاتا ہے۔

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
موجیں جس کی تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

(سر دلبراں۔ دسمبر ۱۹۷۷ء)

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ اور مشائخ عظام

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ چونکہ بذاتِ خود مشائخ کرام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں بھلا کب گوارا تھا کہ دوسرے تمام طبقے تو اپنی ذمہ داریاں پہچانیں، اور مشائخ کرام اپنی ناؤ طوفان کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیں۔ آپ نے اپنا فرض منصبی سمجھا کہ انہیں بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے، لیکن ان کے رویہ کا جائزہ لیتے ہوئے ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ فرماتے ہیں:

"اگر میرے کرم فرما مجھ سے برہم نہ ہوں تو حدیث دل زباں پر لاؤں اور زخم جگر سے پردہ اٹھاؤں۔ نہیں! نہیں! .... ان کی برہمی کا خطرہ مول لیتے ہوئے بھی بصد ادب و نیاز عرض کروں گا:

موجودہ صورتِ حال کی ساری نہیں تو بیشتر ذمہ داری پیر صاحبان پر عائد ہوتی ہے، جو اہل سنت کے کشورِ دل کے سلطان ہیں، جو ہماری عقیدتوں کا مرکز ہیں، جو ہمارے عشق و مستی کا عنوان ہیں، جن کے اشارۂ ابرو پر ہر نیک دل سنی دل و جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ تسلیم کہ انہوں نے پاکستان کے حصول میں قابل فخر حصہ لیا ہے، لیکن پاکستان کو اسلامی سلطنت بنانے کے لیے جس مسلسل جدوجہد کی ضرورت تھی، غیر اسلامی تحریکوں کو ختم کرنے کے لیے عملی اور فکری میدان میں جس جہاد کی ضرورت تھی، اس کی طرف انہوں نے توجہ نہیں دی۔ اہل سنت کو منظم اور متحد کرنے کی اہمیت کا انہوں نے اندازہ نہیں لگایا۔ اور امت کا سوادِ اعظم ایک لشکر جرار کی بجائے بھیڑوں کا گلہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے مستقبل کا مؤرخ ان سے پوچھ سکتا ہے:

Marfat.com

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

ہمارے مشائخ کرام کی بے پرواہی اور لاتعلقی سے اہل سنت کو نقصانِ عظیم پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے، لیکن اب بھی اگر ادائے فرض کا احساس بیدار ہو جائے تو اس کی تلافی چنداں مشکل نہیں۔ ہر شیخ کا اپنا حلقۂ ارادت ہے جو اپنے شیخ پر پورا اعتماد رکھتا ہے۔ اگر پاکستان کے مشائخ کرام سے صرف چند جن کا علم و فضل، جن کا تقویٰ اور للّٰہیت، جن کی ایمانی بصیرت اور فراست ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، جن کا ماضی ماہتاب و آفتاب سے تابندہ تر ہے، باہم متحد ہو جائیں تو پاکستان کے چاروں صوبوں کے سنی، نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گے۔ دینی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی میدانوں میں جو خرابیاں ملت کی رسوائی کا باعث بنی ہوئی ہیں، ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔ ہر سنی کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب مکرم ﷺ کے عشق کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کام صرف اتنا ہے کہ اس میں اٹھنے والی شوخ و شنگ موجوں کو منظم کر دیا جائے۔ اگر ہمارے مشائخ یہ فرض ادا کریں تو بخدا! ہم باطل کے ہر لشکر کو ہزیمت دے سکتے ہیں۔ لادینیت کی تحریکیں خود بخود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گی۔ برائی اور گناہوں کا نام ونشان تک نہ رہے گا۔ سارا پاکستان صحن حرم کی طرح مصفّٰی و مجلّٰی اور اس کی فضائیں معطر و معنبر بن جائیں گی۔

ناموسِ ازل را تو امینی، تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری، تو یمینی
بندۂ خاکی! تو زمانی، تو زمینی
معمارِ حرم! باز بتعمیر جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

لیکن اگر مشائخ کرام نے اس وقت کی پکار کی طرف توجہ نہ دی اور حالات کا رخ

Marfat.com

اپنی ہمت مردانہ سے موڑ نہ دیا، تو پھر ان کے نیاز مند بصد حسرت و یاس یہ کہنے میں سچے ہوں گے:

شوق بے پروا گیا، فکر فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے
خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

(سردلبراں۔ دسمبر ۱۹۷۷ء)

اوپر والی سطور کو بار بار پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ ادائے فرض کے احساس نے کس درجہ آپ کو حدیث دل زبان پر لانے کے لیے مجبور کر دیا اور ہر ہر لفظ سے ٹپکتا ہوا خلوص احساس زیاں کی کتنی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے۔

یہ تو ادائے فرض پر ابھارا جا رہا تھا اور اب دیکھئے! اہل سنت کے تمام راہنماؤں کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے کس طرح جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

آخر یہ فقیر پر تقصیر مشائخ کرام، پیرانِ عظام اور علمائے ربانیین کی خدمت میں بصد ادب ملتمس ہے کہ حالات کے تیور آپ کے سامنے ہیں۔ سوادِ اعظم کے معتقدات کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ ان کی گھریلو زندگی کے تقدس کو پامال کرنے کے لیے مشورے ہو رہے ہیں۔ ان کے خانگی سکوں کو برباد کیا جا رہا ہے۔ ان کی آئندہ نسلوں کو بگاڑا جا رہا ہے۔

یہ "ان کے" اور "ان کی" کے لفظ تو میں نے پاس ادب کے لیے لکھے ہیں۔ آپ ان کی جگہ "آپ کے" اور "آپ کی" بھی پڑھ سکتے ہیں۔ پھر بھی آپ اپنی شیرازہ بندی کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ جب طوفان آئے گا تو آپ کے مریدوں کے ساتھ آپ کی خانقاہیں اور حرم سرائیں بھی محفوظ نہیں رہیں گی۔ اگر آپ دین اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے

ہیں، اگر آپ اس تثلیث پر برہم نہیں ہوتے کہ "اسلام ہمارا دین ہے" "جمہوریت ہماری سیاست ہے" اور "سوشلزم ہماری معیشت ہے" تو بے شک سیاست کے میدان میں قدم رنجہ نہ فرمائیے، لیکن کم از کم دین کو تو بچائیے، ان کے ہاتھوں کو تو پکڑ لیجئے جو شریعت بیضا کے خدوخال کو مسخ کرنا چاہتے ہیں۔ کم از کم ان قزاقوں کا راستہ تو بہادری کے ساتھ روکیے جو آپ کے معتقدین کی عصمت و ناموس پر دن دہاڑے ڈاکے ڈالنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ عیسائیوں کے حقوق ہیں، بھنگیوں کے حقوق ہیں، پارسیوں کے حقوق ہیں، قادیانیوں کے حقوق ہیں کیونکہ یہ پاکستان میں بسنے والی اقلیتیں ہیں، آئین، قانون اور اخلاق ان کے حقوق کی ضمانت دیتے ہیں۔ اے سوادِ اعظم! تم ہی ایسے ہو، جن کے کوئی حقوق نہیں؟ جس طرح کوئی چاہے ان کا حلیہ بگاڑ تا رہے"۔ (سردلبراں ۱۹۷۷ء جنوری)

ان مندرجہ بالا چند عنوانات کے تحت آپ نے حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کے میدانِ صحافت میں جاندار کردار کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائی اور ملت اسلامیہ کے ساتھ آپ کے خلوص، محبت اور لگن کا جائزہ لیا۔

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کا سیاسی کردار

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کی پوری رہنمائی کرتا ہے۔ جو لوگ اسلام کی سربلندی کے لیے مصروف کار ہوتے ہیں یا جو اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اسی سانچے میں ڈھالے ہوئے ہوتے ہیں وہ ذاتی یا گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر ہر معاملے کو اسلام کی عینک سے ہی ملاحظہ کرتے ہیں۔ حضرت ضیاء الامت مدظلہ العالی کی زندگی جس طرح ہر میدان میں اسلام کی بالادستی کی آئینہ دار ہے، اسی طرح سیاسی میدان میں بھی آپ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ:2) کے قرآنی احکام پر مکمل عمل فرماتے ہیں۔ آپ نے سیاست کو نہ پیشہ بنایا اور نہ ہی ذاتی مفاد کا ذریعہ۔ بلکہ اپنے سیاسی کردار کو ہر اس آلائش سے پاک رکھا جو دورِ حاضر میں سیاستدانوں یا سیاسی کارکنوں کا وطیرہ بن چکا ہے۔ آپ ملک کی ایک ممتاز سیاسی جماعت کے مرکزی نائب

Marfat.com

صدر اول کے عہدہ پر فائز رہے اور اس کے ایک کارکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، لیکن آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی آپ کے کردار پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کر سکتا۔ آپ کی مخالفت اور حمایت میں ذاتی اغراض و مقاصد کا قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ خدا اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا اور خوشنودی ہی آپ کا نصب العین ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے آپ تحریری اور تقریری سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سیاست میں ملکی مفادات اور پاکستان کے استحکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ بڑی جرأت اور پامردی سے اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ بلا خوف وخطر ادا کر رہے ہیں۔

اپنے مخالفین کی اچھائیوں اور اپنوں کی کمزوریوں کے اعتراف میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور نہ ہی حق کو مصلحت اور مفادات کے پردے میں چھپانے کی کبھی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا سیاسی کردار قابل تعریف اور تمام تر آلودگیوں سے پاک وصاف رہا۔ اس سلسلہ میں آپ کی تحریروں اور تقریروں کے چند اقتباسات یقیناً مفید رہیں گے۔ ملاحظہ کیجئے:

ماہنامہ ضیائے حرم جولائی ۱۹۷۵ء کے سر دلبراں میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ حنیف رامے کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے وزیر اعلیٰ بھی بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ آیتیں بھی پڑھتے ہیں اور اشتراکیت کے گن بھی گاتے ہیں اور اس کو اپنی دانشوری کا کمال بھی خیال کرتے ہیں۔ حق و باطل کی یہ آمیزش معلوم نہیں ہمارے وزیر اعلیٰ کے لیے کس طرح قابل قبول ہے۔ ان کے نام میں ''حنیف'' اور ''رامے'' کا جو بے ربط جوڑ ہے، شاید اس کا اثر ہو۔ بہر حال ہم ان کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے لیے کسی سوشلسٹ یا کمیونسٹ نے کوئی قربانی نہیں دی۔ اس گلشن کی آبیاری فرزندانِ توحید نے اپنے خونِ ناب سے کی ہے۔ اس کا حصول اور اس کی بقا غلامانِ مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثناء کی مخلصانہ سرفروشیوں کی مرہونِ منت ہے۔ اگر پاکستان کی مانگ میں شہیدوں کے خون کی سرخی دمک نہ رہی

Marfat.com

ہوتی، اگر یتیموں اور بیواؤں کے آنسوؤں کے موتیوں کا جھومر اس کی پیشانی کو مزین نہ کر رہا ہوتا، تو شاید کوئی اس مذموم ارادے میں کامیاب ہو جاتا، لیکن جہاں شہیدوں کے خون کی چمک چشم مہر و ماہ کو خیرہ کر رہی ہو وہاں انسانیت و کردار کشی کی سڑانڈ میں بسی ہوئی اشتراکیت سے پاکستان کی مانگ کو ملوث کرنا کون عقلمند گوارا کرلے گا؟ ہمارے وزیر اعلیٰ اس غلط فہمی سے جتنا جلد چھٹکارا حاصل کرلیں گے اتنا ہی ان کے لیے مفید ہوگا۔

سارے کمیونسٹ سن لیں اور ہمارے وزیر اعلیٰ بھی، اگر وہ خدانخواستہ کمیونسٹ ہیں تو وہ بھی سن لیں کہ پاکستان نے اسلام کی آغوش میں جنم لیا ہے۔ اسلام کی آغوش میں پروان چڑھا ہے اور جب تک یہ زندہ رہے گا اس کی فضاؤں میں صرف اسلام کا پرچم ہی لہرا سکتا ہے"۔

شمارہ دسمبر ۱۹۷۵ء میں رقم طراز ہیں۔

"پیپلز پارٹی کے لچھن صاف بتا رہے تھے کہ کھلنڈرے بے فکروں کا یہ طائفہ لٹیا ڈبو کر رہے گا۔ ان میں نہ حالات کا مزاج پہچاننے کی صلاحیت ہے اور نہ حالات سے نبرد آزما ہونے کی اہلیت ہے۔ تعمیری جدوجہد کے لیے جس متانت اور سنجیدگی کی ضرورت ہے، یہ طائفہ اس سے یکسر بے بہرہ ہے۔ اجڑے ہوئے چمن کو پھر بہار آشنا کرنا مداریوں کے بس کا روگ نہیں، اگر کسی کو اس پارٹی کے بارے میں غلط فہمی تھی بھی تو وہ اس رات دور ہوگئی جس رات لاڑکانہ میں جشن عیش و نشاط منایا گیا۔ شراب کے خم کے خم لنڈھائے گئے اور ملک کا عوامی صدر اپنے حواریوں کے ساتھ دنیا بھر کے سفراء کی آنکھوں کے سامنے رنگ رلیاں منانے میں مصروف ہوگیا"۔ (سردلبراں دسمبر ۱۹۷۵ء)

اظہارِ وجوہ کا نوٹس

جب مندرجہ بالا "سردلبراں" جس کا ایک اقتباس ہدیہ قارئین کیا گیا ہے، حکومت کے اہل کاروں کی نظر سے گزرا تو انہیں اپنا قصر اقتدار لرزتا ہوا دکھائی دیا، جس کے نتیجے میں ضیاء الامت کے نام اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کیا گیا۔ تاریخ پیشی کے موقع پر آپ عدالت میں پہنچے، کچھ دیر انتظار کے بعد متعلقہ افسر کے کیبن میں اپنے مؤقف کی وضاحت کے لیے آپ

Marfat.com

کو بلایا گیا۔

افسر: آپ نے اپنے اداریہ میں صدرِ پاکستان پر الزام تراشی کی ہے، کیوں؟

ضیاء الامت: میں نے الزام تراشی نہیں کی بلکہ ایک حقیقت قوم کے سامنے پیش کی ہے۔

افسر: آپ پاکستان کے علماء کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ کیا یہ شرعی لحاظ سے جائز ہے کہ بغیر دیکھے خوامخواہ کسی کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا جائے۔ کیا ان جرائم کے آپ عینی شاہد ہیں جن کا تذکرہ آپ نے اپنی تحریر میں کیا ہے؟

ضیاء الامت: ہر چیز کا ثبوت صرف عینی شہادت پر ہی منحصر نہیں، بلکہ بہت سی بدیہات ایسی ہیں جن کا بغیر عینی مشاہدہ کے بھی علم قطعی ہوتا ہے۔

افسر: یہ کیسے ممکن ہے؟

ضیاء الامت: لندن شہر میں نے دیکھا نہیں (1)۔ اس کی آبادی میں نے گنی نہیں، لیکن کیا میرا اسے نہ دیکھنا میرے نزدیک اس کے وجود کی نفی کو مستلزم ہے؟ کیا یہ میں کہہ سکتا ہوں چونکہ میں نے لندن نہیں دیکھا، اس لیے اس کا وجود ہی نہیں۔

افسر: بہر حال آپ ہمارے لیے محترم ہیں۔ حکومتی حلقوں میں آپ کے سر دلبراں کی وجہ سے کافی ہراس ہے۔ آپ محتاط پالیسی اختیار کریں۔

ضیاء الامت: میں جس چیز کو حق سمجھوں گا، اس کا اظہار بہر حال کروں گا۔

افسر: اگر آپ اس طرزِ عمل سے باز نہ آئے تو آپ کے ماہنامہ کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا جائے گا۔

ضیاء الامت: جس دن میں اظہارِ حق نہ کر سکا، اس روز میں خود بخود یہ ماہنامہ بند کر دوں گا۔

تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ (۱۹۷۷ء) کے سلسلہ میں جس دن عدالت نے آپ کو چار ماہ قید با مشقت کی سزا سنائی، عدالت کے سامنے کھڑے ملاقاتیوں کو مخاطب کرتے

1۔ اس وقت آپ ابھی لندن نہیں گئے تھے۔

Marfat.com

ہوئے فرماتے ہیں:

''ہمیں جیل میں کوئی تکلیف نہیں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسی صورتِ حال پیش آ بھی جائے تو محبت کی راہ میں کانٹے پھولوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہماری دعاؤں کی پذیرائی ہونے والی ہے۔ اپنے جذبات کو سرد نہ ہونے دینا، کامیابی ان شاء اللہ جلد ہی آپ کے قدم چومے گی''۔

آپ نے فرمایا:

''تحریک میں صرف وہی لوگ شامل نہیں جو جیلوں میں ہیں، بلکہ جیلوں سے باہر جو لوگ اس جدوجہد میں مصروف ہیں، ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے۔

اب بھٹو صاحب کہتے ہیں:

''میں اپنے آپ کو دھاندلی کروانے والے وزیراعظم کے نام سے یاد نہیں کروانا چاہتا''۔

میں اسے کہتا ہوں، تاریخ وہ نہیں جو تیری یا تیرے گماشتوں کی خواہش ہو گی۔ بلکہ تاریخ تو غیر جانب دار حقیقتوں کا نام ہے۔ جس نے تیرے ماتھے پر سیاہی کا بدنما داغ لگا دیا ہے۔ میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے زیادہ تم اپنے آپ کو قوم کا قاتل بننے کے لقب سے مشہور ہونے سے باز آ جاؤ۔

نو تاریخ کا واقعہ تاریخ انسانیت کا بدترین سانحہ ہے۔ تم اسمبلی ہال میں بیٹھے نام نہاد نمائندگان کو خطاب کر رہے تھے۔ تیری فیڈرل سیکورٹی فورس اور ظالم پولیس کے افراد قوم کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے سروں سے عزت کی چادریں اتار رہے تھے۔ ان پر گولیاں چلائی جارہی تھیں اور ان کے سینوں کو سنگینوں سے چھلنی کیا جارہا تھا''۔

آپ نے فرمایا:

''اے بھٹو! ہم تو اس نقصان کی تلافی بھی ساری عمر نہیں کر سکتے جو تو نے پچھلے چھ سالوں میں پاکستانی قوم کو پہنچایا ہے، چہ جائیکہ ہم تجھے ایک بار پھر اپنے اوپر مسلط کر لیں۔

Marfat.com

یہاں سارے مبشر حسن اور شیخ رشید نہیں بستے، جن کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور جن میں غیرت کی رمق تک بھی باقی نہیں، بلکہ یہاں ''کرم شاہ'' اور اس جیسے ہزاروں دین وملت کا درد رکھنے والے لوگ موجود ہیں''۔

آپ نے سامعین سے استفسار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''پاکستان بنانے میں بھٹو کا کوئی حصہ نہیں، اور ہم اسے اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتے کہ جس گلشن کو ہم نے اپنے خونِ ناب سے سینچا ہے، اسے ویران کرنے کے لیے ہم تیرے حوالے کر دیں''۔

آپ نے ارشاد فرمایا:

''جب بھٹو برسر اقتدار آیا تھا، ہم نے اس وقت بھی چیخ چیخ کر کہا تھا کہ قومیں اپنی تقدیر مداریوں کے حوالے نہیں کیا کرتیں، لیکن قوم نے نادانستہ طور پر یہ عظیم غلطی کی۔ اب وقت ہے، اس بدنما داغ کو اپنی قوم کے وجود سے دھوڈالیں۔ یہ تحریک اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک کہ ہم پیپلز پارٹی کی ارتھی نکال کر اس کی راکھ کو گنگا کے پانی میں نہ بہا دیں۔ پاکستان کا بچہ بچہ اس سرزمین پاک کی عظمت و ناموس پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے''۔

آپ نے فرمایا:

''میں اقتدار کی بات نہیں کرتا، اقتصادی بدحالی کی بات نہیں کرتا، بلکہ سوال ان اخلاقی قدروں کی تذلیل کا ہے، جن پر ملت کی عظمت کا دارومدار ہے''۔

آپ نے مزید فرمایا:

''بھٹو کے مقدر میں انتخابی دھاندلیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اسے اب کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی۔ **قد جف القلم**

آپ نے ایک اچھے اور صاحب بصیرت سیاستدان کی حیثیت سے جو پیشگوئیاں کیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ درست ثابت ہوئیں۔ ملک کے بہترین خیر خواہ اور محب وطن سیاستدان کی طرح آپ ہمیشہ اتحاد و اتفاق اور باہمی یگانگت پر زور دیتے رہے ہیں

Marfat.com

تا کہ پاکستان کے تمام مسلمان مل کر اسلام کی سربلندی اور پاکستان کے استحکام کے لیے مفید خدمات انجام دے سکیں اور پاک سرزمین اسلام کے نور سے منور و روشن ہو جائے۔ جہاں ہر شخص امن وسکون کی زندگی بسر کر سکے۔

تصنیفات

کسی نظریہ حیات کو بقاء و دوام صرف اس وقت تک نصیب رہتا ہے جب تک وہ بنی نوع انسان کے لیے فیض رساں اور نفع بخش رہے۔ چونکہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس کی بقا خود ربِ قدوس نے اپنے ذمہ کرم پر لے رکھی ہے۔ اس لیے وہ ہر زمانہ میں ایسی جلیل القدر ہستیاں پیدا فرماتا ہے جو اس وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کو مدون کرتی ہیں۔ بے شک برصغیر پاک و ہند میں اردو زبان میں اسلامی لٹریچر کا ایک بیش بہا خزانہ موجود تھا، لیکن عصری تقاضوں نے جہاں ایک طرف لوگوں کو سہل پسند بنا دیا ہے تو دوسری طرف مادیت کی یلغار اور روحانیت کے فقدان نے عقل عیار کو سو بھیس عطا کر رکھے ہیں۔ حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کی باریک بین اور دور رس نگاہوں نے حالات کے بدلتے ہوئے رخ کا بروقت جائزہ لیا اور سب سے پہلے منکرین سنت کے رد میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''سنت خیر الانام'' قوم کے ان نوجوانوں کی خدمت میں پیش کی جو غلام احمد پرویز جیسے نام نہاد مصلح اور تجدد پسند کے دامِ ہمرنگ زمین میں گرفتار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کا یہ نظریہ میدانِ عمل میں بالکل سو فیصد صحیح ہے:

''پیاسے کو اپنی پیاس بجھانے کے لیے مشروب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ اسے ٹھنڈا اور صاف پانی میسر نہیں کر سکتے تو وہ گدلا پانی پی کر گزارا کر لے گا''۔

غلام احمد پرویز کے مکدر جوہڑ سے اپنی مذہبی تشنہ کامی کا مداوا کرنے والوں کو جب ''سنت خیر الانام'' جیسا میٹھا اور شیریں چشمہ دستیاب ہوا تو اس کی تحریروں کی طرف کسی نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ایک وقت تھا جب ''فتنہ انکار سنت'' انتہائی سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، لیکن حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کی اس مسکت تصنیف کے بعد

ڈھونڈنے سے بھی اس کا نام نہیں ملتا۔

سرورِ علم پاتا ہے جو پی لے ایک جام ان سے
زمانہ سیکھتا ہے سنت خیر الانام ان سے

(پیر سید خضر حسین چشتی)

سنت خیر الانام حضرت پیر صاحب قبلہ کے بہار آفریں قلم اور گوہر بار کلک کا شاہکار ہے۔ اگرچہ یہ کتاب انہوں نے اس وقت لکھی تھی جب وہ ۱۳۷۳ھ میں جامعہ ازہر، مصر میں زیر تعلیم تھے، لیکن زورِ بیاں، اسلوب نگارش اور طرزِ استدلال کے لحاظ سے اس کو کسی تامل کے بغیر نہایت اونچے درجے کی علمی کتابوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ ہر صحیح العقیدہ مسلمان کا نظریہ یہ ہے:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

(اقبال)

یہ کتاب اسی عقیدہ کی ایمان افروز تشریح اور تفسیر ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو بڑی محنت اور تحقیق و تفحص کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور قرآنِ حکیم کے علاوہ تفسیر، حدیث، رجالِ حدیث، فقہ و اصولِ فقہ، سیرت و تاریخ اور لغت کی انتالیس بلند پایہ کتب سے استفادہ کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

فاضل مصنف کا اندازِ نگارش نہایت عالمانہ لیکن بے حد شگفتہ ہے۔ طرزِ بیاں نہایت شستہ اور دلنشیں، دلائل بڑے واضح اور محکم ہیں۔ درایت و روایت اور عقل و نقل ہر اعتبار سے یہ کتاب لاجواب ہے۔ اس میں منکرین حدیث کے انکار و دلائل کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے گئے ہیں۔ اس کو پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور یہ عقیدہ پختہ سے پختہ تر ہو جاتا ہے کہ اطاعت رسول ﷺ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (طالب ہاشمی)

ضیاء القرآن

حضرت ضیاء الامت مدظلہ العالی نے انیس سال کی طویل مدت میں پینتیس سو صفحات پر مشتمل قرآنِ کریم کی تفسیر پانچ جلدوں میں مکمل فرمائی ہے، جس کو اردو زبان میں عہد حاضر کی بلند ترین تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ تفسیر ضیاء القرآن کیا ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس بارے میں اظہارِ خیال کے لیے ایک طویل کتاب درکار ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت چونکہ صاحب تفسیر کا تعارف ہے، اس لیے اس میدان میں آپ کے تبحر علمی کا اندازہ لگانے کے لیے اجمالی طور پر اس کا جائزہ ہدیہ قارئین کروں گا۔

ترجمہ کے اوصاف حضرت ضیاء الامت کی زبانی

''جو تراجم میری نظر سے گزرے ہیں وہ عموماً دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تحت اللفظ تراجم کی ہے، لیکن ان میں وہ زورِ بیاں مفقود ہے جو قرآنِ کریم کا طرۂ امتیاز، بلکہ روحِ رواں ہے۔ دوسری قسم بامحاورہ تراجم کی ہے۔ ان میں دقت یہ ہے کہ لفظ کہیں ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ دو سطر پہلے یا دو سطر بعد درج ہوتا ہے اور مطالعہ کرنے والا یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ میں جو نیچے لکھا ہوا ترجمہ پڑھ رہا ہوں، اس کا تعلق کس کلمہ یا جملہ سے ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان دونوں طرزوں کو اس طرح یکجا کر دوں کہ کلام کا تسلسل اور روانی بھی برقرار رہے اور زورِ بیاں میں بھی حتی الامکاں فرق نہ آئے اور ہر کلمہ کا ترجمہ بھی اس کے نیچے مرقوم ہو۔

قرآنِ پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ عربی کا اپنا ادب ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کا اپنا معیار ہے۔ قواعد اشتقاق نے تو اس کے اندر اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عربی زبان میں ایک ایک لفظ کے لیے سینکڑوں مترادف الفاظ ہیں، لیکن قرآنِ حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ حکمتِ الٰہیہ نے جو لفظ جہاں سمو دیا ہے اس کو ہٹایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس کی جگہ کوئی مترادف لفظ لایا جا سکتا ہے۔

جہاں کہیں بھی کوئی لغوی، نحوی یا صرفی الجھن اور پیچیدگی نظر آئی، میں نے کوشش کی ہے

Marfat.com

کہ ائمہ فن کے مستند حوالوں اور اقوال سے اس کا حل پیش کر دوں، تا کہ کوئی خلش باقی نہ رہے۔

ا۔ جب میں نے ترجمہ شروع کیا تو بعض مقامات پر دوسرے مترجمین سے میرا اختلاف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفاتحہ میں ارشاد فرمایا رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس کا ترجمہ اکثر حضرات نے ''پالنے والا'' اور ''مالک'' وغیرہ کے الفاظ سے کیا ہے، لیکن درحقیقت لفظ ''رب'' مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے ''تربیت'' اور تربیت عربی میں کہتے ہیں: **تبلیغ الشئ الی کماله بحسب استعداده الازلی شیئاً فشیئاً** (کسی چیز کو اس کی ازلی استعداد اور فطری صلاحیت کے مطابق آہستہ آہستہ مرتبہ کمال تک پہنچانا)۔

اس لغوی مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے اب لفظ ''ربّ'' کا ترجمہ کریں تو ''پالنے والا'' یا ''مالک'' نہیں بلکہ ترجمہ ہوگا: ''مرتبۂ کمال تک پہنچانے والا ہے تمام جہانوں کا''۔

(خطاب جبیس ہوٹل، کراچی)

۲۔ تفسیر ضیاء القرآن کے ترجمہ کے اوصاف اور اس کی ایک مثال آپ نے حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کی زبانی ملاحظہ فرمائی۔ اس کی تائید میں چند مثالیں اور ملاحظہ فرمایئے۔

(ا) سورۃ الحجرات میں اللہ تبارک و تعالیٰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفات بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ (سورہ حجرات)

عام مترجمین نے اس کا ترجمہ ''وہی ہدایت پانے والے ہیں'' وغیرہ کے الفاظ سے کیا ہے، لیکن حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کی فکر رسا لفظ ''راشد'' کی گہرائیوں تک جا پہنچی اور اس لفظ کا مادۂ اشتقاق تلاش کرنے کے بعد اسی کی روشنی میں اس کا ترجمہ کیا۔ قرطبی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

الرشد: الاستقامة علی طریق الحق مع تصلب فیه من الرشدة و هی الصخرة

''یعنی رشد، جادۂ حق پر ایسی ثابت قدمی کو کہتے ہیں جس میں تصلب اور پختگی ہو، تذبذب کا وہاں نشاں تک نہ ہو۔ یہ رشدۃ سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے ''چٹان''۔

اب اس لفظی تحقیق کے بعد اُولٰٓئِکَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ؆ کا ترجمہ حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں:

''یہی لوگ راہِ حق پر ثابت قدم ہیں''۔

یعنی جس طرح چٹان اپنی جگہ سے نہیں ہلتی، اسی طرح یہ لوگ بھی راہِ ہدایت سے دور نہیں ہوتے۔

(ب) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (سورہ فتح۔ ۲)

سورۂ فتح کی دوسری آیت کا ترجمہ کرتے وقت بعض مترجمین نے مقامِ نبوت کا لحاظ تک نہیں رکھا اور بعض صالح فکر مترجمین نے تقدس نبوت اور عصمت رسالت کے اجتماعی عقیدہ کے پیش نظر اس آیت طیبہ کے اندر مذکور لفظ ''ذنبٌ'' کی نسبت ذاتِ پاک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بجائے ''امت'' کی طرف کی ہے۔ اور بعض نے ''ذنبٌ'' کو خلافِ اولیٰ کے معنی میں لیا ہے۔ علاوہ ازیں چند تاویلات اور بھی کی گئی ہیں، لیکن کلام کے سیاق وسباق کو پیش نظر رکھا جائے تو ان میں سے کوئی مفہوم بھی یہاں چسپاں نہیں ہوتا۔

فتح مبین کی غرض وغایت یا اس کا نتیجہ اور انجام مغفرت بتایا گیا ہے، لیکن فتح اور مغفرت میں کوئی مناسبت نہیں اس لیے حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ نے اس مقام پر مزید غور وفکر کی ضرورت محسوس کی اور کم وبیش ایک ماہ کی مسلسل تحقیق وتجسس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے۔

لفظ ''ذنب'' بذاتِ خود اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ اس کا معنی صرف گناہ نہیں، بلکہ قرآنِ کریم کے اندر یہ الزام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ؆ (الشعراء)

''اور ان کی طرف سے مجھ پر الزامِ قتل ہے۔ میں خوف محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے''۔

اس لغوی تحقیق کے بعد آپ نے اس آیت کا جو ترجمہ فرمایا ہے وہ یہ ہے:

''یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرما دے آپ کے لیے اللہ تعالیٰ جو الزامات آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے تھے اور جو (ہجرت کے) بعد لگائے گئے''۔

وہ الزامات کیا تھے؟ ان کی فہرست آپ نے حوالہ جات کے ساتھ درج فرمائی ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں، ضیاء القرآن، جلد چہارم)۔

اس لفظی تحقیق اور پھر ترجمہ میں سیاق وسباق کے ربط نے صاحب تفسیر کو باقی مترجمین و مفسرین سے ممتاز مقام عطا فرما دیا ہے۔

ترجمہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ نے ارشاد فرمایا تھا:

''میں نے کوشش کی ہے کہ دونوں قسم کے تراجم تحت اللفظ اور بامحاورہ کو یکجا کر دوں''۔

اس میں آپ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس کا بالتفصیل جائزہ لینا چاہیں تو ضیاء القرآن کے صفحات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر میں صرف چند اہل الرائے حضرات کی نگارشات قلمبند کروں گا۔

''اس تفسیر کی سب سے بڑی خوبی ترجمۂ قرآن ہے۔ ترجمہ کا یہ انداز بے مثل اور بے نظیر ہے اور قرآنِ پاک کی ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ کو سمجھنے کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں حق تعالیٰ نے خود حضرت پیر صاحب کی راہنمائی فرمائی ہے اور انہیں ایسا عمدہ اور رواں دواں ترجمہ کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔ یہ ترجمہ فی الحقیقت بامحاورہ اور تحت اللفظ تراجم کا حسین امتزاج ہے''۔ (طالب ہاشمی)

''میں نے بذاتِ خود امام اہلسنت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قرآن کو انگریزی میں ڈھالتے ہوئے ضیاء القرآن کے ترجمہ کو بڑے غور سے پڑھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا ترجمہ ہے جو سلیس اور بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ منشائے الٰہی اور عظمت رسالت کا آئینہ دار ہے''۔ (شاہ فرید الحق)

تفسیر ضیاء القرآن کے ترجمہ کے بارے میں مذکورہ آراء کو ملاحظہ فرمانے کے بعد اب

Marfat.com

آیئے تفسیر کے بارے میں بھی کچھ باتیں کرلیں۔

''اردو زبان میں اس وقت قرآنِ کریم کی بہت سی تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور ان میں سے بعض تفسیریں علم وبصیرت کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ زیرِ نظر تفسیر اس عظیم علمی سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف قرآنی حقائق ومعارف کے نئے نئے پہلوؤں سے آگاہ کرتا ہے بلکہ فاضل مفسر کی دقتِ نظر، خیر خواہی امت اور سوزِ دردوں کا ثبوت بھی مہیا کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کی ایمان افروز تفسیر وہی لکھ سکتا ہے، جس کا کتابِ الٰہی پر ایمان و ایقان عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہو۔

تفسیر کا اندازِ بیاں نہایت دلنشیں اور اثر انگیز ہے اور اس کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علم وحکمت کی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل بہہ رہی ہے اور ہر شخص اس سے بقدرِ ظرف استفادہ کرسکتا ہے''۔ (طالب ہاشمی)

''ضیاء الامت حضرت العلامہ پیر محمد کرم شاہ صاحب زید مجدہٗ نے ضیاء القرآن تصنیف فرما کر نوجوان نسل خصوصاً طلباء پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ اس سے قبل ہمیں الفاظِ قرآن کی لغوی اور صرفی ونحوی تحقیق کے لیے مفرداتِ امام راغب، القاموس، لسان العرب اور المحیط جیسی ضخیم کتب لغت کی ورق گردانی کرنا پڑتی تھی، لیکن مصنف ضیاء القرآن نے ان الفاظ کی تحقیق کر کے اور تفسیر کے ساتھ ان کی فہرست کا اضافہ کر کے ہم طلباء کے لیے آسانی فرمادی ہے۔ لفظی تحقیق کے علاوہ ترجمہ اور تفسیر پڑھنے کے بعد انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تفسیر عمل وعشق کا حسین امتزاج ہے۔ انہی خصوصیات سے متاثر ہو کر ہم نے ضیاء القرآن کو کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کی لائبریری کے لیے منظور کروالیا ہے اور جن طلباء نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے، وہ بے حد متاثر ہوئے ہیں''۔ (محمد شریف سیالوی)

''قرآنِ کریم ایک ایسی کتاب ہے جس میں ایک طرف تو خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف حضور ﷺ کی عظمت معلوم ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کے بعض مفسرین نے عظمتِ رسالت کو ملحوظ نہیں رکھا، لیکن تفسیر ضیاء القرآن کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں

Marfat.com

جہاں دلائل توحید پر بڑی واضح بحثیں ملتی ہیں وہاں عظمت رسالت بھی اپنی رعنائی کے ساتھ موجود ہے۔ درحقیقت یہ وہ تفسیر ہے جس سے صاحب قرآن کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ پیر صاحب قابل صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے صاحب قرآن کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے خود اپنی شخصیت کو اس میں گم کر دیا ہے''۔ (شاہ فرید الحق)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ نے اپنی قیمتی زندگی کا ایک طویل عرصہ قرآنِ کریم کی خدمت میں صرف کر کے امت مسلمہ کے لیے ایک بیش بہا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ ہر قسم کے مسائل، خواہ معاشرتی ہوں یا سیاسی، اقتصادی ہوں یا اخلاقی، ان پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خصوصی طور پر وہ مسائل، جو ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کے درمیان وجہ نزاع بنے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں مختلف مقامات پر ایسے مثبت اور مدلل مقالات سپردِ قلم کیے ہیں کہ ظن و تشکیک کے غبار سے آلودہ اذہان ان کو پڑھنے کے بعد آسانی کے ساتھ اپنے فکر کی راہ متعین کر سکیں گے۔ حوالہ کے طور پر ملاحظہ کیجئے:

سورۃ الاحقاف، آیت نمبر ۹: مسئلہ علم غیب

سورۃ کہف، آیت نمبر ۱۱۰: مسئلہ نور

سورۂ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۱: واقعہ معراج

سورۃ النحل، آیت نمبر ۱۵: **وما اھل بہ لغیر اللہ**۔

سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۴۵: مسئلہ حاضر و ناظر۔

سورۃ الروم، آیت نمبر ۵۲ : سماعِ موتی کی مدلل تحقیق

تفسیر ضیاء القرآن کی ایک اور خصوصیت جو میں نے ضیاء القرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے محسوس کی ہے وہ یہ ہے:

بے شک سارا قرآنِ کریم نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھرا ہوا ہے، لیکن اکثر مفسرین نے چند مخصوص آیات کے تحت ہی کمالاتِ نبوت کا تذکرہ کیا ہے، جب کہ تفسیر ضیاء القرآن کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ صاحب تفسیر نے متعدد ایسے مقامات پر نعت حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پہلو نکالا

ہے جہاں اکثر مفسرین اس طرف توجہ دیے بغیر گزر گئے ہیں۔

مثلاً سورۃ الاخلاص میں تقریباً تمام مفسرین نے دلائل توحید کے انبار لگا دیے ہیں اور اس سلسلہ میں بڑی واضح اور مبسوط بحثیں رقم فرمائی ہیں، لیکن صاحب ضیاء القرآن نے لفظ "قل" کی تشریح کرتے ہوئے "عظمت رسالت" کو توحید کی سب سے بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بسا اوقات کمال بھی حجاب بن جایا کرتا ہے۔ کمالات بھی بے شمار ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے حجابات بھی انگنت ہیں۔ کہیں قوت، کہیں علم، کہیں دولت، کہیں اقتدار و حکومت اور کہیں جنگی فتوحات کے نقاب حق کے روئے زیبا کو مستور کر دیتے ہیں۔ ان حجابات کو وہی اٹھا سکتا ہے، ان نقابوں کو وہی الٹ سکتا ہے، جو خود جملہ کمالات سے یوں متصف ہو کہ اس کی نظیر پیش نہ کی جا سکے۔

اے حبیب ﷺ! ہم نے آپ کو تمام کمالات کا پیکر رعنا بنا کر بھیجا ہے۔ اٹھیے اور اپنی صدائے دلنواز سے نخوت و پندار کے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیجیے۔ فرعون نے ملک مصر کی حکمرانی سے اپنا دماغی توازن کھو دیا تھا اور خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ تجھے تو میں نے وہ سلطانی عطا فرمائی ہے کہ تیری انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس بے مثال سلطانی کے باوجود اگر تو یہ کہے کہ لا اِلٰہ الا اللّٰہ، تو کسی حکمران کی یہ مجال نہیں ہوگی کہ وہ اپنی خدائی کا اعلان کر سکے۔ ہم نے تجھے وہ شانِ رفیع عطا فرمائی ہے کہ سب نبی، سب رسول اس کی جلالت شان کو دیکھ کر سر بجیب ہیں۔ جب تو یہ کہے گا لا اِلٰہ الا اللّٰہ کہ میں بایں ہمہ کمال خدا نہیں بلکہ بندہ ہوں تو کسی کو یہ حق نہ پہنچے گا کہ وہ کسی نبی یا رسول کو خدا یقین کرے۔ تیرے علم کا بحر بے پیدا کنار ما کان و ما یکون کو محیط ہے۔ تیری نگاہِ رسا اسرار و معارف کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس علم بے پایاں کے باوجود اگر تو یہ کہے گا کہ میں خدا نہیں بلکہ اس کا بندہ ہوں، جب تیری زبان سے لا اِلٰہ الا اللّٰہ کا اعلان ہوگا تو کسی علامہ دہر اور فاضل اجل کو جرأت نہ ہوگی کہ اپنی خدائی کا دم بھر سکے۔

Marfat.com

آپ کے جدامجد، میرے خلیل نے لوہے کی گرز سے اپنی قوم کے صنم کدے میں سجے ہوئے بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اے فرزند خلیل! اٹھیے اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی کہسار شکن ضرب سے افکار و نظریات کے بت کدوں کو پاش پاش کر دیجئے تا کہ اس کے بعد کوئی سلیم الفطرت انسان یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ تیرے خدا کے بغیر بھی کوئی اور خدا ہے۔ تیرے رب کے بغیر بھی اس جہاں کا کوئی اور رب ہے۔ تیرے عزتوں والے، شانوں والے، قوتوں والے، حکمت والے، ہمہ بین اور ہمہ دان پروردگار کے سوا کوئی اور بھی خدا ہے۔ تیرے لبوں سے حق کی صدا نکلے گی، تو زمین کی وسعتیں، فضا کی پہنائیاں، آسمان کی رفعتیں، عرش کی بلندیاں اس صدائے حق سے گونجنے لگیں گی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جب صاحب تفسیر نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بحث چلاتے ہیں تو ایک وارفتگی کی کیفیت چھلکتی نظر آتی ہے، لیکن کوئی بڑے سے بڑا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ محض عقیدت اور مبالغہ ہے، بلکہ فاضل مصنف اس کی تائید میں لفظی تحقیق اور عقلی و نقلی دلائل کا اتنا حسین گلدستہ پیش کرتے ہیں کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس موضوع پر ایک طویل ترین کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ مقالہ کے اختصار کے پیش نظر یہاں میں صرف چند آیات کی طرف بطورِ استشہاد اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔ تفصیل کے لیے آپ ضیاء القرآن کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ وہ آیات مندرجہ ذیل ہیں:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح)

طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ (طٰہٰ)

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانبیاء)

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (الضحیٰ)

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ (الکوثر۔۱)

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ (النجم۔۱)

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ (بنی اسرائیل۔۱)

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ، صاحب طرزِ ادیب

کوئی نظریۂ حیات خواہ کتنا ہی دلکش اور بنی نوع انسان کے لیے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو، اس وقت تک لوگوں کے دلوں میں جگہ نہیں پا سکتا جب تک کہ اس کو دلآویز پیرایہ میں پیش نہ کیا جائے۔ اگر اس کا اظہار سطحی اور عامیانہ انداز میں کیا جائے، تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ خوبصورت شہزادے کو بوریا کا پھٹا پرانا لباس پہنا دیا گیا ہو۔

حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ اس معاملے میں بھی خاصے حساس واقع ہوئے ہیں۔ آپ نے شب و روز کی محنت اور عرق ریزی سے دنیائے ادب میں اتنا کمال پیدا کر لیا ہے کہ بلاشبہ انہیں صاحب طرز ادیبوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں بے شک ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان اور شورش کاشمیری کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، لیکن حضرت ضیاء الامت زید مجدہٗ کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بامقصد اور جاندار تحریر میں آپ اردو ادب کے صف اول کے ادیبوں سے بھی چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ آپ کا ہر ہر لفظ ایک واضح پیغام ہے، ہر ہر فقرہ سینہ میں نہاں درد کا ترجمان ہے اور جب آپ شدت احساس سے مغلوب ہو جاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قافلۂ ملت کو جگانے کے لیے صدائے جرس کو ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کا دامن پکڑ کر اس کو جھنجھوڑتے نظر آتے ہیں۔ ''عصر حاضر اور ہماری ذمہ داریاں'' کے اندر لکھتے ہیں:

میں یہ تصور کر کے لرز جاتا تھا، مجھے یہ احساس کچھ کرنے پر مجبور کرتا تھا، اگر میرا بس چلتا تو ایسا صور پھونکتا کہ سارے سونے والے سن جاگ اٹھتے، اور اگر کوئی سونا چاہتا تو اس کے لیے سونا ناممکن بنا دیتا، اگر میرے مقدور میں ہوتا تو میں ایسی دلدوز چیخ مارتا کہ پتھروں میں شگاف ہو جاتے اور احساس زیاں سے سب بے چین و بے قرار ہو جاتے، طوفان بن کر آتا اور فتنہ و فساد کے شعلوں کو بھسم کر کے رکھ دیتا، نسیم سحر بن کر چلتا، خوابیدہ غنچوں کو جگاتا، دل گرفتہ عنادل کو گدگداتا اور انہیں حیات آفریں نغموں پر مجبور کر دیتا۔

ضیائے حرم کے ''فاروق اعظم نمبر'' میں لکھتے ہیں:

Marfat.com

''ہمارے نوجوان جس ڈگر پر چل رہے ہیں، کیا ہم انہیں چلنے دیں؟ اس خوف سے کہ وہ برہم و برافروختہ نہ ہو جائیں! انہیں خودکشی کے راستے سے نہ روکیں؟

نہیں، میرے دوستو! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

یہ بلوریں جام جس میں زہر قاتل گھول دیا گیا ہے اور جسے تم فرطِ شوق سے اپنے لبوں کے قریب لے جا رہے ہو، ہم دیکھیں اور مہر بلب رہیں؟

نہیں، میرے دوستو! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

ریشم کے رنگین دھاگوں سے بنا ہوا یہ نظر فریب جال جس کی طرف تم لپکتے جا رہے ہو، ہم جانیں بھی اور خاموش رہیں؟

نہیں، میرے دوستو! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ضیائے حرم ایسا نہیں کر سکتا''۔

گلفشانی تحریر کا معجزہ دیکھنا ہو تو ان سطور کو پڑھیے۔

خیابانِ ہستی اجڑا پڑا تھا، خزاں کی چیرہ دستیوں سے گلوں کی نکہت افشانیوں اور عنادل کی نغمہ ریزیوں کی یاد تک بھی گلدستۂ طاق نسیاں بن چکی تھی، روشیں ویران تھیں اور آب جوئیں خشک، جہاں کبھی سبزۂ نو دمیدہ جنت نگاہ ہوا کرتا تھا وہاں خاک اڑ رہی تھی، یاس و قنوط کی ایک ہمہ گیر کیفیت طاری تھی کہ فاران کی چوٹیوں سے ایک گھنگھور گھٹا اٹھی، جس کا ہر قطرہ بہار آفریں اور جس کا ہر چھینٹا فردوس بداماں تھا، یہ گھٹا برسی اور خوب دل کھول کر برسی، یہاں تک کہ گلزارِ عالم میں پھر آثارِ حیات نمودار ہونے لگے۔ انسانیت کے پژمردہ چہرہ پر پھر شباب وقوت کی سرمستیاں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ خودداری و عزت نفس، شجاعت و ایثار کے افسردہ درختوں کی عریاں شاخوں کو از سر نو خلعت برگ و بار عطا ہوئی۔ قمریوں نے پھر عفت قلب ونظر کا نغمہ چھیڑا۔ توہمات اور عقائد باطلہ کے قفس کی تیلیاں ایک ایک کر کے ٹوٹیں اور ہمائے بشریت کو توحید کی مقدس و مطہر رفعتوں سے پھر دعوتِ پرواز آنے لگی۔ دنیا والوں نے اس شوخ و شنگ اور خیرات و برکات سے بھرپور گھٹا کو مُحَمَّدٌ (بہت ہی تعریف کیا گیا) صلی اللہ علیہ وسلم کے دلنواز نام سے پکارا۔ اور عالم بالا کے مکینوں نے اسے احمد (اپنے

Marfat.com

رب کا سب سے زیادہ ثنا خواں) کہا۔ لیکن حقیقت کی دلفریبیوں سے نقاب اس وقت اٹھا جب اس کے خالق و پروردگار نے اسے اپنی کائنات سے یوں روشناس کرایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء)

(سنت خیر الانام ص ۲۴)

اور بے ساختگی تحریر کا یہ انداز کتنا دلکش ہے!

''نہ سعدی کی شوخی، نہ جامی کا سوز، نہ غزالی کا ذوق و وجدان، نہ خسرو کا دردِ عشق نہ رومی کی ژرف نگاہی، نہ اقبال کی ادائے دلبرانہ اور انداز قلندرانہ، یہ سراپا نقص، اور مدحت سید الانبیاء علیہ اطیب التحیۃ والثناء میں زبان کھولے تو کیسے؟

وادیٔ ایمن کا یہ نخل بلند اور اس پر ہوش ربا تجلیات کا جھرمٹ، یہ بحر کرم اور اس کی بے پناہ فیاضیاں، یہ مہر عالم افروز اور اس کی نور افشاں کرنیں، یہ مرقع حسن ازل اور اس کی عالمگیر دلربائیاں، فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا یہ شاہکار جمیل، جو اپنی شانِ بندگی میں بے مثال اور اپنی شانِ محبوبی میں بے نظیر، جس نے زندگی کو رموز زندگی سے آگاہ کر دیا، جس نے انسان کو انسانیت کی خلعت زیبا سے نوازا، ایسے محبوب دلربا کی تعریف اور یہ دل باختہ قلم، اس جمالِ حقیقی کا بیاں اور یہ کج مج زباں، اس پیکر جود و سخا کی ثناء اور یہ شکستہ دل بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔

لیکن اگر اس آئینہ حق نما کی توصیف نہ کریں تو کس کی کریں؟ اس سراپا زیبائی کا تذکارِ حسن نہ ہو تو کیا ہو؟ اللہ رب العزت کے محبوب بندے کے عشق میں گیت نہ گائیں تو کس کے گائیں؟ اس محسن کریم کی ثناء میں زباں زمزمہ سنج نہ ہو تو پھر اس کا مصرف کیا ہے؟ اگر قلم اس کی مدحت میں نغمہ سرا نہ ہو تو آخر وہ کیا کرے؟ عقل اگر اس کی عظمتوں کو خراجِ عقیدت پیش نہ کرے تو کس کی عقیدت کا دم بھرے؟ دل اگر اس کے عشق کا دیپ روشن نہ کرے اور اس کے درد اور سوزِ فراق میں نہ جلے تو اس کی ضرورت کیا ہے؟ (ضیائے حرم میلاد النبی نمبر)

میں نے ان مندرجہ بالا سطور میں اس ہمہ پہلو شخصیت کے نظریات اور افکار کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرا طائرِ تخیل

Marfat.com

اپنی تمام تر بلند پروازی کے باوجود بھی ان رفعتوں کی نشاندہی نہیں کر سکا، جہاں میرے ممدوح کا عقابِ ہمت پر کشا ہے۔ آپ کی سیرت، آپ کا کردار میرے حیطۂ الفاظ سے وراء الوریٰ ہے، لیکن

ایک نکتہ میرے پاس ہے شمشیر کی مانند
بُرّندہ و صیقل زدہ و روشن و بُرّاق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(اقبال)

تمت بالخیر

جولائی ۱۹۸۰ء — حافظ احمد بخش (ایم۔اے)
بمقام ریسٹ ہاؤس سوڈھی جے والی — ایم۔او۔ایل، (گولڈ میڈلسٹ)
وادیٔ سون سکیسر — استاذ معاشیات وسیاسیات
دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف

نوٹ: یہ مقالہ مندرجہ تاریخ کے مطابق اختتام پذیر ہوا ۱۹۸۲ء میں بوقت اشاعت چند ضروری ترمیمات کی گئیں۔

اسوۂ حسنہ

یہ مقالہ شام ہمدرد کے تحت

حضرت ضیاء الامت

نے فلیٹیز ہوٹل لاہور میں پڑھا

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے جن برگزیدہ بندوں کو شرفِ نبوت سے سرفراز فرماتا ہے، انہیں یہ مقدس اور اہم ذمہ داری سونپتا ہے کہ وہ انسانوں کی اصلاح کر کے انہیں فلاحِ دارین کی سعادت سے بہرہ ور کریں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اصلاح سے کیا مراد ہے؟ ایک مفلوک الحال انسان کی خالی جھولی کو اگر آپ لعل و گہر سے بھر دیتے ہیں تو آپ نے اس کی مفلوک الحالی کا تو ازالہ کر دیا، لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ آپ نے اس کی اصلاح بھی کر دی، ہو سکتا ہے وہ شخص جو غربت کی حالت میں بے ضرر، مرنجاں مرنج قسم کا تھا، اب وہ دولت کے نشہ سے مخمور ہو کہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے لگے۔ ایک شخص جس کے پاس سر چھپانے کے لیے جھونپڑا تک نہیں، فٹ پاتھ پر پڑا موسم کی چیرہ دستیوں کا ہدف بنا رہا ہو، اگر آپ اس کی باعزت رہائش کا اہتمام فرما دیتے ہیں اور باد و باراں کی بے رحمیوں سے اس کو نجات مل جاتی ہے، تو اس کا یہ معنی ہر گز نہیں کہ آپ نے اس کی اصلاح بھی کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں بزم عیش و طرب آراستہ کرے اور فسق و فجور کے اندھیروں میں اپنے ساتھیوں سمیت غرق ہو جائے۔

اصلاح کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان کے پہلو میں دھڑکنے والا دل سنور جائے۔ جس شخص کا دل سنور جاتا ہے، غربت اور فاقہ کشی اس کے شرف انسانیت کو داغدار نہیں کر سکتی اور دولت کی فراوانی اسے مغرور و متکبر نہیں بنا سکتی۔ اگر وہ بوریا نشین درویش ہے، تب بھی کوئی سلطانِ وقت اس کی عزتِ نفس کو خرید نہیں سکتا۔ اور اگر وہ سریر آرائے سلطنت ہے تب بھی اس سے کوئی ایسی نازیبا حرکت سرزد نہیں ہو سکتی جس کے باعث جبینِ حیا پر شکن پڑے یا عدل و احسان کی نازک اقدار کو کوئی ٹھیس پہنچے۔ ایسے شخص کا علم جہالت کی تاریکیوں سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اس کی دولت مایوسیوں اور محرومیوں کے گھپ اندھیروں میں خوشی و

شادمانی کا چراغ روشن کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کا جاہ وجلال ضعیفوں کی پناہ اور زیر دستوں کی دستگیری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اصلاح یافتہ انسان کو آپ کسی قسم کے حالات سے دوچار کر دیں، اختیار واقتدار کے اعلیٰ ترین منصب پر آپ اسے فائز کر دیں وہ سراپا خیر ہو گا۔ وہ پیکر نور ہو گا، اس کے ظل عاطفت میں جو آئے گا، اسے سکون وقرار نصیب ہو گا وہ جدھر سے گزرے گا، فرحت وانبساط کے خزانے لٹاتا چلا جائے گا۔

اقلیم علم وحکمت کے تاجدار، نفسیاتِ انسانی کے رازداں، سرور کون ومکاں ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ۔ (1)

"بے شک جسم میں ایک پارۂ گوشت ہے، اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ کان کھول کر سن لو! وہ پارۂ گوشت "دل" ہے"۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اصلاحِ قلب کا عمل کیسے پایاں پذیر ہو؟ دل کے نگر میں اصلاح کا نور کیسے فروزاں ہو؟ دل کا قلعہ بڑا مستحکم ہے۔ اس کی فصیل بڑی مضبوط اور اونچی ہے۔ کوئی منجنیق ابھی تک ایسی نہیں جو اپنی سنگباری سے اس کی دیواروں میں شگاف ڈال سکے۔ کوئی سکندر، کوئی سیزر، کوئی نپولین، کوئی ہٹلر اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو دل کی دنیا میں اپنی فتح یابی کا ڈنکا بجا سکے۔

صرف باتیں خواہ وہ کتنی ہی سچی ہوں، ان کی فصاحت وبلاغت کا معیار خواہ کتنا ہی بلند ہو، باتیں کرنے والے کا لہجہ کتنا سلجھا ہوا ہو، یہ باتیں کانوں سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہیں۔ دل کے کان ایسی باتوں کو سننا اور قبول کرنا گوارا نہیں کرتے، جب تک قائل کے قول کی تصدیق اس کا عمل نہ کرے، عمل میں جتنا حسن وجمال ہو گا، جتنا سوز وگداز ہو گا، اور جتنی

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، ص 241، مطبوعہ وفاقی وزارت تعلیم اسلام آباد

Marfat.com

للّٰہیت ہوگی کشور دل میں اس کی فتوحات کا دائرہ اسی قدر وسیع ہوگا۔

جب دنیائے انسانیت میں ہر سو گمراہی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ظلمات بعضھا فوق بعض، کا دل خراش منظر قیامت ڈھا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں جوش آیا اور اس نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے قرآنِ حکیم جیسا صحیفۂ رشد و ہدایت نازل فرمایا، لیکن یوں نہیں ہوا کہ جبریل علیہ السلام اس کتابِ مبین کو بارگاہِ ایزدی سے لے آیا ہو اور جبل ابی قبیس کی کسی چوٹی پر رکھ دیا ہو، تاکہ اہل مکہ اس کو پڑھ کر گمراہی کی دلدل سے باہر نکل آئیں اور شاہراہ ہدایت پر گامزن ہو جائیں، بلکہ اس دعوتِ حق کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے پہلے اس دعوت کے داعی کا اہتمام فرمایا گیا۔ من کی دنیا میں حق کا پرچم لہرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے آغوشِ لطف و کرم میں لے کر پروان چڑھایا، ان کی تادیب و تربیت کا اہتمام کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى ۝ (والضحیٰ)

”اے حبیب! تیرے رب نے تجھے یتیم پایا تو اس نے تجھے اپنے آغوشِ کرم میں لے لیا“۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا (الطور: ۴۸) تو ہماری آنکھوں میں بستا ہے، تو ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، تیری جلوتیں اور خلوتیں، تیرے نالہ ہائے شب کا گداز، تیری دعاؤں کا سوز، تیرے دل دردمند کی بے قراریاں، تیرے دن بھر کی مصروفیات سب ہی کا ہم مشاہدہ بھی کر رہے ہیں اور نگرانی بھی فرما رہے ہیں اور کبھی اس حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا۔

اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِیْ۔ (1)

میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور ادب سکھانے میں کمال کر دیا۔

اس خصوصی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تجلیہ کے بعد بنی ہاشم کے اس یتیم کو صاحب کتاب

1۔ کنز العمال، ج ۱۱، ص ۴۰۶، مطبوعہ التراث الاسلامی

بنا کر سارے عالم کی راہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱)

یعنی پیغامِ حق جاننا چاہو، تو قرآنِ کریم کا بغور مطالعہ کرو، اور ان تعلیمات کی دلربائیوں کو محسوس پیکر میں جلوہ فگن دیکھنے کے آرزومند ہو تو میرے محبوب کی زندگی کے شب و روز میں مشاہدہ کرو۔ جس سچائی کا بیان فرقانِ حمید کی آیات و کلمات کر رہے ہیں، تم اس کا زندہ نمونہ ذات پاک مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء میں ملاحظہ کرو گے۔ کتاب میں جو کچھ پڑھو گے یہاں ہو بہو اس کو دیکھ لو گے۔ سر مو بھی تفاوت نہیں پاؤ گے۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ۝ (الملک)

غور سے دیکھو، کیا یہاں تمہیں کوئی شگاف نظر آرہا ہے؟ ایک بار نہیں بار بار دیکھو تمہاری نگاہیں تکتے تکتے درماندہ ہو کر لوٹ جائیں گی، لیکن تمہیں وہاں کوئی نقص یا خامی دکھائی نہیں دے گی۔

اس لیے جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلق کے بارے میں استفسار کیا، تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ (1) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق بعینہٖ قرآن تھا۔ اتنا جامع اور مختصر جواب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی دے سکتی ہیں۔

گزشتہ آیات پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱) اس کا لفظی ترجمہ ہے: بے شک تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اسوۂ حسنہ ہے۔

''اُسوۃ'' کا معنی ہے نمونہ۔ یہاں صرف ''اُسوۃ'' نہیں فرمایا، بلکہ اس کو ایک صفت سے موصوف کیا۔ عربی لغت میں متعدد الفاظ ہیں جو اُسْوَةٌ کی صفت بن سکتے ہیں مثلاً۔

1۔ کنز العمال، ج ۷، ص ۲۲۲، مطبوعہ التراث الاسلامی

Marfat.com

اُسْوَةٌ کَامِلَةٌ، اُسْوَةٌ سَامِیَةٌ بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن علیم و حکیم خدا نے اپنے رسول کے اسوۃ کی توصیف کے لیے جو وصف منتخب فرمایا، وہ "حَسَنَةٌ" ہے اور حَسَنَةٌ کا معنی ہے ذَاتَ حُسْنٍ یعنی حسن و جمال والا۔

اس طرح اس حقیقت کو واضح کیا کہ میرے حبیب کا عمل عام نوعیت کا نمونہ نہیں، بلکہ ایسا نمونہ ہے، جس میں حسن ہے، جس میں جمال ہے، جس کی رعنائیوں اور زیبائیوں کے سامنے دلوں کے قفل ٹوٹ کر گرتے چلے جاتے ہیں، جس کی اداؤں کے تاؤ سے مخالفت کی چٹانیں پگھل جاتی ہیں۔

اس تعبیر میں حکمت یہ ہے کہ دل صرف سلطانِ حسن کا حلقہ بگوش اور باجگزار ہو جاتا ہے۔ اس کا سر پندار فقط محبوب کی دل فریب اداؤں کے سامنے جھکتا ہے اور سیرت مصطفیٰ ﷺ میں حسن اپنی تمام جلوہ سامانیوں، اپنی ساری زیبائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ سمٹ کر آ گیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ حسن کے ان گنت روپ ہیں: رُخ زیبا، قامت بالا، چشم غزالیں کے علاوہ راست بازی، ثابت قدمی، شجاعت، سخاوت۔ یہ سب حسن کے جلوے ہیں، جو یہاں اپنے پورے شباب پر دکھائی دیتے ہیں۔ حسن کی کسی ادا کا کوئی دلدادہ ہو اور اس کے کسی روپ کا کوئی قدردان ہو، اب بارگاہ جمالِ مصطفیٰ میں باریاب ہوتا ہے تو از خود رفتہ ہو کر یہ نعرہ لگاتا ہے ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر (1)

اسی کوچہ میں آ کر دل کی دنیا بدل جاتی ہے، خوب و زشت کا معیار بدل جاتا ہے، سود و زیاں کا تصور بدل جاتا ہے۔ پھر دعوتِ حق نہاں خانۂ دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور انسان بڑے ذوق و شوق سے یوں گنگنانے لگتا ہے ؎

1۔ بالِ جبریل، کلیات اقبال اردو ص ۲۹۹ مطبوعہ شیخ غلام علی

Marfat.com

اَتَانِیْ هَوَاهَا قَبْلَ اَنْ اَعْرِفَ الْهَوٰی
فَصَادَفَ قَلْبًا فَارِغًا فَتَمَكَّنَا (1)

"اس کی محبت آئی اور اس وقت آئی جب مجھے محبت کا مفہوم ہی معلوم نہ تھا، اس نے میرے دل کو خالی پایا اور اس پر اپنا تسلط جمالیا"۔

یہی وجہ ہے کہ بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ سے فیض یاب ہونے والوں میں ہمیں عربی بھی ملتے ہیں اور عجمی بھی، کریم اور شجاع بھی ہمیں ملتے ہیں اور ضعیف و ناتواں بھی، دولت مند بھی ملتے ہیں اور فقیر و نادار بھی۔ جس کسی میں حسن کے کسی پہلو کے لیے کشش ہوتی ہے وہ یہاں آ کر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ نگاہِ حقیقت شناس، حضور ﷺ کے صحابہ کرام کی سیرت کے آئینوں میں جمالِ یار کا عکس جمیل عیاں دیکھتی ہے۔ حضور ﷺ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والوں میں نبوت کا رنگ جھلکتا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ نمونہ جتنا خوب صورت اور دلکش ہے اسی قدر وسیع اور کشادہ بھی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے لیے اس میں پروگرام نہ ہو۔ انسانیت کا کوئی روگ ایسا نہیں جس کے لیے اس میں تریاق نہ ہو۔ تہہ در تہہ ظلمتوں کو کافور کرنا اس کا خاصہ ہے۔ اس کی برکت سے آلائشیں دور ہوتی ہیں، روح کو پاکیزگی اور دل کو طہارت نصیب ہوتی ہے، سیرت و کردار میں وہ استواری اور ثبات نمایاں ہوتا ہے، جسے پھر کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں دے سکتا۔ عبادات، معاملات، تہذیب و تمدن، معاشیات و معاشرت الغرض کوئی میدان ہو، اسوۂ حسنہ کا ابر رحمت ان پر سایہ فگن ہوتا ہے اور اپنی رم جھم سے موت کی نیند سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے، ان کی نشو و نما کرتا ہے اور زندگی کے دامن کو سوز و نشاط سے لبریز کر دیتا ہے۔

میرے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ اس مختصر صحبت میں، میں حضور سرورِ عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے تمام پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ ہی تذکرہ کر سکوں۔ البتہ اس گلشن حکمت کے ایک دو گلہائے رنگین پیش خدمت کرنے کی سعادت ضرور حاصل کروں گا۔ یہ واقعات ہیں تو

1۔ کتاب الحماسہ۔ ص ۱۴۵ مطبوعہ دائرۃ المعارف دکن۔

Marfat.com

بالکل سادہ، لیکن ان کی تاثیر سے عرب کے گنوار، صحرانشینوں کے دل کی دنیا میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور ان میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔

نبی اکرم ﷺ ایک دفعہ سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ راستہ میں پڑاؤ ہوا۔ مختلف حضرات کو مختلف ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ کوئی خیمے نصب کر رہا ہے، کوئی سواری کے جانوروں کے چارہ کا انتظام کر رہا ہے، کوئی پانی بھر کر لا رہا ہے، کوئی آٹا گوندھ رہا ہے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ چپکے سے وہاں سے اٹھ کر کہیں چلے جاتے ہیں۔ صحابہ کرام کچھ دیر بعد حضور ﷺ کو اپنے درمیان نہ پا کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ متجسس نگاہیں چارسو تلاشِ حبیب میں سرگرداں ہیں، جیسے جیسے تاخیر ہوتی جاتی ہے، بے چینی اور اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام کو دور سے ایک نورانی پیکر نظر آتا ہے اور جب قریب ہوتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ ان کا آقا و مرشد ﷺ جنگل سے لکڑیاں چن کر ان کا گٹھا بنا کر اپنے سر پر اٹھائے ہوئے لا رہا ہے۔ صحابہ کرام عرض کرتے ہیں: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! (ﷺ) حضور ﷺ نے یہ زحمت کیوں گوارا کی؟ ہم غلام اس خدمت کے لیے کافی نہ تھے؟ حضور ﷺ بڑی سادگی سے فرماتے ہیں:

''تم سب کام کر رہے تھے، میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ خود معتبر بن کر بیٹھا رہوں''۔

صحابہ کرام، جو اس نورانی منظر کو دیکھ کر پہلے ہی مسحور ہو چکے تھے۔ یہ بے تکلفانہ جواب سن کر ان کے ایمان و یقین کو نئے بال و پر نصیب ہو گئے۔

میدانِ خندق کا یہ واقعہ کسے معلوم نہیں کہ اگر صحابہ کرام خندق کھودنے میں مصروف ہیں، تو ان کا نبی مکرم ﷺ بھی ہاتھ میں کدال لیے کبھی پتھریلی زمین کو کھود رہا ہے اور کبھی مٹی سے بھری ہوئی ٹوکری اپنے سراپا یمن و سعادت سر پر اٹھائے باہر پھینک رہا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عملی زندگی کی یہی دل فریبیاں تھیں جنہوں نے عرب کے بدوؤں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ آج بھی اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کو پذیرائی نصیب ہو اور یہ پیغام حق دلوں کی دنیا میں ہل چل پیدا کر دے تو اس کی صرف یہی

Marfat.com

صورت ہے کہ قرآن کی تعلیمات کے حسین خدوخال کو سیرت مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شفاف آئینہ میں لوگوں کو دکھایا جائے تاکہ جمالِ حق کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اس کی فطرت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ جب تک ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے اجاگر نہیں کریں گے۔ ہم نہ اپنے فریضۂ تبلیغ سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور نہ اپنی بات کو لوگوں سے منوا سکتے ہیں۔ نوعِ انسانی کو دین اسلام کی جس قدر آج ضرورت ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے تمدن اور ثقافت سے مایوس ہو چکی ہیں۔ انہیں ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے چشمۂ شیریں سے اپنی پیاس بجھائیں، اس لیے ہر وہ شخص جس کے دل میں انسانیت کے لیے درد ہے، جو اپنے بھائیوں کی ضلالت و گمراہی پر پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے، جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور دعوت کے کامل و مکمل ہونے کا یقین محکم ہے، اس کا یہ خوشگوار فریضہ ہے کہ ان اندھیروں میں بھٹکنے والی مخلوق کی راہنمائی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو بڑے مدلل اور دلکش انداز میں پیش کرے۔

Marfat.com

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بحیثیت معلم اخلاق

11 فروری 1979ء کو نیو کیمپس (پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں

منعقد ہونے والی عظیم الشان "بین الاقوامی سیرت کانفرنس"

میں پڑھا جانے والا ایک اہم مقالہ

Marfat.com

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ محمد خاتم الانبیاء والمرسلین الذی ارسل الی کافۃ للناس بشیرا ونذیرًا وعلی الہٖ واصحابہٖ ومن تبعہ الی یوم الدین، اما بعد! فقال اللہ تعالیٰ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا

صدرِ محترم اور معزز خواتین وحضرات!

جس شب برصغیر کے طول و عرض میں بسنے والے فرزندانِ اسلام کو بارگاہِ رب ذوالجلال سے پاکستان کا انعام مرحمت ہوا تھا، وہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات تھی، یعنی نزولِ قرآن کی سعادتوں اور برکتوں سے معمور رات جسے لیلۃ القدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس صبح کو تخلیق پاکستان کے مقصد جلیل کی تکمیل ہو رہی ہے، وہ ۱۲ ربیع الاول کی صبح سعید ہے، یعنی صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلادِ پاک کی صبح ارجمند۔

یہ محض اتفاق نہیں بلکہ تقدیروں کے خالق اور شئونِ کائنات کے رب کا فیصلہ ہے کہ دو گراں قدر انعام ان مبارک ساعتوں میں بخشے جائیں۔ اس فیصلہ میں بڑی حکمتیں ہیں جو اہل دل کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں اور یہ بھی علیم وحکیم خدا کی تقسیم ہے کہ تخلیق پاکستان کا اعزاز قائداعظم کو بخشا اور مقاصد پاکستان کی تکمیل یعنی نظامِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے نفاذ کے اعلان کی سعادت جناب جنرل محمد ضیاء الحق کو نصیب ہوئی۔

ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۴﴾ (الجمعہ)

مجھے فرمایا گیا کہ میں ''نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت معلم اخلاق'' کے عنوان پر بارگاہِ حسن و جمال اور عظمت و کمال میں اپنے دلِ نیازمند کی طرف سے عقیدت ومحبت کے چند پھول پیش کروں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا شرف ہے۔ جنہوں نے مجھے یہ موقع بخشا ہے، میں ان کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

خواتین وحضرات! یہ جہانِ رنگ و بو جلوہ گاہِ حیات ہے۔ زندگی کی بوقلموں رنگینیوں

کے باعث یہ جہاں آباد ہے۔ گو نباتاتی اور حیوانی زندگی میں بھی رنگینیوں کے بڑے دلکش اور دلربا مینا بازار سجے ہوئے ہیں، لیکن انسانی زندگی میں جو رعنائیاں اور ندرت آفرینیاں ہیں، یہاں تخلیقی قوتوں کے جو سمندر موجزن ہیں، وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ یہ انسان ہی ہے جس کو خلعت وجود بخشنے کے بعد اس کے خالق نے فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین)

اس قدرت و طاقت والے نے عرش و فرش، کائنات کی لامتناہی وسعتوں کو لفظ کن سے پیدا کیا، لیکن آدمِ خاکی کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا:

لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ (ص:۷۵)

''میں نے اسے اپنی قدرت کے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا''۔

علم اور عمل، فکر اور تخلیق، تدبیر اور تعمیر کی جو بے پناہ صلاحیتیں اس پیکر خاکی میں ودیعت فرمائیں، ان کا تذکرہ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (حجر:۲۹) کے معنی خیز الفاظ سے کیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات حکمت، علم اور قدرت کا یہ شاہکار سب سے الگ تھلگ انفرادی زندگی بسر کرے، خلاق عالم کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اگر وہ عزلت اختیار کرتا تو وہ بے پایاں صلاحیتیں بے مصرف ہو جاتیں۔ اس چشمۂ حیوان سے کوئی تشنہ لب اگر سیراب نہ ہوتا تو اس کے حیات بخش اثرات کا کسے علم ہوتا؟ ان صفات کے ودیعت فرمانے والے کے حضور فرطِ عقیدت سے جبین نیاز کون جھکاتا؟ حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ انسان اجتماعی اور معاشرتی زندگی بسر کرے، اور اپنے فکر و نظر کے چراغ روشن کر کے شبستان وجود کو منور بھی کرے۔ وہ ماں باپ کا بیٹا بھی ہو اور اپنے بیٹے بیٹیوں کا باپ بھی۔ اس کے خاندان کے افراد اس کے لیے تقویت کا باعث ہوں، ضرورت کے وقت وہ ان کا سہارا بنے۔ حتیٰ کہ اس کے تعلقات کا حلقہ سارے ملک اور ساری قوم کو اپنے احاطہ میں لے لے۔ ان معاشرتی تعلقات کے باعث حقوق و فرائض کا معرضِ وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد جب تک اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا نہیں کرے گا، نیز جب تک اسے اپنے حقوق کی بازیابی کا

Marfat.com

یقین نہ ہوگا، اس وقت تک صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے حقوق وفرائض میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قانون کی طاقت سے اس توازن کو برقرار رکھا جائے، اور جو شخص بھی اس توازن کو بگاڑنے کا مرتکب ہو اس کی سرکوبی کردی جائے۔ اور یا اس کی اخلاقی قوتوں کو بیدار کیا جائے اور ایسے خطوط پر ان کی نشوونما کردی جائے کہ پھر ہر قسم کے حالات میں وہ راہِ اعتدال پر ثابت قدمی سے چلتا رہے۔ قانون کی عملداری انسانی زندگی کے صرف چند گوشوں پر ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں، جہاں قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ نیز ہر کام اگر قانون کے زور سے کرایا جائے تو خلوص و ایثار اور محبت و پیار کے غنچے کھل کر پھول نہیں بن سکیں گے۔ اسلام نے حقوق وفرائض میں توازن پیدا کرنے اور پھر اسے برقرار رکھنے کے لیے اور معاشرہ کو ہر قسم کی بے راہ روی سے بچانے کے لیے اخلاقی تربیت پر اسی لیے بہت زیادہ توجہ دی ہے۔

اس سے قبل کہ میں "حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت معلم اخلاق" کے عنوان پر اظہار خیال کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ خلق کی تشریح کردوں تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ علامہ ابن منظور، لغت کی مشہور کتاب "لسان العرب" میں لکھتے ہیں:

اَلْخُلُقُ وَالْخُلُقُ: السَّجِيَّةُ وَ هُوَ الدِّيْنُ وَالطَّبْعُ وَ السَّجِيَّةُ۔ وَ حَقِيْقَتُهُ اَنَّهُ لَصُوْرَةُ الْاِنْسَانِ الْبَاطِنَةُ۔ وَ هِيَ نَفْسُهُ وَ اَوْصَافُهَا وَ مَعَانِيْهَا الْمُخْتَصَّةُ بِمَنْزِلَةِ الْخَلْقِ لِصُوْرَةِ الظَّاهِرَةِ وَ اَوْصَافِهَا وَ مَعَانِيْهَا۔ (1)

"یعنی خلق اور خُلق کا معنی فطرت اور طبیعت ہے۔ انسان کی باطنی صورت کو بمعہ اس کے اوصاف اور مخصوص معانی کو خُلق کہتے ہیں۔ جس طرح اس کی ظاہری شکل وصورت کو خَلق کہا جاتا ہے"۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو دانش ایمانی اور دانش برہانی دونوں سے مالا مال ہیں، جو حکمت

1۔ لسان العرب، ج ١٠، ص ٨٦۔ دار صادر بیروت

Marfat.com

وفلسفہ کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کے بھی ماہر ہیں، خلق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فَالْخُلُقُ عِبَارَةٌ عَنْ هَيْئَةٍ فِي النَّفْسِ رَاسِخَةٍ، عَنْهَا تَصْدُرُ الْاَفْعَالُ بِسُهُوْلَةٍ وَ يُسْرٍ مِنْ غَيْرِ حَاجَةٍ اِلٰى فِكْرٍ وَ رُوْيَةٍ۔ (1)

''یعنی خُلق، نفس کی اس راسخ کیفیت کا نام ہے، جس کے باعث اعمال بڑی سہولت اور آسانی سے صادر ہوتے ہیں۔ ان کے ظاہر کرنے کے لیے سوچ و بچار کے تکلف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی''۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ وہ اعمال جو کسی سے اتفاقاً صادر ہوتے ہیں یا کسی وقتی جذبہ اور عارضی جوش سے ان کا ظہور ہوتا ہے، وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ اور عمدہ ہوں، انہیں خلق نہیں کہا جائے گا۔

خلق کا اطلاق انہیں خصال و عادات پر ہوگا جو پختہ ہوں، جن کی جڑیں قلب و روح میں بہت گہری ہوں، انہیں غیر متزلزل اور پختہ صفات پر کامیاب زندگی کا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ انہیں پر اعتماد کرتے ہوئے قومی ترقی اور اصلاح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ کسی ترنگ میں آ کر اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے، تو ہم اسے سخی نہیں کہیں گے۔ جو شخص کسی وقتی جوش کے تحت اپنے دشمن پر حملہ کر کے اسے مار گرائے، اسے ہم شجاع نہیں کہیں گے۔ اس سے یہ توقع عبث ہے کہ جب بھی اسے میدانِ جہاد میں سر بکف آنے کی دعوت دی جائے گی تو وہ اسے قبول کرے گا۔

اس لیے نیک اور عمدہ افعال کو پیدا کرنا پھر ان کو اس طرح پختہ اور استوار کرنا کہ ان سے مطلوبہ اعمال کا ظہور اس طرح بے تکلفی سے ہو، جس طرح چشمہ سے پانی ابلتا ہے یا آنکھ اپنے گرد و پیش کو دیکھتی ہے یا کان آواز سنتے ہیں۔ یہ کیفیت افراد و قوم کی صحت مند ترقی کے لیے جس قدر اہم اور ضروری ہے، اس قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے۔ اس کٹھن اور

1۔ احیاء العلوم، ج ۳، ص ۴۶، العثمانیہ المصریۃ

Marfat.com

خطرناک مہم کو سر کرنے کے لیے حکماء اور فلاسفہ نے بڑی کوششیں کیں، لیکن ان کے باہمی اختلافات اور ان کی نظریاتی کش مکش نے ان کی محنت کو بے ثمر کر دیا ہے۔

وہ یہ طے نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ ابی نور اور اس کے ساتھی لذت والم کو خیر و شر کا معیار ثابت کرنے میں اپنی ذہنی قابلیتیں کھپاتے رہے، ان کے معتقدات کے معبد میں مدتوں، لذت کے صنم کی پرستش بڑی دھوم دھام سے ہوتی رہی۔ زینو، جو ایک مستقل مکتبہ فکر (مدرسہ رواقیہ) کا مؤسس تھا، اس نے اس کے برعکس نفس کشی اور لذات سے کلی اجتناب کو خیر کا سرچشمہ قرار دیا۔ افلاطون استاد ہے اور ارسطو شاگرد۔ اقلیم دانش وحکمت کے دونوں تاجور ہیں۔ دونوں کی عبقریت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ دونوں کا زمانہ بھی ایک ہے، لیکن یہ دونوں بھی متفقہ طور پر فیصلہ نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ استاد مثل علیا اور غیر محسوس جہاں کے طواف میں سرگرداں ہیں اور اس کا شاگرد ارسطو عالم محسوسات سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتا۔

یہ ذہنی خلفشار صرف اس زمانہ کی خصوصیت نہیں جب کہ حکمت و فلسفہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھے، بلکہ آج بھی جب کہ فکر انسانی کی یلغار سے خلاء میں کہرام برپا ہے، بے یقینی کی وہی کیفیت ہے۔ ہربرٹ سپنسر، جان لوک اور ہیگل وغیرہ، جن فلسفیوں نے علم اخلاق کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے، ان کی گنجلک تحریریں پڑھ کر آپ کا سر چکرانے لگے گا۔ انہوں نے روحوں کو اضطراب، دلوں کو بے چینی اور عقلوں کو بے یقینی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ انہوں نے کسی ایسی راہ کی نشاندہی نہیں کی جو مسافر کو منزل تک پہنچا دے۔ البتہ انہوں نے آبلہ پا راہروؤں کے راستہ میں تشکیک کے کانٹے بڑی کثرت سے بکھیرے ہیں۔ یقین کی ٹمٹماتی ہوئی شمع، جس کی مدہم لو میں افتاں وخیزاں وہ سوئے منزل رواں تھی، وہ بھی بجھ گئی۔ ترجمانِ حقیقت حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

انجامِ خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت (1)

ان کو اپنا راہبر بنانے والوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے اور وہ اپنے ممدوح کو اس کے صحیح روپ میں دیکھتے ہیں، وہ فضائل، وہ خصائل حمیدہ، وہ اخلاقِ عالیہ جن کی تعریف میں اس نے صدہا ورق سیاہ کیے تھے، اس کی عملی زندگی میں توازن کا نام ونشان تک نہیں، بلکہ وہ تو رزائل کی دلدل میں کمر تک دھنسا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اپنی قوم کے اخلاق کو درست کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، وہ انبیائے کرام کا گروہ تھا۔ ان کی باتیں سادہ اور واضح تھیں۔ ان کی تعلیمات میں الجھاؤ اور التباس نہیں تھا۔ ان کے ہاں پیچیدہ علمی اصطلاحات کی بھرمار نہیں تھی، بلکہ ان کے ارشادات عام فہم اور دلوں میں گھر کر جانے والے تھے۔ انہوں نے خیر وشر کا معیار لذت والم، نفس پرستی یا نفس کشی کو قرار نہیں دیا، انہوں نے اخلاقِ حسنہ کی غرض وغایت بیان کرنے کے لیے سعادت، مسرت، قوت، غلبہ کے مبہم الفاظ استعمال نہیں کیے، تا کہ ان کا شارح حسب منشا ان کو معانی کا لباس پہناتا رہے، بلکہ اس کدوکاوش اور جدوجہد کی غرض وغایت رضائے الٰہی کو قرار دے کر ان تمام فکری الجھنوں کو ختم کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ جس چیز نے گروہ انبیاء کی تعلیمات کو قبول عام بخشا اور ان کے لیے دلوں کے دریچے کھول دیے۔ وہ ان نفوسِ قدسیہ کے قول وعمل کی ہم آہنگی اور یکسانیت تھی۔ وہ دوسروں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیتے تھے، پہلے خود اس پر کاربند ہوتے۔ مزید یہ کہ ان کے یہ اعمال کسی ذاتی غرض اور منفعت سے وابستہ نہ تھے۔ ان کے اقوال کی دلنشینی، ان کے اعمال کا بانکپن اور ان کے خلوص کی مہک نے ان لوگوں کی کایا پلٹ دی، جن کو ان کی

1۔ ضرب کلیم 18۔ کلیات اقبال اردو، ص ۴۸۰۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز

Marfat.com

صحبت کا فیضان نصیب ہوا۔

لیکن انبیائے سابقین کا دائرۂ کار محدود تھا۔ ان کی بعثت کا مقصد کسی ایک قوم کی یا کسی ایک ملک کے باشندوں کی اصلاح تھا اور وہ بھی محدود وقت تک کے لیے۔ بارگاہِ الٰہی سے یہ شرف اور یہ اعزاز فقط عبد مکرم، رسول معظم محمد رسول اللہ ﷺ کو ارزانی ہوا کہ آپ کی رسالت ہر اسود و احمر، عربی و عجمی، شرقی و غربی کے لیے تھی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا:۲۸)

''اے حبیب مکرم! ہم نے آپ کو تمام اولادِ آدم علیہ السلام کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا ہے''۔

آپ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ آپ کا آفتاب نبوت تا قیامت نور افشانی کے لیے طلوع ہوا ہے۔

اصلاحِ اخلاق کا فریضہ جو ہر نبی نے اپنے مقام اور حیثیت کے مطابق انجام دیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے حضور ﷺ نے اپنے آپ کو وقف فرما دیا ہے، ارشاد ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ (1)

مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں مکارمِ اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچادوں۔

تکمیل اخلاق کا یہ فریضہ حضور سرورِ دو عالم ﷺ نے جس حسن و خوبی سے انجام دیا، اس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ اخلاقی تعلیم کی جامعیت

۲۔ اندازِ تعلیم

۳۔ معلم کی شخصیت

سابقہ انبیائے کرام کی تعلیمات جو ہم تک پہنچی ہیں، ان سے صرف زندگی کے چند گوشوں میں رہنمائی ملتی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام ہمیں مصائب و امراض میں صبر و

1۔ کنزل العمال۔ الشفا، ج ۱، ص ۱۲۶، دار الکتاب العربی بیروت

Marfat.com

استقامت کی ایک چٹان نظر آتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے کے فراق میں آنسوؤں کی لڑیاں پروئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں شدت اور سختی کا عنصر غالب ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہِ زیتون پر کھڑے اپنے سامعین کو عفو و درگزر اور رحمت و شفقت کی تلقین کرتے سنائی دیتے ہیں۔ زندگی کے ایسے گوشے بھی ہیں، جہاں ان نفوسِ قدسیہ نے بھی قدم نہیں رکھا اور ایسے نقوش بھی نہیں چھوڑے جن سے آنے والی نسلیں اپنی منزل کا سراغ لگا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام مہجور و متروک گوشوں کو نورِ ہدایت سے منور کرنے کے لیے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کی خلعتِ زیبا عطا فرما کر اپنی مخلوق کی چارہ گری کے لیے مبعوث فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو ہمیں جہاں زندگی کی بو قلمونیوں کا ایک حسین و جمیل مرقع نظر آتا ہے وہاں جنگ کی شعلہ سامانیاں بھی ہیں اور صلح کی رافت و رحمت بھی۔ دشمن نفرت کے انگارے بھی برساتے ہیں اور عقیدتمند اپنی محبت و مودت کے رنگین پھول بھی نچھاور کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے محبوب خدا کو حلقۂ یاراں میں بھی دیکھا ہے اور حملہ آوروں کے نرغہ میں بھی۔ ہم نے ان کی کاروباری مصروفیتوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور غارِ حرا کی خلوتوں میں ان کے سوز و گداز کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ہم نے انہیں وطن سے بظاہر انتہائی بے بسی اور بے کسی میں ہجرت کرتے بھی دیکھا ہے اور پھر چند سال بعد اسی شہر میں فاتحانہ انداز میں داخل ہونے کا منظر بھی ملاحظہ کیا ہے۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کا برتاؤ کا ریکارڈ بھی ہمارے سامنے ہے اور اپنے جانثار اور وفا شعار ساتھیوں سے حسن سلوک کی تفصیلات بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ الغرض زندگی کے وسیع و عریض میدان کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں حبیب کبریا نے اپنے اسوۂ حسنہ کے حسین و جمیل نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ یہ جامعیت، یہ ہمہ گیری اسوۂ محمدی کے بغیر کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی اس آبِ زلال سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اس دارالشفا میں انسانیت کے ظاہری و باطنی، سیاسی و معاشی، سماجی و اخلاقی، ہر قسم کے ناقابل

علاج لوگوں کے لیے اکسیر موجود ہے۔ خاتم الانبیاء کو بارگاہِ الٰہی سے جو کتاب منیر مرحمت ہوئی، اس کے مندرجہ ذیل مقامات کا ہی اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو حضور ﷺ کا لایا ہوا نظامِ اخلاق اپنی تمام تر رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جلوہ فگن ملے گا۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۷۶، ۱۷۷، سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات، سورۃ الفرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۴۔

اندازِ تعلیم

مذکورہ بالا آیات میں اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اور افادیت کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے کوئی سلیم الطبع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے وہ ارشادات جن میں اخلاق حسنہ کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے، وہ بھی بڑے دلنشیں اور روح پرور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

سرورِ کائنات علیہ التحیات والتسلیمات نماز میں اکثر یہ دعا مانگا کرتے:

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَ اصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَاتِھَا لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَاتِھَا اِلَّا اَنْتَ۔ (1)

اے اللہ! بہترین اخلاق کی طرف تو میری رہنمائی فرما۔ تیرے سوا بہترین اخلاق کی طرف کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے کیونکہ تو ہی برے اخلاق کو مجھ سے دور کر سکتا ہے۔

یہ اس پاک ہستی کی دعا ہے جس کے اخلاق حسنہ کی گواہی عالم الغیب والشہادۃ نے یوں دی ہے: وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم۔ ۴) یہ اس پیکر خصائل حمیدہ کی دعا ہے جس کا دامن ہر قسم کی نازیبا حرکات کے داغ سے پاک ہے۔ ایسی ہستی جب عجز و نیاز سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتی ہوگی تو خود سوچیے، صحابہ کرام کے دلوں پر اخلاق حسنہ کی اہمیت کے نقوش کس طرح ثبت ہوتے ہوں گے۔

اہل ایمان کے نزدیک ایمان سے بڑھ کر کوئی قیمتی دولت نہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 263، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

Marfat.com

ماننے والوں کو جب یہ ارشاد فرمایا ہوگا تو اخلاقِ کریمہ کی اہمیت ان کی نگاہوں میں بڑھ گئی ہوگی۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔ (1)

''جس شخص کا خلق بہترین ہوگا۔ تمام مومنوں سے اس کا ایمان اعلیٰ اور اکمل ہوگا''۔

ہر نیک دل انسان عباداتِ الٰہی میں لذت و سرور محسوس کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ یادِ الٰہی کی شمع فروزاں رہے اور وہ بصد جان اس پر قربان ہوتا رہے۔ ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص کثرتِ عبادات پر ناز کرنے لگے اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کم ہو جائے اس انتشار سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے محبوب نے تنبیہ فرمادی:

اِنَّ الرَّجُلَ لَیُدْرِکُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّیْلِ وَ صَائِمِ النَّهَارِ۔

(ابوداؤد)

''انسان اپنے اخلاق کے باعث اس درجہ پر فائز ہو جاتا ہے جو رات بھر ذکرِ الٰہی میں کھڑے رہنے والے اور عمر بھر روزہ رکھنے والے کو نصیب ہوتا ہے''۔

کون بندہ ہے جس کے دل میں اپنے پروردگار کی رضا اور محبت کی تمنا چٹکیاں نہ لے رہی ہو؟ اس کا طریقہ بتادیا:

اَحَبُّ عِبَادِ اللّٰهِ اِلَی اللّٰهِ اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔ (2)

''اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہوتا ہے جس کے اخلاق پسندیدہ ہیں''۔

اسی طرح ہر بندۂ مومن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہادی و مرشد ﷺ کی اس پر نگاہ لطف و کرم ہو اور قیامت کے روز اسے اپنے آقا کے قرب میں جگہ ملے، چنانچہ اپنے مشتاقانِ جمال کو یہ فرما کر بشارت دی۔

اِنَّ اَحَبَّکُمْ اِلَیَّ وَ اَقْرَبَکُمْ مِنِّیْ فِی الْاٰخِرَةِ مَجْلِسًا مَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا وَ

1۔ کنز العمال، ج 3، ص 15، التراث الاسلامی 2۔ کنز العمال، ج 3 ص 5، التراث الاسلامی

Marfat.com

اِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَیَّ وَ اَبْعَدَكُمْ مِنِّیْ فِی الْاٰخِرَةِ مُسَاوِیْكُمْ اَخْلَاقًا۔ (1)

"تم میں سے مجھے سب سے زیادہ پیارا اور آخرت میں سب سے زیادہ میرے قریب وہ شخص ہوگا، جو خوش خلق ہے اور تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور بروزِ قیامت مجھ سے دور وہ شخص ہوگا جو بد خلق ہے"۔

بے شمار ارشاداتِ نبوت میں سے یہ چند اقوال پیش خدمت کیے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تڑپ پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر اور دلنشیں اسلوب کوئی کہاں سے لائے گا؟

جن چیزوں کو اخلاقِ حسنہ کہا گیا ہے وہ کیا ہیں؟

انسانی معاشرہ کا فرد ہوتے ہوئے معاشرہ کے دوسرے افراد کے جو حقوق اس پر واجب ہیں، ان کو حسن و خوبی سے انجام دینا ہی حسن خلق کہلاتا ہے ماں باپ، بیوی بچے، پڑوسی، یتیم، بیوہ، سائل، بیمار، مسافر، مجاہد، سب کے ساتھ مروت و احسان کرنے کی تاکید ارشاداتِ نبوت میں موجود ہے۔ یہ تعلیم اتنی جامع اور ہمہ گیر ہے کہ انسان تو انسان، حیوانات و نباتات بھی اس میں داخل ہیں۔ شیر دار جانوروں کو تلف کرنے، پھلدار درختوں کو کاٹنے، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو ویران کرنے، بستے ہوئے گھرانوں کو اجاڑنے، ان سب چیزوں سے منع کر دیا گیا ہے۔ اسلوبِ تخاطب اتنا شیریں ہے کہ اس کی مٹھاس اور لذت سب روح کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ بخاری شریف میں ایک فاحشہ عورت کا تذکرہ ہے جس کے عمر بھر کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے معاف فرما دیا کہ اس نے پیاس سے تڑپتے ہوئے ایک کتے کو پانی پلا دیا تھا۔ بیوہ عورتوں، مسکین لوگوں کی خدمت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے:

اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمِلَةِ وَ الْمِسْكِیْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ كَالَّذِیْ یَصُوْمُ النَّهَارَ وَ یَقُوْمُ اللَّیْلَ۔ (2)

1۔ کنز العمال، ج 3، ص 12 2۔ بخاری شریف، ج 2 ص 888، وزارت تعلیم

''بیوہ اور غریبوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور اس عابد کی مانند ہے، جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے''۔

یتیم کی حفاظت اور کفالت کے شوق کو یوں مہمیز لگائی ہے:

اَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيْمِ فِى الْجَنَّةِ هٰكَذَا۔(1)

''کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں ساتھ ہوں گے جس طرح ہاتھ کی یہ دو انگلیاں''۔

بے شک معلم اخلاق کی تعلیمات ہمہ گیر اور عالمگیر ہیں اور ان کا اسلوبِ بیاں بھی دلنشیں اور لذیذ ہے۔ لیکن معلم کریم کی شخصیت میں جو دلربائیاں اور رعنائیاں ہیں، وہ قلب و نظر کو مسحور کر رہی ہیں۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر دل دیوانہ اور روح سرشار ہو جاتی ہے۔ ان کی ذات والا صفات میں جو بانکپن اور نکھار ہے، اس نے ان کی دعوت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ کوئی بات نہیں فرمائی جس پر خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو۔ لوگوں کو سچ بولنے اور امانت میں دیانت کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی تو خود راست گفتاری اور امانت داری کا وہ بلند معیار پیش کیا کہ خون کے پیاسے بھی صادق اور امین کہنے پر مجبور ہو گئے۔ لوگوں کو وعدہ پورا کرنے کی تلقین کی، تو خود اس پر یوں کاربند ہوئے کہ دشمن بھی عش عش کر اٹھے۔ آپ کو معلوم ہے جب قیصرِ روم نے ابوسفیان کو اپنے دربار میں طلب کیا، تاکہ حضور ﷺ کے اخلاق و کردار کے بارے میں دریافت کرے، ابوسفیان اس وقت اسلام اور رسولِ اسلام کا بدترین دشمن تھا، لیکن اس کو بھی مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ آپ کے اخلاق بڑے بلند ہیں۔ وہ قول کے پکے اور بات کے سچے ہیں۔

عرب کے بدو اور اجڈ لوگ حضور ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کو دیکھ کر حضور ﷺ کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر کا وقت آتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی بنیادیں کھود رہے ہیں۔ پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حبیب بھی ان کے

1۔ بخاری شریف، ج 2 ص 888، وزارت تعلیم

ساتھ کام میں برابر کا شریک ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب عرب کے سارے مشرک قبائل نے مدینہ طیبہ پر دھاوا بول دیا۔ اسلام کے اس مرکز کے دفاع کے لیے خندق کھودنے کا منصوبہ طے ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح حضور ﷺ ہاتھ میں کدال لیے خود بھی خندق کھودنے میں مصروف ہیں۔ گیسوئے عنبریں پر مٹی گر رہی ہے۔ روئے زیبا پر گرد پڑ رہی ہے۔ اس روح پرور منظر کو دیکھ کر مجاہدین اسلام پر کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے خودی کے عالم میں یہ شعر پڑھتے ہیں۔

نَحنُ　الَّذِینَ　بَایَعُوا　مُحَمَّدًا

عَلَی　الجِهَادِ　مَابَقِینَا　اَبَدًا (1)

"ہم وہ جاں فروش ہیں جنہوں نے محمد مصطفیٰ ﷺ کے دست مبارک پر تادمِ واپسیں جہاد کرنے کی بیعت کی ہے"۔

سرورِ عالم ہادیٔ برحق ان کے جوشِ ایمانی کو دیکھ کر جواباً فرماتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ　اِنَّ　العَیشَ　عَیشُ　الاٰخِرَة

فَاغفِرِ　الاَنصَارَ　وَالمُهَاجِرَة (2)

"اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ الٰہی! میرے انصار اور مہاجروں کو بخش دے"۔

لشکر اسلام میدانِ بدر کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ تین تین سپاہیوں کے لیے ایک ایک سواری کا انتظام ہو سکا ہے۔ حضور سرورِ عالم ﷺ نے بھی اپنی سواری میں سیدنا علی اور مرثد بن ابی مرثد کو شریک کر لیا ہے۔ مدینہ طیبہ سے جب قدسیوں کا یہ لشکر نکلتا ہے تو حضور ﷺ اونٹنی پر سوار ہیں۔ مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد حضور ﷺ اتر جاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک سوار ہو جائے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ ان کی باری بھی حضور ﷺ ہی سوار رہیں۔ اس سے انہیں روحانی مسرت ہوگی۔

1۔ بخاری شریف ج1 ص 397، مطبوعہ وزارتِ تعلیم اسلام آباد　2۔ ایضاً

Marfat.com

حضور ﷺ جانتے ہیں کہ یہ پیش کش صدقِ دل سے کی جا رہی ہے، لیکن حضور ﷺ کو اچھی طرح علم ہے کہ حضور ﷺ کا مقام، اقدارِ عالیہ کے معلم اور استاد کا ہے۔ حضور ان کی مخلصانہ پیش کش کو قبول نہیں فرماتے بلکہ انہیں یوں جواب دیتے ہیں:

مَا اَنْتُمَا بِاَقْوٰی مِنِّیْ وَ لَا اَنَا اَغْنٰی مِنْکُمَا مِنَ الْاَجْرِ ۔ (1)

''کہ نہ تم مجھ سے زیادہ طاقت ور ہو اور نہ یہ بات ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ اجر و ثواب کی ضرورت ہے''۔

چرخِ پیر نے بھی یہ منظر کاہے کو دیکھا ہوگا کہ لشکر کا سپہ سالار، امت کا سردار، اور مجاہدین کا محبوب قائد، ناقہ کی نکیل ہاتھ میں لیے پیدل چل رہا ہے اور ایک سپاہی اونٹنی پر سوار ہے۔ یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے جس نے عرب جیسی وحشی، درندہ صفت اور درشت قوم کو کاروانِ انسانیت کا امام بنا دیا۔ اس معلم اخلاق کی تربیت لے کر وہ قوم تیار ہوئی جس کے بارے میں خالق دو جہاں نے فرمایا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰)

آج بھی اگر اس دلفریب، روح پرور اور جاں نواز اسوۂ حسنہ کو ہم سچے دل سے اپنا لیں تو ہم اپنی تقدیر کو بدل سکتے ہیں۔ آج یہ مبارک دن جب کہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کی طرف ایک مثبت اور عملی قدم اٹھانے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ کاش! ہم اپنے کردار کو خلق محمدی ﷺ کے سانچے میں ڈھال لیں۔ صرف اس طرح ہم نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی عظمت کو قانونِ اسلام کی برکتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور مادیت گزیدہ انسانیت کو وہ تریاق پیش کر سکتے ہیں، جس کی اسے اشد ضرورت ہے اور جس کے ہم امین ہیں۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَحْمَةٍ لِّلْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

1۔ مجمع الزوائد، جلد 6، صفحہ 88، دار الفکر بیروت

Marfat.com

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کا

نظامِ اخلاق

حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ ایم اے (الازہر)

نے 4 / مارچ 1980ء کو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل راولپنڈی میں شام ہمدرد

کی ایک تقریب میں یہ مقالہ پڑھا۔ اس تقریب میں ملک

کے نامور اہل قلم، دانشور اور قانون دان

حضرات موجود تھے

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کائنات کی وسعتیں بیکراں ہیں۔ سائنس دانوں کی دور رس نگاہوں نے بے شمار نئے نظام ہائے شمسی کا سراغ لگالیا ہے۔ یہ وسعتیں اور ان میں تنوع، اپنے خواص، اثراتِ رنگ و بو اور کیف وکم کے اعتبار سے ہوش ربا ہیں۔ کہیں ثریا کی بلندیاں ہیں، کہیں ثریٰ کی پستیاں، کہیں عرش کی عظمتیں ہیں اور کہیں فرش کی خاکساریاں، کہیں نور کی جلوہ سامانیاں ہیں اور کہیں خاک کی تیرگیاں۔ زندگی کے ان گنت جلوے ہیں۔ ہر جلوہ نظر افروز ہے اور دلربا بھی، لیکن آدم خاکی کی شان نرالی ہے۔ یہ خالق کائنات کے کمال تخلیق کا شاہکار ہے۔ یہ اس عالم میں اس کا خلیفہ ہے۔ اس کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال اور فضل وکمال کی پردہ کشائی ان کلمات سے کی گئی ہے:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۝ (التین)

اس میں مضمر صلاحیتوں اور خفتہ قوتوں کے گنجہائے گراں مایہ کو یہ فرما کر آشکار کیا گیا ہے:

الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۝ (انفطار)

"اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے (اے انسان!) تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر ذہنی اور جسمانی استعدادوں سے تجھے سنوارا"۔

انسان دیکھنے میں تو مختصر ہے۔ ہاتھی کی طرح گرانڈیل بھی نہیں، شیر کی طرح طاقتور بھی نہیں، ہرن کی طرح تیز رفتار بھی نہیں، لیکن ہر چیز اس سے ہراساں ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اس کے قدم عزم کے سامنے سرنگوں ہیں۔ صحراؤں کی پہنائیاں اس کے حکم سے سکڑ جاتی ہیں۔ اس کے اشارے سے سمندروں کے سینے شق ہیں۔ کرۂ ہوا میں ابھرنے والی البیلی لہریں اس کے فرامین کو زمین کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پہنچانے میں مصروف ہیں۔

Marfat.com

اس کے خالق نے اس کی تخلیق کا ذکر بھی بالکل نرالے انداز میں کیا ہے۔ ارض وسماء، مہر و ماہ، جن و ملک، شجر وحجر کی تخلیق کے بارے میں فرمایا: اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (یٰسین: ۸۲) لیکن حضرت انسان کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا: لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ (ص: ۷۵) میں نے اسے اپنی قدرت کے دو ہاتھوں سے پیدا کیا۔ بلاشبہ اس کی پیدائش کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ اس کے راہوارِ عزم و حوصلہ کی جولانیوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ یہ خام صلاحیتیں، عروسِ گیتی کی زلفیں سنوارنے کے کام بھی آسکتی ہیں اور اس کی قبائے شرف وکرامت کو تار تار بھی کرسکتی ہیں۔ یہ نسیم بہار بن کر خیر و خوبی کے غنچوں کو پھول بھی بنا سکتی ہیں، یہ بادِ صرصر بن کر نیکی اور صلاح کے روشن چراغوں کو گل بھی کر سکتی ہیں جب تک ان کی صحیح نشو ونما نہیں ہوگی، ان کو صحیح خطوط پر چلانے کا اہتمام نہیں کیا جائے گا، تو احسن تقویم کی بلندیوں پر دمکنے والا یہ مہ پارہ، اسفل السافلین کی پستیوں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گا۔ اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا رخ حق اور خیر کی طرف موڑ دینا، اس کے دل میں برائی سے نفرت اور نیکی سے محبت پیدا کردینا، بڑا نازک مرحلہ ہے اور نہایت مشکل کام ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے، اسی خطرناک موڑ سے کاروانِ انسانیت کو بسلامت گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کو مبعوث کرتا رہا۔ اسی مقصد جلیل کی تکمیل کے لیے سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کی تشریف آوری ہوئی۔

میں اس بحث میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ دانش برہانی نے شبستانِ وجود کی ظلمتوں کو مٹانے کے لیے جو چراغ روشن کیے، انہوں نے جادۂ زیست کے مسافروں کے لیے آسانیاں پیدا کیں یا ان کی ذہنی پریشانیوں میں اضافہ کیا۔ مجھے تو اس صحبت میں دانائے سبل، ہادیٔ برحق، مرشد قلب ونظر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ان کامیاب کوششوں کا ذکر کرنا ہے، جن کے باعث گلشن حکمت و دانش میں بہار آئی، جن کی برکت سے انسان کا خفتہ بخت بیدار ہوا، جن کی مسیحائی نے عمل وخلق کو نئے عنوان عطا کیے، جن کی تربیت سے فقیروں کو قناعت واستغناء اور امیروں کو ذوقِ جود وعطا ملا۔ درویشوں کو خودداری اور شاہوں

کو تواضع وانکساری نصیب ہوئی، جس نے علم کے رخ سے شک اور ظن کے گرد کو صاف کیا۔ اسے نورِ یقین سے نکھارا اور عمل صالح سے ہمکنار کر دیا۔ جن کے قدمِ ناز کی ٹھوکر سے خود غرضی، نفس پرستی، قومی عصبیت اور وطن پرستی کے سارے بت، جن کے سامنے صدیوں سے انسان سجدہ ریز چلا آرہا تھا، پاش پاش ہو گئے۔

نظامِ اخلاق کے بے شمار پہلو ہیں۔ سب کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں۔ میں آج کی اس محفل میں صرف اس کے تین پہلوؤں کا بالاختصار ذکر کروں گا۔

۱۔ جس انسان کی تربیت کے لیے نظامِ اخلاق وضع کیا گیا ہے، اس کی فطرت کے بارے میں محسن انسانیت کی کیا رائے ہے؟

۲۔ نظامِ اخلاق کا مقصدِ اعلیٰ کیا ہے؟

۳۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو نظامِ اخلاق پیش کیا، اخلاق کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اس کی امتیازی شان کیا ہے؟

عیسائیت، جس کے ماننے والوں کی تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ ہے، اس کا انسانی فطرت کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ انسان کا جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق آدم وحوا نے جو گناہ کیا تھا اس کے داغ سے ہر انسان کی پیشانی داغدار ہے۔ وہ اپنی پشت پر ناکردہ گناہوں کا یہ بوجھ اٹھائے ہوئے اس عالم رنگ و بو میں قدم رکھتا ہے۔ جب تک یسوع مسیح کے نام پر اسے بپتسمہ نہ دیا جائے اس وقت تک وہ اس گناہ سے بریٔ الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انہیں اس مسئلہ میں اس قدر غلو ہے کہ وہ معصوم بچہ، جو عیسائی ماں باپ کے گھر پیدا ہوتا ہے وہ بھی پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر وہ بپتسمہ لینے سے پہلے مر جائے تو وہ بھی آسمانی بادشاہی کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا بلکہ دوزخ میں پھینک دیا جاتا ہے۔

عیسائیت کے علاوہ جو مذاہب تناسخ اور آواگون کے قائل ہیں وہ بھی انسان کو اپنی سابقہ زندگی کے اعمال کا صید زبوں خیال کرتے ہیں۔ یعنی جو انسان آج پیدا ہو رہا ہے،

Marfat.com

اس کی سعادت و شقاوت کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے عمل اور سعی کو اپنی قسمت کے سنوارنے میں کوئی دخل نہیں۔

ان معتقدات کی رو سے انسان کی بے بسی اور آشفتہ بختی کا آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب کوئی انسان اپنی اس خستہ حالی پر آگاہ ہوتا ہوگا تو بے ساختہ چیخ اٹھتا ہوگا۔

یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا ۝ (النباء) ''اے کاش! میں انسان نہ ہوتا، مٹی کا تودہ ہوتا''۔

لیکن رحمت عالمیاں ﷺ جو کتابِ مقدس لے کر آئے، اس نے انسان کو مقہور و مجبور اور ناکردہ گناہوں کے طوق و سلاسل میں اسیر نہیں بتایا بلکہ مختلف عنوانوں سے اس کی فطرت کی پاکی اور اس کی جبلت کی جلالت شان کا ذکر فرمایا ہے۔ عقیدۂ توحید کو اس کی فطرت کی آواز اور تقاضا قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا‌ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا‌ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ‌ؕ ذٰ لِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ (الروم)

''پس آپ کر لیں اپنا رخ دین اسلام کی طرف پوری یکسوئی سے، (مضبوطی سے پکڑ لیں) اللہ تعالیٰ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا۔ کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ روزِ اول اللہ تعالیٰ نے ارواحِ انسانی سے پوچھا:

اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ (اعراف: ۱۷۲) (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟) سب نے بیک زبان جواب دیا۔ قَالُوۡا بَلٰى (بے شک تو ہمارا پروردگار ہے) یوں اس غلط فہمی کی بیخ کنی کر دی کہ انسان فطرۃً ناپاک اور گمراہ ہے۔

قرآن کریم نے انسان کی عظمت اور اس کی فطرت کی ارجمندی کو ایک نئے عنوان سے بھی آشکارا کیا ہے۔ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نہاں خانۂ دل میں ایک ایسی قوت رکھ دی ہے جو اسے نیکی پر ابھارتی ہے اور برائی سے روکتی ہے۔ اگر یہ نہیں رکتا تو وہ قوت سراپا احتجاج بن کر سینہ تان کر اس کی راہ میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ اسے روند کر ہی گناہ کی

وادی کی طرف پیش قدمی کرسکتا ہے۔ اس قوت کو قرآن کریم نے نفس لوامہ سے تعبیر کیا ہے اور اس کی عظمت کی قسم کھائی ہے۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؁ (القیامہ)

سرورِ عالم مرشد قلب ونظر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حقیقت کو بڑے پیارے انداز سے بیان فرمایا ہے۔ حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ بارگاہِ نبوت میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بے پناہ ہجوم ہے۔ وہ ذوق وشوق میں اس ہجوم کو چیرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لوگوں نے انہیں بارہا روکا ہے لیکن وہ نہیں رکتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے شوق فراواں کو دیکھا تو فرمایا: وابصہ! قریب آجاؤ۔ جب وہ نزدیک جا کر بیٹھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے وابصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم خود بتا دو گے؟ انہوں نے عرض کی: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ارشاد فرمائیں۔ فرمایا: وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے آئے ہو۔ حضرت وابصہ نے عرض کی: سچ ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وابصہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تین انگلیاں اکٹھی کر کے میرے سینے میں چوکیں اور فرمایا:

يَا وَابِصَةُ اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ. اَلْبِرُّ مَا اطْمَئَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ وَاطْمَأَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ. وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي الْقَلْبِ وَ تَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ۔(1)

"اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اور اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر۔ نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں اطمینان پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور نفس کو تردد میں ڈال دے اگرچہ لوگ تجھے اس کے جواز کا بھی فتویٰ دیں"۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور ارشاد گرامی بھی اس سلسلہ میں بڑا بصیرت افروز ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَخْطَاءَ خَطِيْئَةً نُكِتَتْ فِيْ قَلْبِهٖ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ وَاِذَا نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَ تَابَ، صُقِلَ قَلْبُهٗ. وَ اِنْ عَادَ زِيْدَ فِيْهَا حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهٗ۔ (2)

1۔ مسند امام احمد، جلد 4 صفحہ 228، مطبوعہ مصر
2۔ سنن ترمذی، ج 5، ص 404، دار الکتب العلمیہ بیروت

Marfat.com

''بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر اس نے پھر اپنے آپ کو اس گناہ سے علیحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ سیاہ داغ بڑھنے لگتا ہے، یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے''۔

ان ارشادات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام کے نزدیک انسان فطرۃً بدکار اور ناہنجار نہیں، بلکہ وہ صاف دل، پاک نفس پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اپنے برے اعمال ہی اس کے آئینۂ دل کو مکدر کر دیتے ہیں اور نیکی کی قوتوں کا گلا گھونٹ کر انہیں خاموش کر دیتے ہیں۔ انسان جو فطرۃً نیک ہے، جس میں ایسی قوت پنہاں ہے جو برائی کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہونے کی ہمت رکھتی ہے۔ ایسے انسان کے لیے جو نظامِ اخلاق ہو گا وہ کتنا بلند ہو گا اور انسان کو پیدائشی گنہگار سمجھنے والوں کے ضابطۂ اخلاق سے کس قدر مختلف ہو گا۔

نظامِ اخلاق کا مقصد اعلیٰ

ہر فعل کسی مقصد کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے۔ ہر قدم کسی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے نظام اخلاق پر کاربند ہونے کا ضرور کوئی مقصد ہونا چاہیے۔ وہ مقصد کیا ہے؟

حکماء اور فلاسفہ عہد قدیم سے اب تک اس گرہ کو کھولنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ بیسیوں نظریئے پیش کیے گئے ہیں، بزمِ فلسفہ وحکمت میں بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں، لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی۔ آراء کے اس اختلاف اور حکماء کی باہمی کشاکش کو دیکھ کر انسان چکرا جاتا ہے۔ کسی نے سعادت کو، کسی نے مسرت کو، کسی نے قوت اور غلبہ کو ضابطۂ اخلاق کا حاصل قرار دیا ہے۔ یہ تمام الفاظ حد درجہ مبہم ہیں۔ ہر شخص حسب منشا ان کی تشریح کر کے اپنا مطلب نکال سکتا ہے۔ اس پر ستم یہ ہے کہ ان نظریات میں باہمی تضاد ہے جس کے باعث یقین کی شمع ٹمٹمانے لگتی ہے۔ شکوک وشبہات کا دھواں پھیلنے لگتا ہے۔

اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ قرآن نے اس کو زمین پر اپنے

خالق کا خلیفہ بتایا ہے۔ فرشتوں نے اس کی عظمتوں کو سجدے کیے ہیں۔ اس لیے اس کے ضابطۂ اخلاق کا مقصد کوئی گھٹیا چیز نہیں ہو سکتی۔ اس کا مقصد اس کے شایانِ شان ہونا چاہیے۔ ذاتی اغراض، شخصی مفادات، لذت و سرور ادنی ترین مقاصد ہیں۔ اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ انسان کا دامن ان سے آلودہ ہو۔ چنانچہ اس آیت طیبہ سے حضور رحمت عالم ﷺ نے اس مقصد عظیم کا اعلان فرمایا جو مسجود ملائک کو زیب دیتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۶۲ (الانعام)

"اے حبیب ﷺ! آپ اعلان کر دیجیے کہ میری نماز، میری عبادتیں، میری زندگی اور میری موت، صرف اس اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہے جو رب العالمین ہے"۔

یہ ہے وہ مقصد جلیل، جس کا اعلان ہادیٔ برحق نے فرمایا، جو انسان کے مقامِ رفیع سے مناسبت رکھتا ہے، بلکہ اس مقصد کی رعنائیاں اور دلفریبیاں خاک کے پراگندہ ذروں کو ہمدوش ثریا بنا دیتی ہیں۔

نبی رحمت ﷺ نے اس امر کی وضاحت کی طرف توجہ نہیں دی کہ انسان کے اخلاق کا مقصد کیا ہے۔ بلکہ اپنی ساری کوششیں اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے وقف فرمائیں کہ انسان کا مقصد حیات کیا ہونا چاہیے اور اس نقطہ پر زور دیا ہے کہ رضائے الٰہی کے بغیر کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کا مقصد حیات بن سکے۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ان اہل ایمان کی توصیف کی گئی ہے جو اپنی جان اور اپنا مال رضائے الٰہی کے لیے قربان کر دیا کرتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷

"بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی رضا کے لیے بیچ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے"۔ (البقرہ)

سورۃ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝۱۱۴ (النساء)

"اور جو یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے"۔

انسان کے فطرۃً گنہگار یا معصوم ہونے کے بارے میں عیسائیت، دیگر مذاہب اور اسلام کے نظریات آپ سن چکے۔ نظامِ اخلاق کی غرض وغایت، جس کو اپنانے کی ترغیب نبی کریم ﷺ نے دی، اس کا تذکرہ بھی ہو چکا۔ اب ان خصوصیات کی طرف اشارہ مطلوب ہے، جو رسولِ کریم ﷺ کے پیش کردہ ضابطۂ اخلاق کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ خصوصیات ان گنت ہیں۔ میں یہاں چند ایک کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

(الف) کوئی چیز خواہ کتنی منفعت بخش اور حسین وجمیل ہو اس میں جب افراط وتفریط راہ پالیتی ہے تو اس کی منفعت مضرت میں بدل جاتی ہے۔ اس کا حسن وجمال پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام کا ہر کام اعتدال اور میانہ روی کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس کے دین الٰہی ہونے کی یہ ایک روشن دلیل ہے۔ عبادات، معاملات، قوانین اور اخلاق، الغرض اس کے جملہ اوامر ونواہی میں اعتدال کا نور جھلک رہا ہوتا ہے۔ شریعت موسوی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر قدم پر شدت اور سختی کا احساس ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رحمت ورافت کی یہاں ذرا گنجائش نہیں۔ تورات کا ہر قانون عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ کتاب الخروج باب ۲۱ کی آیات ۲۳ تا ۲۵ ملاحظہ ہوں۔

"...... لیکن اگر نقصان ہو جائے تو تو جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ"۔

قاتل کو ہر حالت میں قتل کرنا ضروری ہے۔ مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کر کے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتا۔ چنانچہ گنتی باب ۳۵ کی آیت ۳۱ ملاحظہ ہو۔

"...... اور تم اس قاتل سے جو واجب القتل ہو، دیت نہ لینا، بلکہ وہ ضرور ہی مارا جائے"۔

اس کے برعکس ہم شریعت عیسوی پر جب نظر ڈالتے ہیں تو وہاں عدل وانصاف قائم کرنے کا جذبہ بہت کمزور نظر آتا ہے۔ وہاں صرف رحمت اور عفو ودرگزر پر زور دیا گیا ہے۔

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک مشہور وعظ میں اپنی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں کیا ہے:

''تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، لیکن میں تم سے کہتا ہوں برائی کا برائی سے مقابلہ نہ کرو بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑے اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تمہیں ایک میل تک بیگار میں پکڑ کر لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو۔ جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو''۔ (متی: باب ۵)

لیکن داعیٔ دین فطرت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے عدل واحسان دونوں میں حسین توازن پیدا کیا۔ اس طرح یہودیت اور عیسائیت میں جو خامیاں تھیں ان کا ازالہ فرما دیا۔ حضور ﷺ نے اپنے ربِ کریم کا یہ فرمان اولادِ آدم کو سنایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل: ۹۰)

''یقیناً اللہ تعالیٰ عدل اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے''۔

بے شک معاشرہ میں امن وامان کے قیام اور فتنہ وفساد کا قلع قمع کرنے کے لیے قانون کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس سے بدکار انسان کو عبرت ناک سزا تو دی جا سکتی ہے لیکن اس کے قلب میں برائی سے نفرت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اخلاق سے ان لوگوں کی اصلاح تو ممکن ہے جو نیک فطرت اور سلیم الطبع ہوں، لیکن معاشرے کے سارے افراد تو ایسے نہیں ہوتے جو اخلاقِ حسنہ کی تعلیمات کو شرح صدر سے قبول کر لیں۔ بدسرشت اور اکھڑ مزاج افراد کی بھی کمی نہیں۔ اس لیے معاشرہ کی تطہیر، اصلاح اور صحت مند نشوونما کے لیے قانون اور اخلاق دونوں کی اشد ضرورت ہے اور ان میں یہ حسین امتزاج صرف حضور نبی اکرم ﷺ کے پیش کردہ ضابطۂ اخلاق میں نظر آتا ہے۔

(ب) اسلامی تعلیمات کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی بدکرداری اور گناہ کے عبرت ناک انجام سے بے خوف نہیں ہونے دیتا اور نہ اس کو مایوسی کے عمیق

Marfat.com

گڑھے میں گرنے دیتا ہے۔ بیم ورجا کی کیفیت ہر قدم پر ملحوظ رکھی جاتی ہے تاکہ انسان اپنے اعمالِ بد کے نتائج سے خوفزدہ بھی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ رحمت الٰہی سے مایوس بھی نہ ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے:

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ　(الزمر: ۵۳)

''اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو''۔

بلکہ مایوسی کو گناہ قرار دیا اور اسے کفار ومنکرین کا شیوہ کہا گیا ہے:

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

''یعنی رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف کفار ہی مایوس ہوتے ہیں''۔ (یوسف)

اگر تم نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ نافرمانی اور سرکشی میں ضائع کر دیا ہے، اب بھی اگر تم اپنے کیے پر ندامت محسوس کرتے ہو تو توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ، رحمت الٰہی کو تم اپنا منتظر پاؤ گے۔

(ج) معاشرہ میں نیکی کو فروغ دینا اور برائی کا قلع قمع کرنا صرف ایک فرد یا چند اشخاص کی ذمہ داری نہیں، بلکہ ساری قوم کا اجتماعی فریضہ ہے۔ امت مسلمہ کو خیر الامم کے لقب سے سرفراز کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے:

تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ　(آل عمران: ۱۱۰)

''کہ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو''۔

اگر ملت کے چند افراد اس فرض کو ادا کریں اور دوسرے لوگ اس سے بے تعلقی اور بے حسی کا مظاہرہ کریں تو ایسا معاشرہ کیونکر معرضِ وجود میں آئے گا، جس کا ظاہر و باطن، جلوت وخلوت، نیکی کے نور سے منور ہو۔ جس میں برائی اور گناہ کے خلاف ایک عمومی نفرت اور بیزاری کا جذبہ پایا جائے، کیونکہ ملت اسلامیہ کے تمام افراد کا مفاد اور مضرت مشترک ہے۔ اس لیے یہ ذمہ داری بھی تمام پر یکساں عائد ہوتی ہے۔ حضور سرورِ عالم ﷺ نے اس

Marfat.com

حقیقت کو بڑی دل افروز اور دلنشیں مثال سے واضح فرمایا ہے کہ ایک جہاز میں اوپر تلے تین درجے ہیں۔ ہر درجہ میں کچھ مسافر فروکش ہیں۔ سب سے نچلے درجے والے، جہاز کے پیندے میں سوراخ کر کے پانی لینا چاہتے ہیں۔ اگر بالائی منزلوں کے مکین سوراخ کرنے سے ان کو روک دیں تو وہ خود بھی بچ جائیں گے اور انہیں بھی بچالیں گے اور اگر اوپر والے لا تعلقی کا مظاہرہ کریں گے تو جب سوراخ ہو جائے گا اور جہاز میں پانی بھر جائے گا تو جہاز اپنے تمام مسافروں سمیت غرق ہو جائے گا۔

بعینہٖ اسی طرح جو لوگ معاشرہ میں بدکاری اور فحاشی پھیلانے میں مصروف ہیں، اگر قوم کے باشعور افراد نے ان کو سختی سے روک دیا تو ان کی لگائی ہوئی آگ سے ساری ملت محفوظ ہو جائے گی، لیکن اگر ان لوگوں کو فسق و فجور کی آگ بھڑکانے کی اجازت دے دی گئی، تو صرف وہی اپنی جلائی ہوئی اس آگ میں بھسم نہیں ہوں گے، بلکہ ملت کے سارے ایوان کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے۔ اسی لیے اسلام میں معاشرہ سے کٹ کر گوشۂ عزلت میں زندگی بسر کرنے اور کشمکش حیات سے فرار اختیار کر کے رہبانیت کو اپنانے سے روکا گیا ہے۔

اسلام کے نظامِ اخلاق کی بے شمار خصوصیات میں سے یہ چند اہم خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتی ہیں۔

اسلامی نظامِ اخلاق

قرآنِ کریم اور سنت نبوی ﷺ کے ذخائر اسلامی نظامِ اخلاق کی تفصیلات سے پر ہیں۔ میں یہاں صاحب خلق عظیم محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس کی جامعیت نظامِ اخلاق کی جملہ جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

اَوْصَانِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ اَنَا اُوْصِیْکُمْ بِهَا۔ اَوْصَانِیْ بِالْاِخْلَاصِ فِی السِّرِّ وَ الْعَلَانِیَةِ۔ وَالْعَدْلِ فِی الرِّضَا وَالْغَضَبِ۔ وَالْقَصْدِ فِی الْغِنٰی وَالْفَقْرِ۔ وَ اَنْ اَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ وَ اُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ وَ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ وَ اَنْ یَّكُوْنَ صَمْتِیْ

Marfat.com

فِكْرًا وَ نُطْقِىْ ذِكْرًا وَ نَظَرِىْ عِبْرَةً۔ (1)

میرے رب نے مجھے نو باتوں کی وصیت کی ہے۔ میں تمہیں بھی ان باتوں کی وصیت کرتا ہوں۔ مجھے وصیت فرمائی گئی ہے کہ میں خلوت وجلوت میں اخلاص کا مظاہرہ کروں۔ خوشنودی اور غصہ دونوں حالتوں میں عدل کروں۔ ثروت اور افلاس دونوں صورتوں میں میانہ روی اختیار کروں اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔ جو مجھے محروم رکھے، اس کو عطا کروں۔ جو میرے ساتھ قطع رحمی کرے میں اس سے صلہ رحمی کروں۔ میری خاموشی غور وفکر ہو۔ میری گفتگو ذکر الٰہی ہو اور میری نگاہ عبرت آموز ہو۔

نبی کریم ﷺ صاحب خلق عظیم

اب آیئے اس مقدس ہستی کی کتابِ حیات کا مطالعہ کریں، جس کے روح پرور ارشادات اور انقلاب آفریں تعلیمات نے خود فراموش انسان کو خود روشناس بنایا اور اس کے دل میں اپنی منزلِ رفیع پر پہنچنے کی بے چین تمنا پیدا کر دی۔ ذرا دیکھیں! اس کے اپنے شب و روز کیسے بسر ہوتے تھے، اس کا اپنا اخلاقی معیار کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ خلق صرف رحمت ورافت، عفو ودرگزر اور تواضع وانکساری کا نام نہیں۔ اخلاق کا یہ نہایت محدود تصور ہے۔ انتہائی اشتعال انگیز ماحول میں جذبات کو قابو میں رکھنا، ناگفتہ بہ حالات میں ثبات و استقامت کا مظاہرہ کرنا، باطل کی طاغوتی قوتوں کے سامنے سر بلند کر کے سینہ سپر ہونا، اپنے مقصد حیات سے لازوال وابستگی اور وفا کیشی، میدان جنگ میں نا موافق حالات میں بھی جرأت و بسالت کا اظہار کرنا اخلاقِ حسنہ کے اہم ترین پہلو ہیں۔

حضور سرور عالم ﷺ کی کتابِ حیات کا ہر ورق جملہ مکارمِ اخلاق سے روشن وتابندہ ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دعوتِ حق کا آغاز کیا تو حضور ﷺ کی للکار کی ہیبت سے باطل کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ انہوں نے شمع حق کے پروانوں پر جور وستم کی

1۔ العقد الفرید، ج2، ص417، لجنۃ التالیف القاہرہ

انتہا کردی، لیکن ان کا جذبۂ ایمان کم نہ ہوا۔ روز بروز غلامانِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء میں اضافہ ہونے لگا۔

ایک روز اہل مکہ کا ایک وفد جناب ابو طالب کے پاس گیا اور انہیں ساری قوم کا یہ پیغام سنایا کہ آپ کے بھتیجے نے ہماری ناک میں دم کر دیا ہے۔ وہ صبح وشام ہمارے بتوں کی توہین وتضحیک کرتا رہتا ہے۔ آپ قوم کے بزرگ ہیں۔ ہمیں آپ کا احترام ملحوظ ہے۔ اسی لیے آج تک ہم نے آپ کے بھتیجے کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ آپ اپنے بھتیجے سے پوچھیے کہ فتنہ انگیزی سے وہ کیا مطلب حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اگر اسے دولت کی خواہش ہے تو ہم اس کے قدموں پر زر وسیم کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ اگر اسے کوئی رشتہ مطلوب ہے تو ہم اس کی دامادی کو اپنے لیے باعث شرف سمجھیں گے اور اگر اسے حکمران بننے کا شوق ہے تو ہم اسے بصد مسرت اپنا سربراہ ماننے کو تیار ہیں، لیکن اگر وہ پھر بھی باز نہ آیا تو ہم آپ کا مزید احترام برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ جناب ابو طالب نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں گے۔

نبی کریم ﷺ جب اپنے محترم چچا کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کیا، پھر کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مجھ میں اب اتنی سکت نہیں کہ تنہا ساری قوم کا مقابلہ کرسکوں۔ اس لیے آپ ان کے معبودوں کے خلاف کچھ کہنا چھوڑ دیں۔ حضور کی ذات جو سراپا رافت ورحمت تھی، اس وقت اس کا ایک انوکھا پہلو آشکارا ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: عم محترم! اگر اہل مکہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں توحید کی تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ دعوت کامیاب ہو جائے یا میری زندگی کے دن پورے ہو جائیں۔

سبحان اللہ! کیا جلال ہے اس جمال میں! اور کیا تمکنت ہے پیکر حلم وتواضع کے اس جواب میں۔ ہر مخلص داعی کو اپنی دعوت سے حد درجہ پیار اور محبت ہوتی ہے۔ یہی جذبہ رکاوٹوں کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرتا ہے، کامیابی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی

حضور کی شان نرالی تھی۔ ایک روز محبوب رب العالمین ﷺ مصروف عبادت تھے۔ بدبخت ابو جہل حضور ﷺ کو یوں مصروفِ عبادت دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور حضور ﷺ پر حملہ کر دیا اور شدید زدوکوب کیا۔ حضور ﷺ کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ ابھی تک مشرف باسلام نہ ہوئے تھے۔ اس روز سارا دن جنگل میں شکار کھیلتے رہے۔ شام کو واپس آئے۔ ہرن مار کر ساتھ لائے۔ اپنی لونڈی کے سامنے اپنی نشانہ بازی اور بہادری کی تعریف کرنے لگے۔ لونڈی نے کہا: حیف ہے تمہاری اس جرأت پر، تمہارے بھتیجے کو تو ابو جہل نے مار مار کر لہولہان کر دیا ہے اور تم دن بھر ہرنوں کا شکار کرتے رہتے ہو۔ یہ سن کر خون جوش میں آیا۔ اپنی کمان لے کر ابو جہل کی تلاش میں گئے۔ اسے ڈھونڈا اور اسے خوب مارا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ میں نے آپ کا بدلہ ابو جہل سے لے لیا ہے۔ اب تو آپ خوش ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں ان باتوں سے خوش نہیں ہوا کرتا''۔ یہ غیر متوقع جواب سن کر حمزہ پر حیرت طاری ہو گئی، لیکن قسمت یاور تھی۔ انہوں نے دریافت کیا کہ پھر آپ کس بات سے خوش ہوتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اسلام لے آؤ تو میری خوشی کی انتہا نہ ہو گی۔ اپنی دعوت کے ساتھ حضور ﷺ کی یہ وابستگی دیکھ کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹ گئے اور حضور ﷺ کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

میدانِ جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد ہزیمت خوردہ دشمن سے انتقام نہ لینا بے شک عالی ظرفی کی انتہا ہے، لیکن ذرا احد کے میدان کی طرف دیکھیے، فتح شکست میں تبدیل ہو چکی ہے، بہادر جاں نثاروں کے لاشے بکھرے پڑے ہیں، اپنا جسم زخموں سے چور ہے، پھر بھی اولوالعزمی کا یہ عالم ہے کہ اپنے زخمی ساتھیوں کو ساتھ لے کر مکہ کے فتحیاب لشکر پر یلغار فرماتے ہیں اور اس کے تعاقب میں حمراء الاسد تک بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مکارمِ اخلاق کا یہ وہ پہلو ہے، جس میں حضور ﷺ کی ہمسری کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔

قیصر روم نے اسلام کی روز افزوں قوت کو اپنے مستقبل کے لیے خطرہ خیال کیا اور اس

Marfat.com

نے مدینہ طیبہ پر چڑھائی کے لیے ایک لاکھ کے قریب لشکر تیار کیا تا کہ اس کی نئی قوت کو ابتدائی مرحلہ میں ہی نیست و نابود کر دیا جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب اس کے ارادے کی اطلاع ملی تو حضور ﷺ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا کہ مملکت اسلامیہ کا کوئی گوشہ میدانِ جنگ بنے، بلکہ مجاہدین اسلام کو ہمراہ لے کر پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن کے علاقہ میں تبوک کے مقام تک پہنچ گئے اور وہاں اپنے خیمے نصب کر دیے۔ قیصر پر ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ حضور نبی رحمت ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرما رہنے کے بعد حضور مظفر و منصور مرکز اسلام، مدینہ طیبہ میں مراجعت فرما ہوئے۔

خلق عظیم کے اس پیکر جمیل کی رعنائیاں آج بھی قلب و نظر کو شکار کر رہی ہیں اور افسردہ جذبات کو نئی توانائیاں بخش رہی ہیں اور مردہ دلوں کو نئی زندگی عطا کر رہی ہیں۔ اسی کی برکت ہے کہ امت کے ہر طبقہ میں ہمیں اخلاق کی ایسی بلندیاں نظر آتی ہیں، جن کی مثال چشم فلک پیر کو اور کہیں نظر نہیں آتی۔

اگرچہ شام، فلسطین، لبنان، اردن وغیرہ علاقوں کو قیصر روم کے تسلط سے عہد فاروقی میں آزاد کرا لیا گیا تھا، لیکن رومی سلطنت کی سرحدیں مملکت اسلامیہ کی سرحد کے ساتھ دور دور تک چلی گئی تھیں اور رومی حکومت سے اکثر و بیشتر جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سلجوقی فرمانروا الپ ارسلان کے دور میں مائیکل ہفتم، قیصر روم کے ساتھ تعلقات از حد کشیدہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ نوبت بجنگ رسید۔ قیصر کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ تھی، جب کہ الپ ارسلان کی فوج صرف پندرہ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی۔ ارسلان نے چاہا کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن قیصر کو اپنی قوت اور لشکر کی کثرت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس نے مصالحت کی ساری کوششیں ناکام بنا دیں۔

آخر کار جنگ شروع ہوئی، گھمسان کا رن پڑا۔ ارسلان کے مجاہدین نے قیصر کے لشکر جرار کو شکست فاش دی اور قیصر کو گرفتار کر لیا۔ مائیکل ہفتم جب ایک جنگی قیدی کی حیثیت

Marfat.com

سے الپ ارسلان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو الپ ارسلان نے اس کی عزت و تکریم کی حد کردی۔ بڑے احترام سے اسے پاس بٹھایا پھر اس سے پوچھا کہ اگر تم میری جگہ ہوتے اور مجھے تمہارے سامنے جنگی قیدی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ قیصر نے کہا کہ میں دروں سے تمہاری کھال ادھیڑ دیتا۔ الپ ارسلان نے اس کا یہ گستاخانہ جواب سن کر صرف اتنا کہا کہ بے شک مسلمان اور عیسائی میں یہی فرق ہے۔ اس کے بعد بڑی عزت واحترام کے ساتھ قیمتی تحائف دے کر اسے آزاد کر دیا اور اس کا مفتوحہ علاقہ بھی اس کو واپس کر دیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سالہا سال صلیبی حملہ آوروں سے نبرد آزمار ہے، ایک دفعہ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ، جسے شیر دل کہا جاتا تھا، سے معرکۂ کارزار گرم تھا۔ سلطان نے دیکھا کہ رچرڈ کا گھوڑا مارا گیا ہے اور وہ پیدل مصروف قتال ہے۔ اسی وقت اپنے اصطبل سے ایک قیمتی اصیل گھوڑا منگوایا اور رچرڈ کی طرف بھیجا تا کہ وہ اس پر سوار ہو کر سلطان کا مقابلہ کرے۔

قوموں کے سیاسی زوال سے پہلے ان کا اخلاقی انحطاط شروع ہوتا ہے جو بالآخر انہیں ایوانِ اقتدار سے نکل جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اسی طرح قوموں کا سیاسی عروج تب شروع ہوتا ہے، جب ان کے اخلاق میں بلندی اور سیرت میں پختگی آ جاتی ہے۔ جس قوم کے سامنے نبی رحمت ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہو، وہ کیوں بادیۂ ضلالت میں بھٹکتی رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے ہادیٔ برحق نبی کریم رحمۃ للعالمین ﷺ کے اخلاق حمیدہ کو اپنا کر کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔

عزت مآب جناب حکیم حافظ محمد سعید صاحب ساری ملت کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان بدلے ہوئے حالات میں انہوں نے دعوت حق کا ایک اچھوتا انداز اختیار کیا ہے جو باوقار بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔ وہ ہر سال ایک موضوع منتخب کرتے ہیں اور ملک کے معروف دانشوروں اور علمائے کرام کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں اور یہ

Marfat.com

اجلاس ایسے مقامات پر منعقد کیے جاتے ہیں جہاں وہ لوگ بھی شرکت کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جو وعظ وارشاد کی دیگر محافل میں شرکت کرنے سے بوجوہ گریزاں رہتے ہیں۔ قوم کے اخلاقی انحطاط کو سنبھالا دینے کے لیے اس سال کے لیے انہوں نے ''آوازِ اخلاق'' کا عنوان تجویز فرمایا۔ فقیر ذاتی طور پر ان کا سپاس گزار ہے کہ انہوں نے اس باوقار محفل میں مجھے اظہارِ خیال کا موقع بخشا۔ بارگاہِ الٰہی میں صدقِ دل سے دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ محترم حکیم صاحب کی مساعی جمیلہ کو ثمر بار کرے اور انہیں مزید توفیقات سے بہرہ ور فرمائے اور انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔

آمین، ثم آمین۔ بجاہ طٰہٰ و یٰسین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

Marfat.com

اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
قرآن کریم کی روشنی میں

Marfat.com

قرآنِ حکیم میں ایسی بے شمار آیتیں ہیں جن میں علیم وخبیر خدا نے اپنی مخلوق کو اپنے اس برگزیدہ بندے اور مقبول رسول ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اور بارہا تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ جس نے اس کی فرمانبرداری سے انحراف کیا وہ اپنے پروردگار کا باغی ہے، اس کے انعامات سے محروم اور اس کے غیظ وغضب کا سزاوار ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

پہلی اور دوسری دلیل

۱۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ (آل عمران)

"(اے میرے رسول!) تم فرماؤ! اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو، تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور تمہارے گناہ بخش دے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

۲۔ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

"(اے میرے رسول!) تم فرماؤ، حکم مانو اللہ کا اور رسول کا۔ پھر اگر وہ اعتراض کریں تو اللہ کی کافروں سے محبت نہیں ہے"۔ (آل عمران)

یہ ہے قرآنِ پاک کی آیاتِ بینات کا اعجاز کہ ان کے سامنے شک اور ارتیاب کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور حقیقت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو جاتی ہے۔ ان دو آیتوں پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے؟ ارشاد ہے:

وہ لوگ جو میرے محبوب رسول ﷺ کی اتباع نہیں کرتے، اس کے نقش پا کو اپنا خضر راہ نہیں بناتے اور اس کے ارشادات کے سامنے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہتے ہوئے سر تسلیم خم نہیں کر دیتے اور پھر کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمارے دل تیری محبت سے سرشار اور سینے تیرے نورِ عشق سے معمور ہیں، وہ جھوٹے ہیں۔ ان کا تو مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر واقعی انہیں مجھ سے الفت ہے تو میرے رسول ﷺ کا اتباع کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں بھی ان سے محبت کرنے لگوں گا۔ یعنی پہلے وہ صرف محب تھے اور اس دعویٰ محبت کی صداقت پر ان

Marfat.com

کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں تھی، لیکن جب میرے رسول ﷺ کی غلامی کا شرف انہیں حاصل ہو جائے گا، تو ان کا دعویٰ محبت بھی مسلم اور انہیں خلعت محبوبیت بھی مبارک۔

محبوبیت حقیقت میں خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں پختگی اور ثبات کا نتیجہ ہے۔ اسی حقیقت کی طرف تو حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے

چوں تمام افتد، سراپا ناز می گردد نیاز
قیس را لیلیٰ ہمے نامند در صحرائے من (1)

محبت الٰہی کی وضاحت

اس آیت کریمہ میں تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ اور یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے الفاظ میں محبت کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس پر اگر مزید غور کیا جائے تو حقیقت یوں اجاگر ہوتی ہے کہ پھر کسی کو مجالِ انکار نہیں رہتی۔

محبت کیا ہے؟ بندے کی محبت اللہ تعالیٰ سے کیسی ہوتی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندے سے، کا کیا معنی ہے؟

محبت کہتے ہیں اس کشش اور میلان کو جو دل میں کسی باکمال ہستی کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔ خواہ وہ کمال، جمالِ معنوی ہو یا صوری، حسن ظاہری ہو یا حسن سیرت وشمائل اور یہ جذبہ اسے اس ہستی سے قریب تر ہونے کے لیے بے تاب رکھتا ہے۔

بندہ جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ گلستانِ حسن وخوبی کی ہر کلی اور ہر پتی پر اس ذاتِ احدیت کا جمال جلوہ طراز ہے اور آنکھ جو کمال کہیں اور کسی شکل میں دیکھتی ہے، اس کا سرچشمہ وہی ذاتِ صمدیت ہے تو اس کے عشق ومحبت اور اجلال واحترام کی محرابوں کے مصنوعی صنم پاش پاش ہو جاتے ہیں اور اس کے ان تمام جذبات کا مرکز صرف وہی ایک ذات رہ جاتی ہے۔ اس کا یہ جذبہ کیونکہ ایجابی ہوتا ہے اس لیے اپنے محبوبِ حقیقی کی عبادت اور اطاعت میں عملی

1۔ کلیات اقبال فارسی، ص 352، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ جذبِ نہاں کی اسی نمود اور ظہور کو مَحَبَّةُ الْعَبْدِ لِلّٰهِ (بندے کی اللہ سے محبت) کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگر خلوصِ نیت اور عزمِ صادق کی زاد لے کر وہ راہِ عشق پر چل نکلے گا تو بارگاہِ ربوبیت سے جلد ہی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (مائدہ:۱۱۹) (اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی) کی نوید جانفزا سامع نواز ہوتی ہے۔ اسی سرفرازی اور پذیرائی کو "اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت" کہا جاتا ہے۔

دلِ عاشق میں وصالِ حبیب کے لیے بے قراری کی جو آگ بھڑک رہی ہوتی ہے وہ اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسی صورت نکالے، خواہ جان پر ہی کیوں نہ کھیلنا پڑے، جس سے وصال میسر ہو۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے عاشقانِ دل فگار کی رہنمائی نہ فرمائے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عقل وفکر کی قوت سے قربِ الٰہی حاصل کر سکیں کیونکہ ان کی عقل کتنی ہی روشن ہو بہر حال محدود ہے۔ ان کا فکر کتنا ہی بلند پرواز ہو، بہر حال انسانی فکر ہے۔ اسی لیے رب العالمین نے اپنا رسول بھیجا اور تمام دنیا والوں کو بتا دیا کہ اگر میری رضا وقرب کے خواہشمند ہو اور میرے وصال کے طلب گار ہو تو گمان وتخمین کی دلدلوں میں نہ بھٹکتے پھرو بلکہ میرے رسول ﷺ کا دامن پکڑ لو۔ اس کے بتائے ہوئے طریقے پر مجھے یاد کرو۔ اس کے سکھلائے ہوئے اسلوب پر میری عبادت کرو۔ اپنی اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی مشکلات کو اس کے ارشادات کے مطابق حل کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸ (البقرۃ)

"اے ایمان والو! اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

یہی میری رضامندی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے اور صرف اسی طرح تمہیں میرا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

اب اگر کوئی محبت الٰہی کا مدعی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا، یا تو وہ نادان ہے یا وہ اپنے دعویٰ محبت میں جھوٹا ہے۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اتباعِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزید برکات کا بھی ذکر فرمایا کہ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (الاحزاب: ۷۱) کہ اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تمہارے گناہ بخش دیے جائیں گے، تمہاری لغزشوں اور کوتاہیوں پر قلم عفو پھیر دیا جائے گا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ قوموں پر خدائے قہار کا عذاب ان کے گناہوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے نازل ہوتا ہے۔ قیامت خیز قحط، ہلاکت آفریں جنگیں اور تباہ کن امراض کے شکنجہ میں قدرت بلاوجہ نہیں کس دیتی بلکہ یہ انسان کی اپنی بداعمالیوں کا طبعی ردعمل ہوا کرتا ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾ (انفال)

"یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا"۔

لیکن اطاعت رسولِ عربی وہ اکسیر ہے، جس سے جاں بلب مریض شفایاب ہو جاتا ہے۔ اس کے اعجاز سے ان قوموں کو تاجِ سروری عطا کیا جاتا ہے جو قعرِ مذلت میں مدتوں سے پڑی سڑ رہی ہوتی ہیں۔ اسی کے صدقے ان امتوں کو حیاتِ نو اور ذوقِ عمل مرحمت کیا جاتا ہے، جو اپنی سست گامی سے زندگی کی دوڑ میں شکست کھا چکی ہوتی ہیں۔

تو چناں ہمائی اے جاں کہ بزیرِ سایۂ تو
بکف آورند زاغاں ہماں خلعتِ ہمائی

ایک قلب سلیم کے لیے تو اس روشن دلیل اور واضح برہان کے بعد کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں، لیکن دبیرِ ازل کے قلم معجزہ نگار نے کیونکہ اس مضمون کو مختلف اداؤں سے پیش فرمایا ہے، اس لیے ان سے متمتع ہونا بھی عین سعادت ہے۔

تیسری دلیل

اللہ تعالیٰ سورۃ النساء پارہ چہارم میں ارشاد فرماتا ہے:

Marfat.com

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۳﴾ (النساء)

''یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو حکم مانے اللہ اور اس کے رسول کا، اللہ اسے باغات میں لے جائے گا، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے''۔

یہ دنیا دارالعمل ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز تمام مخلوقات کو پھر زندہ کیا جائے گا اور ان کے اعمالِ نیک و بد کا محاسبہ ہوگا۔ اطاعت کیش اور پاکباز، جنت کی ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور سرکشوں اور متکبروں کو دوزخ کا ایندھن بنایا جائے گا۔ اس جہاں میں ہمارا مقصدِ زیست شوکت و سطوت، جاہ و منصب اور عیش و نشاط کے حصول تک محدود نہیں۔ گو ہم ان سے دست کش ہونا بھی کفرانِ نعمت سمجھتے ہیں۔ ہمارا عقابِ ہمت اس عالم آب و گل کے کوہستانوں میں آشیانہ نہیں بناتا۔ اس کا نشیمن تو فردوس اعلیٰ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔

ہماری حقیقی کامیابی یہی ہے کہ ہم قیامت کے روز بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہوں اور اس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہی بتایا ہے کہ اس کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو اور یہی سب سے بڑی کامرانی کی علت عامہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے سرمدی انعامات کے مستحق صرف وہی خوش نصیب ہیں جنہوں نے فرمانِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دل و جان سے تسلیم کیا۔

چوتھی دلیل

اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی گوناں گوں برکات بیان کرنے کے ساتھ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی سے روکا۔ سورہ مجادلہ میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹﴾ (مجادلہ)

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں مشورہ کرو، تو گناہ کرنے، حد سے بڑھنے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کا مشورہ نہ کرو اور نیکی اور پرہیزگاری کا مشورہ کرو اور اللہ سے ڈرو

Marfat.com

جس کی طرف اٹھائے جاؤ گے"۔

دیکھیے اللہ تعالیٰ کس دلکش اور محبت بھرے انداز میں مسلمانوں کو ایسی سرگوشیوں سے روکتے ہیں، جن میں فسق، تعدی اور فخر الرسل ﷺ کی نافرمانی کی سازش کی جائے اور ساتھ ہی تنبیہ جاری فرمادی کہ یہ تمہاری سرگوشیاں مجھ سے اوجھل نہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو قیامت کے دن تمہیں رسوا کیا جائے گا۔

اسلامی حکومتوں کے اربابِ حل و عقد، مجالس دستور ساز کے ارکان، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران اس آیت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے کس وضاحت سے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ سنت نبی کریم ﷺ کے خلاف کوئی آئین یا قانون بنانے کا انہیں کوئی اختیار نہیں۔ اسلامی مملکت کے صدر، وزیر اعظم اور افسران کسی خودساختہ مصلحت کی وجہ سے ترک سنت کے مجاز نہیں۔

پانچویں دلیل

کئی مقامات پر اللہ رب العزت نے دوزخ کی آگ میں جلنے والوں اور عذابِ خداوندی میں گرفتار بدنصیبوں کا ذکر فرمایا کہ اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ اس وقت کفِ افسوس ملتے ہوئے اور اشکِ ندامت بہاتے ہوئے نہایت حسرت سے اپنے جرم کا اعتراف بدیں الفاظ کریں گے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾

"جس دن ان کے منہ الٹ الٹ کر آگ میں تلے جائیں گے، کہتے ہوں گے: کاش! ہم نے خدا کی اطاعت کی ہوتی اور رسول کی اطاعت کی ہوتی"۔ (الاحزاب)

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

چھٹی دلیل

اور کہیں گے جب کہ ان کا یہ کہنا انہیں کوئی نفع نہ دے گا:

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا

یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا (النساء)

''اس دن تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی۔ کاش! انہیں مٹی میں دبا کر زمین ہموار کر دی جائے اور وہ کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے''۔

ساتویں دلیل

مندرجہ ذیل آیت سورۂ توبہ کی ہے۔ آپ اسے پڑھیے اور غور کیجئے کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا کیا عالم ہے جو نورِ مجسم ہادیٔ اعظم ﷺ کی حرام کردہ اشیاء کو حرام نہیں سمجھتے اور فرزندانِ توحید کو انہیں کون سی سزا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ)

''لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اس چیز کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول نے اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے، یعنی وہ جو کتاب دیے گئے جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر''۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت کھلے طور پر یہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کی اطاعت اور سنت نبی کریم ﷺ کی اطاعت مساوی طور پر فرض ہے اور جو سزا قرآن سے سرتابی کرنے والے کی ہے اسی سزا کا مستحق سنت نبوی ﷺ کا منکر ہے۔

آٹھویں دلیل

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء)

''اور جب ان کو (جو بظاہر مسلمان ہونے کے مدعی ہیں) کہا گیا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور اس کے رسول کی طرف تو تم نے دیکھا منافق لوگوں کو، وہ تم سے دور ہٹتے ہیں''۔

قرآن کی اصطلاح میں وہ بھی منافق ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کے ارشادِ گرامی کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ یعنی کوئی مسلمان تو سنت سے انحراف کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ سنت سے انحراف تو فقط منافقین کا شیوہ ہے۔

نویں دلیل

کیونکہ اطاعت رسول ﷺ رشد و ہدایت کی کفیل ہے، اسی لیے انسان روزِ محشر کی ندامت سے محفوظ ہوسکتا ہے۔ یہی بات جنت کی کلید ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وسیع کا حق دار انہیں لوگوں کو ٹھہرایا ہے جو اطاعت رسول اللہ ﷺ میں کوشاں رہتے ہیں۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الخ (الاعراف)

''اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو۔ سو اس کو لکھ دوں گا ان کے لیے جو متقی ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے''۔

اطاعت اور اتباع کے معانی کی تحقیق

کیونکہ ان تمام آیات میں نبی اکرم ﷺ کی پیروی کا حکم ہے، اطاعت اور اتباع کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس لیے یہ بحث ختم کرنے سے پہلے لفظ ''اطاعۃ، اتباع'' کی تحقیق کرلینی چاہیے تاکہ کسی قسم کا لفظی نزاع بھی کسی غلط فہمی کا باعث نہ بنے۔

عربی زبان میں اتباع کہتے ہیں کہ کسی شخص کے پیچھے پیچھے چلنا۔ چنانچہ ابن منظور نے اپنی لغت کی شہرۂ آفاق کتاب ''لسان العرب'' میں اس کی یوں تحقیق کی ہے:

قَالَ الْفَرَّاءُ: اَلْاِتِّبَاعُ اَنْ يَّسِيْرَ الرَّجُلُ وَ اَنْتَ تَسِيْرُ وَرَآئَهٗ وَ اِذَا قُلْتَ اِتَّبَعْتُهٗ فَكَاَنَّكَ قَفَوْتَهٗ۔ (لسان العرب، فصل التاء من باب العین)

''فراء (لغت ونحو کے امام) نے کہا کہ اتباع کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص آگے آگے چل رہا ہو اور تو اس کے پیچھے پیچھے چلے اور اگر تو کہے کہ میں نے اس کا اتباع کیا تو اس کا مطلب

یہ ہے کہ تو اس کے پیچھے پیچھے اور اس کے نقش قدم پر چلا"۔

صاحب تاج العروس نے اس مفہوم کو ذکر کرنے کے ساتھ چند ایک اور الفاظ بھی لکھے ہیں، جن سے "اتباع" کا معنی اور زیادہ واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

اَلتُّبع وَ کَذٰلِکَ التُّبَّع کَسُکر الظِلّ. سُمِّیَ بِہٖ لِاَنَّہٗ یَتبَعُ الشَّمسَ حَیثُمَا زَالَتْ وَ مِنَ الْمَجَازِ التُّبَّعُ ضَرْبٌ مِنَ الْیَعَاسِیْبِ اَعْظَمِھَا وَ اَحْسَنِھَا.

(تاج العروس فصل التاء من باب العین)

"التُّبع اور التُّبَّع (جن کا مادۂ اشتقاق تبع ہے) کا معنی سایہ ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سورج کے پیچھے پیچھے رہتا ہے، اور التبع مجازاً شہد کی مکھیوں کے سب سے اعلیٰ اور بہتر نر کو بھی کہتے ہیں کیونکہ شہد کی مکھیاں اس کے پیچھے پیچھے رہتی ہیں"۔

اور اس کا اصطلاحی معنی امام ابوالحسن الآمدی نے یوں بیان کیا ہے:

وَ اَمَّا الْمُتَابَعَۃُ فَقَدْ تَکُوْنُ فِی الْقَوْلِ وَ قَدْ تَکُوْنُ فِی الْفِعْلِ وَالتَّرکِ فَاتِّبَاعُ الْقَوْلِ ھُوَ امْتِثَالُہٗ عَلَی الْوَجْہِ الَّذِیْ اقْتَضَاہُ الْقَوْلُ، وَالْاِتِّبَاعُ فِی الْفِعْلِ ھُوَ التَّأَسِّیْ بِعَیْنِہٖ. اَمَّا التَّأَسِّیْ فِی الْفِعْلِ وَھُوَ اَنْ تَفْعَلَ مِثْلَ فِعْلِہٖ عَلٰی وَجْھِہٖ مِنْ اَجَلِ فِعْلِہٖ.

"متابعت کبھی کسی کے قول کی ہوتی ہے اور کبھی کسی کے فعل و ترک کی۔ کسی کے قول کے اتباع کا معنی تو یہ ہے کہ اپنے متبوع کی اس طرح فرمانبرداری کی جائے، جس طرح اس کے قول کا تقاضا ہو اور کسی کے فعل کے اتباع کا معنی یہ ہے کہ اس کے اس فعل کو اس طرح کیا جائے جس طرح وہ کرتا ہے اور اس لیے کیا جائے کیونکہ وہ کرتا ہے"۔

(الاحکام فی اصول الاحکام ۸۸، ۸۹)

اتباع کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق سے یہ واضح ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کی اتباع کے متعلق جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اس کی تعمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ کے اقوال پر اس طرح عمل کریں جیسا ان اقوال کا تقاضا اور منشا ہے اور حضور

Marfat.com

ﷺ کے افعال کو اس طرح ادا کریں جس طرح حضور نے ادا فرمائے اور اس لیے ادا کریں کیونکہ حضور پرنور نے ان افعال کو ادا فرمایا۔ اگر ہم حضور کریم ﷺ کے ارشادات پر اس طرح عمل نہ کریں جیسے ان کا تقاضا ہے یا افعالِ رسالت کو اس طرح ادا نہ کریں جیسے حضور نے ادا کیے یا اس لیے ادا نہ کریں کہ حضور اکرم ﷺ نے انہیں ادا کیا تو پھر اتباع نبوی ﷺ سے جس کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے بارہا حکم فرمایا ہے، ہم محروم رہیں گے۔

اتباع کا معنی سمجھ لینے کے بعد اب ذرا لفظ ''اطاعة'' پر غور فرمائیے:

عربی زبان میں ''اطاعة'' کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کو کہتے ہیں، چنانچہ ''لسان العرب'' میں ہے:

وَ فِی التَّهْذِیْبِ وَ قَدْ طَاعَ لَهٗ یَطُوْعُ اِذَا انْقَادَ لَهٗ بِغَیْرِ اَلِفٍ فَاِذَا مَضٰی لِاَمْرِهٖ فَقَدْ اَطَاعَ۔ (لسان العرب، فصل الطآء من باب العین)

''تہذیب (لغت کی ایک مستند کتاب) میں ہے کہ قد طاع له یطوع (جبکہ ثلاثی مجرد ہو) کا معنی ہے کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا اور جب کوئی کسی کے حکم کی تعمیل کرے تو کہتے ہیں قد اطاعه یعنی اس نے اس کی اطاعت کی''۔

اور اطاعة کا اصطلاحی معنی امام ابو الحسن الآمدی نے یہ لکھا ہے:

وَ مَنْ اَتٰی بِمِثْلِ فِعْلِ الْغَیْرِ عَلٰی قَصْدِ اِعْظَامِهٖ فَهُوَ مُطِیْعٌ لَهٗ۔

(الاحکام فی اصول الاحکام ج ۱ ص ۹۱ طبع صبیح)

''یعنی جب کوئی شخص کسی دوسرے کی عزت و احترام کے باعث بعینہٖ اس کے فعل کی طرح کوئی فعل کرے تو کہتے ہیں کہ یہ شخص فلاں شخص کا مطیع ہے''۔

تو گویا اہل عرب جن کی زبان میں قرآنِ کریم نازل ہوا ''اطاعة'' کا لفظ اس وقت استعمال کرتے ہیں جبکہ کسی کے حکم کی تعمیل کی جائے اور اس کی عزت و احترام کی وجہ سے بعینہٖ ایسا کام کیا جائے جیسا اس کام کو وہ معزز و محترم شخص کرتا ہے۔

Marfat.com

''اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے حکم الٰہی کی تعمیل کی واحد صورت

اب جن آیاتِ قرآنی میں اطاعت واتباع رسول کی بار بار تاکید کی گئی ہے ان پر عمل تو فقط اسی صورت میں ہوگا کہ آپ ایسا کریں جیسے وہ رسول کرتا ہے۔ یعنی جیسے وہ نماز پڑھتا ہے، اسی طرح انہیں اوقات پر اتنی ہی رکعتیں ادا کریں۔ حج کی جو عملی تصویر وہ پیش کرتا ہے بعینہٖ اس کا چربہ اتاریں۔ زکوٰۃ کے نصاب، اس کی شرح وغیرہ کے جو اصول اس نے سکھائے ہیں بلا چون و چرا ان پر عمل پیرا رہیں۔ لین دین، نکاح وطلاق، اخلاق ومعاشرت کے جو ضوابط اس نے مقرر فرمائے ہیں ان پر بطیب خاطر کاربند رہیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو واقعی آپ نے اس کی متابعت کی اور اپنے رب کا حکم مانا۔ لیکن اگر آپ ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنی فہم ودانست کے مطابق تعلیماتِ اسلامی کو نت نئی شکلوں میں پیش کر کے اپنے شوقِ تجدید پسندی کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں تو یہ بلاشبہ اتباعِ ہوس واطاعت نفس تو ہوگی، لیکن آپ اسے کسی تاویل کی قوت سے بھی اطاعت رسول اور اتباعِ سنت نہیں کہہ سکتے۔

اب ان حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ التماس ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے منکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے کلامِ پاک میں جسے وہ بھی قیامت تک کے لیے غیر تغیر پذیر مانتے ہیں اور اس کی مقرر کردہ جزئیات کو بھی غیر متبدل تسلیم کرتے ہیں، یہ فرماتا ہے:

گناہوں کی آمرزش چاہتے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔

میری محبت کے دعویدار ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔

جنت کے طلبگار ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔

میرے محبوب بننا چاہتے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔

میرے دامن رحمت میں پناہ لینا چاہتے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو۔

اور جس وقت تمہیں کسی خطۂ زمین میں غلبہ وتمکین عطا فرماؤں اور تم مجالس دستور ساز میں وضع آئین وقوانین کے لیے اکٹھے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو..............

..................ورنہ..................

Marfat.com

قیامت کے دن ہونٹ کاٹو گے، اپنے تمرد و سرکشی پر پچھتاؤ گے، اپنے وجود تک سے بیزاری کا اظہار کرو گے........... لیکن کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔

اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں اب ہمیں خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والثناء کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ اطاعت رسول کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب ہمارا حکم واجب التعمیل ہے اور ہماری سنت قابل تقلید۔

قرآن کے اصولوں اور اس کی تفصیلات کو اٹل اور دائمی کہنے والے اب ان آیات کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ آیتیں ان کے نزدیک قرآن پاک کی نہیں؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا نازل فرمایا ہوا کلام نہیں؟ ان کو وہ کیوں غیر متبدل نہیں سمجھتے؟ کیا یہ آیاتِ محکمات منسوخ ہو چکی ہیں؟ یا ان کے معانی بدل چکے ہیں؟ ایک مفتری نے حرمت جہاد کا فتویٰ جاری کر کے امت مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قوائے عمل و نشاط کو مفلوج کرنا چاہا تھا تاکہ اپنے محسن آقا کے سامنے اپنی نیازمندی اور وفاداری کا ثبوت پیش کر سکے، جس کے فکر فتنہ ساز نے اس کے لیے نبوت تخلیق کی، جس کے دجل و فریب سے اس کے باطل کو تقویت ملی، جس کے مکر و خداع نے اسے دامِ ہمرنگ زمین بخشا اور جس کی بخشش ہائے بے اندازہ نے اسے مال و جاہ کے پجاریوں کا قاضی الحاجات بنا دیا۔

لیکن زمین و آسمان کا خدا شاہد ہے کہ وہ اپنی دسیسہ کاریوں میں ناکام رہا۔ امت محمدیہ کے دلوں سے جہاد کا جذبہ مٹ نہ سکا، راہِ حق میں مرنے کی تڑپ کم نہ ہوئی، اسلام کا پرچم بلند رکھنے کے عزم میں ضعف نہ آیا۔ میدانِ سرفروشی میں نعرۂ توحید بلند ہوتا رہا اور شہادت گاہِ عشق میں آقائے بدر و حنین کے غلام اپنا دل و جان نثار آبروئے جاناں کرتے ہی رہے اور جب تک چشم آفتاب روشن ہے وہ یہ نظارہ دیکھتی رہے گی۔

اب یہ ملت کے نئے دردمند اور بہی خواہ صرف ایک چیز کو نہیں بلکہ اسلام کے ان تمام اصولوں کو ناقابل عمل ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہیں، جن کا سرچشمہ ذاتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کے

Marfat.com

احکام میں ردو بدل ناممکن ہے، لیکن اگر وہی قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کرو اور صرف ایک بار نہیں بلکہ سینکڑوں بار کہتا ہے تو پرواہ نہیں کرتے اور یہی کہتے ہیں کہ نہیں، اطاعت رسول کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب ہم پر بلکہ ساری امت پر رسول کی اطاعت فرض نہیں رہی۔

سچ تو یہ ہے کہ دامن مصطفوی ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد کوئی کتنا ہی چابکدست ہو، جبل اللہ (قرآن) کو نہیں تھام سکتا۔ جن کے لیے نقش پائے مصطفیٰ دلیل راہ نہیں ان کے لیے سروشِ غیب بھی بے معنی ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت تشریعی (سنت طبعی نہیں) میں جو اصول اور جو احکام مذکور ہیں، زمانے کے بدلتے ہوئے احوال اس کے دامن ابدیت کو نہیں چھو سکتے۔ شب وروز کا غیر منقطع تسلسل ان کی زندگی بخش اور شباب آفریں قوتوں کو مضمحل نہیں کر سکتا۔ گردشِ لیل ونہار ان کی افادیت اور صلاحیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ہمارا یقین محکم ہے کہ قرآن کریم کے دوسرے اصول اور تفصیلات جس طرح ابدی اور دائمی ہیں، اسی طرح اطاعت رسالت کے متعلق جو حکم ہے وہ بھی قیامت تک کے لیے واجب العمل ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید

کتاب انقلاب

مقدمہ تفسیر ضیاء القرآن سے

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۝۱ (القدر)

''ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا''۔

رحمٰن ورحیم پروردگار نے اپنے بندوں کی رہنمائی اور ان کی حقیقی فلاح وکامرانی کے لیے جو صحیفہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب منیر پر نازل فرمایا، اسے ہم قرآنِ مجید کے نام سے جانتے ہیں۔ کہنے کو تو یہ ایک کتاب ہے اور کتابیں ان گنت ہیں، بڑی ضخیم، بڑی ادق، بڑی دلآویز، لیکن اس کتاب کی شان ہی نرالی ہے۔ یہ صحیفہ بیک وقت کتاب بھی ہے اور علم ومعرفت کا آفتابِ جہاں تاب بھی، جس میں زندگی کی حرارت اور ہدایت کا نور دونوں یک جا ہیں۔ اس کا حسن وجمال قلب ونگاہ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔ اس کی تجلیات سے دنیا وعقبیٰ دونوں جگمگا رہے ہیں۔ اس کا فیض ہر پیاسے کو اس کی پیاس کے مطابق سیراب کرتا ہے۔ اس کا پیغام اگر عقل وخرد کو لذتِ جستجو بخشتا ہے تو قلب وروح کو بھی شوقِ فراواں سے مالا مال کرتا ہے۔ اس کی تعلیم نے انسان کو خودشناس بھی بنایا اور خداشناس بھی۔

یہ کتابِ مقدس ہر لحاظ سے سراپا اعجاز ہے۔ اس کا ہر پہلو اتنا دلربا ہے کہ اپنے پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ اسی لیے جب سے اس کا نزول ہوا اس نے اپنی فطری جاذبیت سے، نوعِ انسانی کے ہر طبقہ سے سنجیدہ اور ذہین افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

فاران کی وادیوں سے قرآن کا چشمہ فیض کیا پھوٹا کہ اس سے علوم وفنون کے دریا بہہ نکلے، جنہوں نے جزیرۂ عرب کے پیاسے ریگزاروں کو سیراب کیا اور انہیں حکمت ودانش کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ اس ایک کتابِ مجید نے جہاں پہلے علوم کو حیاتِ نو بخشی وہاں اس نے بے شمار جدید علوم کی تشکیل کا سامان فراہم کر دیا۔ علومِ تفسیر، لغت وفقہ اللغۃ، فقہ واصولِ فقہ، معانی و بلاغت وبدیع، صرف ونحو، قرأت وتجوید، وعظ وخطابت، قصص واخبار، امثال وحکایات، ان کے علاوہ اور کئی علوم ہیں جنہوں نے قرآنِ کریم کے سایۂ عاطفت میں جنم لیا اور اسی کے

Marfat.com

آغوشِ تربیت میں پروان چڑھے۔ اس طرح قرآنِ حکیم کے فیض سے دنیا کی سب سے زیادہ جاہل قوم علم و حکمت کے عظیم خزانوں کی مالک بلکہ خالق بن گئی۔

قرآن کا اہم پہلو

ہر عہد میں ملت اسلامیہ کے ذہین و فطین افراد نے، جو روشن دماغ بھی تھے اور روشن ضمیر بھی، اپنی استطاعت، ذاتی صلاحیت و استعداد اور اپنے مخصوص ماحول کی ضروریات اور تقاضوں کے پیش نظر قرآنِ مجید کے ان خادم علوم میں سے کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کیا اور خدمت گزاری کا حق ادا کر دیا اور اپنے اپنے موضوع پر ایسی زندۂ جاوید تالیفات اور تصنیفات کا گراں بہا ذخیرہ چھوڑا جن کی روشنی سے دنیا بھر کے کتب خانے اور دانش گاہیں آج بھی چمک رہی ہیں، لیکن اس ناچیز کے نزدیک قرآن کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ کتابِ ہدایت ہے۔ اس کے نازل فرمانے والے نے بارہا اس کا تعارف اس قسم کے کلمات سے کرایا ہے:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (آل عمران)

آج ہمیں قرآنِ مجید کے اسی پہلو پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، لیکن شومیِ تقدیر ملاحظہ ہو، آج قرآن کا یہی پہلو متروک اور مہجور ہے۔

قرآن حکیم کا مقصد اولین انسان کی اصلاح ہے۔ تربیت پیہم سے اس کے نفس امارہ کو نفس مطمئنہ بنانا ہے۔ ہوا و ہوس کے غبار سے آئینۂ دل کو صاف کر کے اسے انوارِ ربانی کی جلوہ گاہ بنانا ہے۔ انانیت و غرور، تمرد و سرکشی کی بیخ کنی کر کے انسان کو اپنے مالک حقیقی کی اطاعت و انقیاد کا خوگر کرنا ہے۔ یہی کام سب سے اہم بھی ہے اور سب سے مشکل اور کٹھن بھی۔ قرآنِ مجید نے اسی اہم ترین اور مشکل ترین کام کو سرانجام دیا اور اس حسن و خوبی سے کہ دنیا کا نقشہ بدل گیا۔

کتابِ انقلاب

یہ صرف باتیں ہی باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقت ہے، زندۂ جاوید حقیقت اور ناقابل

Marfat.com

انکار حقیقت، کہ قرآن کی ہدایت سے بگڑا ہوا انسان سدھرا اور سدھر کر ساری کائنات کے لیے آیۂ رحمت بن گیا۔ غور فرمایئے! حکمت الٰہی نے نزولِ قرآن کے لیے جس سرزمین کو منتخب کیا، وہ عرب کا خطہ تھا۔ وہاں بسنے والے لوگ شکل وصورت میں انسان تو تھے، لیکن انسانیت سے ان کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ کفر وشرک، فسق وفجور، ظلم وستم، وحشت وبربریت، جہالت اور اجڈ پن، اس پر فقر وافلاس مستزاد، غرضیکہ کون سا عیب تھا یا کون سی گمراہی تھی جو ان میں بدرجہ اتم موجود نہ تھی اور دنیا نے دیکھا کہ قرآنِ حکیم کی تاثیر اور صاحب قرآن کی برکت سے وہ کیا بن گئے، اگر قرآن عرب کے اجڈ بدوؤں کو آدم وبنی آدم کے لیے باعث عز وشرف بنا سکتا ہے، اگر ان جاہلوں کو جو ابجد خواں بھی نہ تھے، بزمِ علم ودانش کا صدر نشیں بنا سکتا ہے، اگر حرم کعبہ میں ۳۶۰ بتوں کی پوجا کرنے والی قوم کے دل میں معرفت الٰہی کی شمع فروزاں کر سکتا ہے، تو ہمارے صنم کدۂ تصورات کے لات وہبل کو کیوں ریزہ ریزہ نہیں کر سکتا؟ ہمارے ظلمت خانۂ حیات کو اس کی کرنیں کیونکر منور نہیں کر سکتیں؟ بخدا! ہو سکتا ہے، سب کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم قرآن کی ہدایت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں اور ہمارا کاروانِ حیات اس شاہراہِ ہدایت پر گامزن ہو جو قرآن نے ہمارے لیے تجویز کی ہے۔

قرآن کی قیادت قبول کرو

اے درماندۂ راہ قوم! قرآن تمہیں عظمت وعزت کی بلندیوں کی طرف آج بھی لے جا سکتا ہے، بشرطیکہ تم اس کی قیادت قبول کر لو۔ اے اپنی قسمت برگشتہ پر آہ وفغاں کرنے والے نوجوانو! دنیا کی امامت تمہاری متاعِ گم گشتہ ہے، تمہیں یہ واپس مل سکتی ہے۔ اگر تم میں اس کی واپسی کی تڑپ ہو تو قرآن تمہیں واپس دلا سکتا ہے، اگر تم اس کا حکم ماننے کے لیے تیار ہو۔

زندگی کی یہ ساری چہل پہل تقسیم کار کے باعث ہے۔ ایک ہی ملت کے مختلف افراد مختلف کام سرانجام دیتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں حکمرانی کی باگ ڈور ہے، کوئی مجلس مشاورت کا رکن رکین ہے، کوئی تجارت وصنعت کو چار چاند لگا رہا ہے، کوئی شکم زمین سے

رزق کے سر بمہر خزانے نکال کر ان کے ڈھیر لگا رہا ہے، کوئی وعظ و نصیحت کے منبر پر جلوہ نما ہے، کوئی تعلیم و تدریس کی مسند کو رونق بخشتا ہے اور کوئی سجادۂ فقر و درویشی پر تشریف فرما ہے۔ قوم کو مجموعی طور پر اصلاح یافتہ اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ اس کے تمام عناصر حق کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں اور اپنے اپنے دائرۂ عمل میں قرآن کی ہدایت پر کاربند ہوں اور اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں پوری دیانتداری سے مصروفِ کار ہوں۔ ان عناصر کا باہمی تعلق اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اگر ایک عنصر بھی جادۂ حق سے برگشتہ ہو جائے تو دوسرے عناصر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے قرآن حکیم نے ہر ایک کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا ہے اور ہر گروہ میں راہ پانے والی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور انہیں اس کے عبرتناک انجام سے آگاہ کیا ہے۔

ہم اکثر بگڑی ہوئی قوموں کے حالات اور ان کے حسرتناک انجام کے متعلق قرآن میں پڑھتے ہیں اور ایک لحہ توقف کیے بغیر آگے نکل جاتے ہیں۔ ہم یہ زحمت بہت کم گوارا کرتے ہیں کہ اپنے اعمال کا موازنہ برباد شدہ قوموں کے اعمال سے کریں اور یہ سوچیں کہ کہیں ہم بھی انہیں نافرمانیوں کا شکار تو نہیں اور اگر خدانخواستہ ہیں تو اپنے انجام کی ہولناکیوں سے غافل کیوں ہیں؟ کیا مکافاتِ عمل کا قانون، قدرت کا اٹل قانون نہیں؟ کیا ہم نے یہ نہیں پڑھا کہ:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (فاطر۔ ۴۳)

مکمل ضابطۂ حیات

قرآنِ کریم نے اپنے ماننے والوں کو ایک واضح اور مکمل ضابطۂ حیات (شریعت) عطا کیا ہے اور یہ ضابطہ اتنا ہی وسیع ہے جتنی زندگی اپنے بوقلموں تنوع کے ساتھ وسیع ہے، بلکہ بلا مبالغہ اس سے بھی وسیع تر۔ انسان کیا ہے؟ اس کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ اور اس کی مخلوق سے کیسا ہونا چاہیے؟ اگر وہ حاکم ہے تو اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اگر وہ رعایا ہے تو اس کے فرائض کی نوعیت کیا ہے؟ اگر وہ دولت مند ہے تو اس کا طرزِ عمل کیسا ہو اور اگر وہ فقیر و محتاج

Marfat.com

ہے تو کس طرح باوقار زندگی بسر کرسکتا ہے؟ قرآن نے جو شریعت کاملہ ہمیں دی ہے اس میں ان سوالات کا مکمل جواب موجود ہے۔ اسی لیے عبادات، سیاسیات، معاشیات، نظامِ اخلاق وغیرہ تمام امور کو شریعت نے اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے۔

قرآن فہمی

فرقانِ حمید عربی زبان میں نازل ہوا۔ عربی کا اپنا ادب ہے، فصاحت و بلاغت کا اپنا معیار ہے، اس کے اپنے مجازات، استعارات اور امثال ہیں، مفردات کے اشتقاق اور جملوں کی ترتیب کے الگ قواعد ہیں۔ اس کا دامن الفاظ کی کثرت سے معمور ہے اور قواعد اشتقاق نے تو اس میں اتنی وسعت پیدا کردی ہے کہ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

اس مقدس کتاب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عربی زبان سے ربط پیدا کریں۔ اس کے قواعد وضوابط سے اچھی طرح واقفیت بہم پہنچائیں۔ اس کے ادب اور اسلوب انشاء کی خصوصیات کو سمجھیں تاکہ کلمات کے آبگینوں میں حقیقت کی جو شرابِ طہور چھلک رہی ہے اس سے لطف اندوز ہوسکیں۔

جمع وتدوین

حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے فاضل اور فن تحریر میں ماہر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو قرآنِ کریم کی کتابت کے لیے متعین فرمایا ہوا تھا، جنہیں کاتبانِ وحی کہا جاتا تھا۔ جب بھی کوئی آیت یا مجموعۂ آیات یا سورت نازل ہوتی تو ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق کاتبانِ وحی اسے ضبط تحریر میں لے آتے۔ حضور ﷺ ہر آیت کے متعلق یہ تصریح فرماتے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھی جائے۔ اس طرح جوں جوں قرآن نازل ہوتا رہا، رسول مکرم ﷺ کی نگرانی میں حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق تحریر کیا جاتا رہا، لیکن یہ تحریریں کتابی شکل میں مدون نہیں تھیں، بلکہ کاغذوں، ہڈی کے ٹکڑوں، کھجور کے چھلکوں، پتھر کی سلوں وغیرہ اشیاء پر لکھی جاتی رہیں۔

Marfat.com

حفاظت قرآن کا سب سے اہم ذریعہ حفظ قرآن مجید تھا۔ حضور ﷺ اپنے صحابہ کو اسے یاد کرنے کا شوق دلاتے۔ قیامت کے روز حفاظِ قرآن کو مقامات رفیعہ اور مدارجِ سنیہ پر فائز ہونے کی بشارتیں دیتے۔ نماز میں بھی اس کی تلاوت کو فرض کر دیا گیا۔ اس لیے ہر مسلمان کے لیے قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ حفظ کرنا ضروری ہو گیا اور کئی صحابہ ایسے تھے جنہیں تمام قرآنِ حکیم یاد تھا۔

رحمت عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رفیق اعلیٰ سے جا ملنے کے بعد جب ارتداد کا فتنہ اٹھا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کو کچلنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر روانہ کیے تو مسیلمہ کذاب سے یمامہ کے مقام پر مسلمانوں کی جو خونریز جنگ ہوئی اس میں اگرچہ مسیلمہ اور اس کی جھوٹی نبوت کا تو خاتمہ ہو گیا، لیکن ختم رسالت کے فداکاروں کا بھی بے انداز جانی نقصان ہوا، جس میں سات سو کے قریب صرف حفاظ قرآن نے جامِ شہادت نوش کیا۔ (القرطبی)

اس سانحہ نے حضرت عمر فاروقِ اعظم کو بہت پریشان کر دیا۔ بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو کر انہوں نے عرض کی کہ اے صدیق! باطل سے جنگوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ اگر حفاظِ قرآن کے قتل کی یہی رفتار رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہم اللہ تعالیٰ کی اس کتاب سے محروم نہ ہو جائیں۔ اس لیے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے کتابی شکل میں یکجا جمع کر دیا جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عمر! رضی اللہ عنہ میں وہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں جسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہیں کیا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیہم اصرار کے باعث آپ کو بھی اس کام کی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ آپ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور انہیں قرآن کریم کو یکجا جمع کرنے کی ہدایت فرمائی۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانے کا حکم دیتے تو مجھ پر اتنا شاق نہ گزرتا جتنی اس حکم کی

Marfat.com

تعمیل شاق گزری۔ پہلے آپ نے بھی ایسا کام کرنے سے انکار کیا جو عہد رسالت میں نہیں کیا گیا تھا، لیکن خلیفۂ اول کی فہمائش سے انہیں بھی انشراحِ صدر حاصل ہو گیا اور اس کام کی اہمیت کا انہیں بھی احساس ہو گیا۔ بڑی جانفشانی، محنت، محبت، تجسس اور جستجو سے قرآنِ حکیم کا پہلا نسخہ مدون کیا گیا۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یہ نسخہ آپ کے پاس رہا۔ آپ کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ اور ان کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رکھ دیا گیا اور ضرورت کے وقت ان کی طرف رجوع کیا جاتا۔

یہ امر مخفی نہیں کہ قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب تھے جن کی مادری زبان عربی تھی۔ اگرچہ سب قبائل کی مشترک زبان عربی ہی تھی لیکن ان کے لہجوں میں، تلفظ الفاظ میں اور بعض اعراب میں بین تفاوت تھا۔ یہ صورتِ حالات ہر زبان میں ہوتی ہے۔ جس علاقہ میں اردو بولی جاتی ہے وہاں کے ہر ضلع بلکہ ہر تحصیل کے لوگوں کے لب ولہجہ میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ ابتداء میں مختلف قبائل کی سہولت کے پیش نظر انہیں ان کے مخصوص انداز کے مطابق قرأتِ قرآن کی اجازت دے دی گئی تھی، کیونکہ سب اہل زبان تھے، اس لیے ایسے تفاوت سے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوتی تھی، لیکن جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا اور دوسرے ممالک بھی قلمرو اسلامی کا حصہ بن گئے اور وہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کیا اور قرآن مجید پڑھنا شروع کیا تو ہر ایک نے قرآن کے فقط اسی لہجہ اور تلفظ کو صحیح یقین کیا جو اسے اس کے استاد نے سکھایا تھا۔ اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد، ان اختلافات کے باعث ایک دوسرے کی تغلیط کرنے لگ گئے اور فتنہ وفساد کی آگ آہستہ آہستہ سلگنے لگی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش آیا، جس نے آپ کو حیران وسراسیمہ کر دیا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ غزوۂ ارمینیہ میں شریک تھے۔ عراق اور شام کے نومسلم بھی اس جنگ میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہر ایک نے اپنے معلم کی سکھائی ہوئی

Marfat.com

قرأت کے مطابق قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ جس سے باہمی نزاع پیدا ہو گیا۔ ہر ایک نے دوسرے کی تغلیط کی اور اسے محرف قرآن کہا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہنے جب یہ ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھا تو انہیں سخت فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ آپ مدینہ منورہ واپس آئے اور اپنے گھر جانے سے پہلے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

اَدْرِکْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ قَبْلَ اَنْ تَھْلِکَ

''اس امت کی چارہ سازی کیجئے اس سے بیشتر کہ یہ ہلاک ہو جائے''۔

اور پھر سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا:

اِنِّیْ اَخْشٰی عَلَیْھِمْ اَنْ یَّخْتَلِفُوْا فِیْ کِتَابِھِمْ کَمَا اخْتَلَفَ الْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی۔ (1)

''یعنی مجھے ان کے بارے میں سخت اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی کتاب میں اختلاف نہ کرنے لگیں''۔

قرآنِ کریم کا نزول لغت قریش کے مطابق ہوا تھا۔ محض آسانی اور سہولت کے پیش نظر دوسرے قبائل کو اپنے اپنے لب ولہجہ سے اس کی تلاوت کی اجازت دی گئی تھی، لیکن اب یہ رخصت ایک عظیم فتنہ کا باعث بن رہی تھی۔ ان حالات میں اس کو برقرار رکھنا سراسر نقصان دہ اور مضر تھا، چنانچہ صحابہ کرام کے مشورے سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہکو حکم دیا کہ قرآنِ کریم کا ایک نسخہ صرف لغت قریش کے مطابق لکھیں۔ چنانچہ وہ تیار کر چکے تو اس کی متعدد نقلیں تیار کر کے مختلف دیار و امصار میں بھیجی گئیں اور لوگوں کو اس کی پابندی کا حکم دیا گیا اور دوسرے تمام نسخوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سعی وکوشش سے ایک مہلک ترین فتنہ کا سد باب ہو گیا۔ امت اسلامیہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہکے اس احسان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے آپ کو جامع آیات القرآن کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

1۔ ملخص تفسیر القرطبی، جلد 1 ص 52-50

Marfat.com

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لب ولہجہ کے تفاوت اور قرأتوں کے اختلاف کی نوعیت بیان کر دی جائے تا کہ اس کے متعلق کوئی وسوسہ دل میں نہ رہ جائے۔ چند مثالیں ذکر کر دینے سے ان امور کی حقیقت واضح ہو جائے گی اور پتہ چل جائے گا کہ یہ اختلاف معمولی قسم کا تھا، مثلاً قریش (حتی) (جب تک) اور بنی ہذیل اور بنی ثقیف اس کا تلفظ "اتی" کیا کرتے۔ بنی اسد مضارع میں حروفِ اتین کو مکسور پڑھا کرتے، جیسے تِعْلَمُوْنَ۔ اور قریش کی لغت میں حروفِ اتین مفتوح ہیں جیسے تَعْلَمُوْنَ۔ مصر میں اب بھی عام لوگ اپنی گفتگو میں حروفِ اتین کو کسرہ دیا کرتے ہیں۔ قریش کی لغت میں مَآءٍ غَیْرِ آسِنٍ ہے لیکن بنی تمیم اسے مَاءٍ غَیْرِ یَاسِنٍ پڑھتے۔

ان امثلہ سے معلوم ہو گیا کہ یہ اختلاف کس نوعیت کا تھا، لیکن قرآن کا تقدس اور اس کی عظمت اتنے سے اختلاف کی بھی متحمل نہیں، اس لیے اس کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔

چنانچہ وہی قرآن جو عرش عظیم کے رب نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا تھا اور جس کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہمانے خالص قریشی لغت کے مطابق، جس میں اس کا نزول ہوا تھا، ایک صحیفہ مدون فرمایا، وہی قرآن جوں کا توں بغیر کسی تحریف کے، بغیر کسی معمولی تغیر کے، بغیر کسی ادنیٰ ردوبدل کے اب تک محفوظ ہمارے پاس موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا اور اس کا اعتراف دوست دشمن سب کو ہے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا صفحہ ۴۸۰، جلد ۱۳ میں بھی یہ تصریح موجود ہے:

THIS RECENSION OF UTHMAN THUS BECAME THE ONLY STANDARD TEXT FOR THE WHOLE MUSLIM WORLD UP TO THE PRESENT DAY.

ترتیب قرآن

یہ تو واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی سورتوں اور سورتوں کی آیات کی موجودہ ترتیب وہ نہیں

Marfat.com

جس ترتیب سے اس کا نزول ہوا، پھر اس موجودہ ترتیب کا ماخذ کیا ہے؟ اور کس نے یہ ترتیب دی ہے؟ اکثر عیسائی مستشرقین نے اس پر بڑی لے دے کی ہے اور یہ ثابت کرنے کے لیے بڑے جتن کیے ہیں کہ موجودہ ترتیب زمانہ نبوت میں نہیں دی گئی بلکہ اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو یوں مرتب کیا ہے۔ آیئے حقائق کی روشنی میں ان کے اس مفروضہ کا جائزہ لیں۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق قرآن کی سورتوں اور سورتوں کی آیتوں کو مرتب فرمایا اور یہ موجودہ ترتیب وہی ہے، اس کے لیے متعدد دلائل ہیں جن میں سے چند ایک اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہدیہ ناظرین ہیں:

ا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ (القیامہ)

''یعنی قرآن کو جمع کرنا اور اسے پڑھنا ہمارے ذمہ ہے اور جب ہم پڑھ چکیں تو آپ اس پڑھے ہوئے کی اتباع کریں''۔

اب آپ سوچیں کہ کیا ترتیب کے بغیر جمع قرآن کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ کیا کسی مخصوص ترتیب کے بغیر اس کی تلاوت ممکن ہے؟ جب جمع کرنے اور پڑھنے کے لیے اس کا مرتب ہونا ضروری ہے تو معلوم ہوا کہ جس ذات پاک کے ذمہ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہے، اسی نے اس کو مرتب فرمایا ہے۔

(ب) تاریخی لحاظ سے آپ سوچیے، عہد رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآنِ کریم یاد تھا۔ بعض کو کچھ سورتیں اور بعض کو سارا قرآن۔ صحابہ کرام نماز میں اور اس کے باہر اس کی تلاوت کیا کرتے۔ حضور رحمت عالمیاں ﷺ خود بھی نمازِ تہجد میں، دوسری نمازوں میں، عام خطبات میں کثرت سے قرآنِ کریم کی قرأت فرماتے اور حضور کی قرأت و ترتیب صحابہ رضی اللہ عنہم کی قرأت و ترتیب میں قطعاً سر موفرق نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ امور ہیں جن سے کوئی بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ نے اسے حکم الٰہی سے مرتب نہیں فرمایا تھا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کیسے اس کو حفظ کر سکتے تھے؟ کیسے اس کی تلاوت ان کے لیے ممکن تھی اور اگر حضور ﷺ کی مقررہ ترتیب نہیں تھی تو ہر ایک کی قرأت دوسرے سے مختلف ہونی چاہیے تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا، تو ثابت ہوا کہ قرآن کریم عہد رسالت میں مکمل طور پر مرتب فرما دیا گیا تھا اور تمام صحابہ اس کی پیروی اور پابندی کیا کرتے تھے، اس لیے عیسائی متعصبین کا یہ شور و غوغا قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتا۔ وَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ۔

آدابِ تلاوت

قرآنِ حکیم، کتابِ ہدایت ہے۔ اس کی تلاوت کا مقصد دل بہلانا اور وقت گزارنا نہیں بلکہ اس کا مقصد اولین تعمیر انسانیت اور تشکیل سیرت ہے۔ اور یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب پڑھنے والے کو اس کتابِ عزیز سے دلی لگاؤ اور طبعی ربط پیدا ہو جائے۔ اس لگاؤ اور ربط کو پیدا کرنے کے لیے حکمائے اسلام نے چند آداب اور شرائط بتائے ہیں جن کی پابندی کرنے سے قرآنِ کریم سے فیض یاب ہونے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ میں انہیں قارئین کرام کے فائدے کے لیے العارف الکامل حجۃ الاسلام الامام محمد بن محمد بن محمد بن احمد الغزالی کی شہرہ آفاق کتاب احیاء علوم الدین سے استفادہ کرتے ہوئے مختصراً قلمبند کرتا ہوں۔

۱۔ قاری کے لیے ضروری ہے کہ باوضو ہو۔ قبلہ رو کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بڑے ادب و سکون کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کرے۔

۲۔ مقدارِ قرأت: بعض لوگ دن رات میں ایک مرتبہ، بعض دو مرتبہ اور بعض تین مرتبہ بھی قرآن ختم کرتے ہیں اور بعض ایک ماہ میں ایک مرتبہ اور بعض ہفتہ میں ایک بار، کیونکہ قرأتِ قرآن کا مدعا اس کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس سے ہدایت حاصل کرنا ہے اور ایک دن میں اسے ختم کرنے سے یہ مدعا پورا نہیں ہوتا، اس لیے اس کو مکروہ کہا گیا۔ اَلْخَتْمُ فِیْ یَوْمٍ وَّ لَیْلَةٍ قَدْ کَرِهَهٗ جَمَاعَةٌ (احیاء) حضور کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

Marfat.com

مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ لَمْ یَفْقَهْهُ۔

''یعنی جس نے تین دن سے کم وقت میں قرآن ختم کیا، اس نے اسے سمجھا ہی نہیں''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ارشاد نبوی ﷺ یہی تھا کہ وہ ہفتہ میں قرآن ختم کیا کریں۔ چنانچہ حضرات عثمان، زید بن ثابت، ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی معمول تھا۔

۳۔ ترتیل: ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ پڑھنا، کیونکہ ایسی صورت میں انسان آیات میں غور کر سکتا ہے۔

۴۔ رحمت عالم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

اُتْلُوا الْقُرْاٰنَ وَابْكُوْا فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا۔

''قرآن کریم پڑھو اور روؤ اور اگر رونا نہ آئے تو بہ تکلف رونے کی کوشش کرو''۔

کیونکہ گریہ وزاری سے ہی انسان رحمت الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

۵۔ جو آیت پڑھے، اس کا حق ادا کرے۔ یعنی آیت تسبیح و تکبیر پڑھے تو خود بھی سُبْحَانَ اللّٰهِ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہے۔ اگر دعا و استغفار کی آیت تلاوت کرے، تو اپنے لیے بھی دعا مانگے اور مغفرت طلب کرے۔ اگر کسی آیت میں انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر ہے، تو ان کے لیے دست سوال دراز کرے۔ اگر کہیں عذاب و مصیبت کا تذکرہ آئے تو اپنے لیے پناہ مانگے۔ اگر آیت سجدہ پڑھے یا سنے تو سجدہ کرے، غرضیکہ جس مضمون کی آیت پڑھے اسی قسم کے تاثر کا اظہار کرے۔

۶۔ تلاوت شروع کرتے وقت یہ پڑھے:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَ اَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ۔

اور جب تلاوت ختم کرنے لگے تو یہ کہے:

صَدَقَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَ بَلَّغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ انْفَعْنَا بِهٖ

وَ بَارَکَ اللّٰهُ لَنَا فِیْهِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْحَیَّ الْقَیُّوْم۔

۷۔ پڑھتے وقت آواز کو اتنا بلند کرے کہ کم از کم خود سن سکے۔ اس سے زیادہ بلند آواز سے قرأت اگر کسی دوسرے شخص کے لیے تکلیف دہ نہ ہو تو محبوب ہے ورنہ مکروہ۔

۸۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ۔

''خوش آوازی سے قرآن کو مزین و آراستہ کرو''۔

دوسری حدیث شریف میں ہے:

قَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ۔

''یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو قرآن کو خوش الحانی سے نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

اس لیے تکلف و تصنع کے بغیر جتنا ممکن ہو خوش الحانی سے پڑھے تا کہ خود بھی اور سننے والے بھی اس کی قرأت سے لطف اندوز ہوں۔

ان کے علاوہ چند باطنی آداب و شرائط ہیں جن کا التزام باعث ہزار برکت و سعادت ہے:

ا۔ پڑھنے والے کا دل و دماغ اس مقدس کتاب کی عظمت اور اس کے نازل فرمانے والے کی عظمت سے لبریز ہو۔ اسے یہ احساس ہو کہ یہ کتاب کوئی معمولی کتاب نہیں ہے۔ اس کو انسان نے تصنیف نہیں کیا بلکہ یہ خالق جن و بشر، مالک بحر و بر، رب السموات والارض احکم الحاکمین کا کلام معجز نظام ہے، جو اس نے ازراہِ غایت بندہ پروری اور اپنے بندوں کی ہدایت پذیری کے لیے اپنے محبوب و برگزیدہ بندے خاتم الانبیاء والمرسلین، رحمۃ للعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب منیر پر نازل فرمایا ہے۔

ب۔ دل کو تمام وسوسوں اور اندیشوں سے پاک کر کے بڑی یکسوئی اور حضور قلب سے اس کی تلاوت میں مشغول ہو۔

Marfat.com

ج۔ فکر و تدبر کی جملہ صلاحیتوں کو اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بروئے کار لائے تا کہ رحمت الٰہی اس کے شوق و طلب کی بے قراریوں پر رحم فرماتے ہوئے اس کے لیے فیوضِ قرآنی کے دروازے کھول دے۔

د۔ نفس اور نفس کی پیدا کردہ خواہشیں اور مصلحتیں، غلطی اور جہالت سے جگہ پکڑے ہوئے نظریات اور اعتقادات، ماحول کی مجبوریاں اور گناہوں کی نحوستیں، بسا اوقات قرآن فہمی کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ قرآن کے حیات بخش چشمہ تک پہنچنے والے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایک رکاوٹ کو پیوند خاک کرے اور مردانہ وار آگے بڑھتا چلا جائے۔ قرآن کے سحابِ کرم سے عرفان کے جو قطرے اس کی کشت ایمان پر ٹپکنے لگیں ان کی راہ میں کسی چیز کو حائل نہ ہونے دے۔

ہ۔ قرآن فہمی کے لیے صرف اپنی فہم و ذکاء اور علم و دانش پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید پر اعتماد کرے اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی اور دستگیری کے لیے بصد عجز و نیاز التجا کرتا رہے۔

وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ ۝ (المومن)

''یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہی (اس صحیفۂ رشد و ہدایت سے) نصیحت قبول کرتا ہے''۔

تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝ (ق)

''اپنے رب کی طرف مائل ہونے والے ہر بندے کے لیے یہ کتاب بصیرت افروز اور نصیحت ہے''۔

Marfat.com

اسلام دین فطرت

6رجولائی 1980ءکو برمنگھم (انگلینڈ) میں ہونے
والی عظیم الشان سنی کانفرنس سے
حضرت ضیاء الامت پیرمحمد کرم شاہ الازہری
کا تاریخی خطاب

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للّٰه رب العالمين والصلٰوة والسلام علٰى سيد المرسلين و علٰى آلہٖ واصحابه اجمعين۔ قال اللّٰه تعالٰى وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا

آج جب کہ علم نے اسرارِ کائنات کو بے نقاب کر دیا ہے، سائنس کروں اور فضاؤں کو مسخر کرنے کے بعد خلاؤں کی تسخیر کی مہم سر کر چکی ہے، جب عقل کی جولانیاں کائنات کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی کوشش کر رہی ہیں، جب ہر ترقی یافتہ ملک نے فہم و دانش کی قندیلیں روشن کر کے اپنی زندگی کی اندھیری رات میں چراغاں کر دیا ہے، جب دنیا کے دانشور اپنی نکتہ سنجیوں کے باعث حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں میں اپنی فتح کے علم گاڑ چکے ہیں، ہم مسلمان کیوں مصر ہیں کہ ہم چودہ صدیاں پرانے دین اسلام کو ضرور نافذ کریں گے؟ ہم اپنی ساری زندگی کو نظامِ مصطفٰی علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثناء کے سانچے میں ہی ڈھالیں گے۔

کہیں ہماری یہ ضد نادان بچوں کی سی بے جا ضد تو نہیں، ہم کسی ایسے تعصب کا شکار تو نہیں، جس نے حقیقت کے روئے زیبا کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہو؟ ہم اپنی قومی انا کے اندھے پرستار بن کر تو ایسا نہیں کہہ رہے؟ جدید تہذیب سے ہمیں خدا واسطے کا کوئی بیر تو نہیں جس کے باعث ہم اس سے بیزار ہیں، یا جو مطالبہ ہم کر رہے ہیں اس میں واقعی وزن ہے؟ نظامِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حقیقتاً ہماری فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ جب اس کے نور سے ہمارا آنگن روشن ہوگا تو یہ جہاں بقعۂ نور بن جائے گا۔ صرف عالم اسلام کا مقدر ہی نہیں جاگے گا، بلکہ دنیائے انسانیت کی قسمت بدل جائے گی۔

یہ ہیں وہ سوالات جو اقوامِ عالم کے دل میں ہمارے بارے میں اٹھتے رہتے ہیں۔ یہ وہ

شکوک وشبہات ہیں جو ہماری نئی نسل کی ذہنی پریشانی اور اضطراب کا باعث بنتے رہتے ہیں۔

اقوامِ عالم کے سوالات کا تسلی بخش جواب دینا اور اپنے نوجوانوں کے شکوک کا ازالہ کرنا ان لوگوں کا اولین فرض ہے، جو اسلام کو رب العالمین کا بھیجا ہوا اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین سمجھتے ہیں۔ اگرچہ تمام مسلمانوں پر یہ ذمہ داری یکساں ہے، لیکن اہل پاکستان ان سوالات کا جواب دینے کے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے بیسویں صدی میں ایک آزاد وطن کا محض اس لیے مطالبہ کیا تھا کہ وہاں عملاً نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نافذ کرنا چاہتے ہیں اور اس مدعا کو پانے کے لیے انہوں نے جانوں، عصمتوں، اموال واملاک کی ایسی قربانیاں ہنستے مسکراتے پیش کیں، جن کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

آج کا یہ اجتماع ایک ایسے ملک میں منعقد ہو رہا ہے جو جدید سائنس، صنعتی علوم اور جملہ فنون کا منبع ہے اور مغربی تہذیب وثقافت کا نمائندہ مرکز ہے۔ نیز اس اجتماع کے انعقاد کا اہتمام امت مسلمہ کے سوادِ اعظم اہل سنت نے کیا ہے، جو اسلام کے کسی ایک جزو کے ترجمان نہیں بلکہ کل اسلام کے علم بردار ہیں۔ عقائد، خواہ ان کا تعلق توحید باری تعالیٰ سے ہو یا نبوت ومقامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہو، ان کا تعلق عظمت اہل بیت سے ہو یا صحابہ کرام کی شانِ رفعت سے، ان جملہ عقائد کے ترجمان اہل سنت ہیں۔ اعمال فقہی ہوں یا اخلاقی، روحانی ہوں یا عسکری، ان سب کی افادیت پر یہ ایمان بھی رکھتے ہیں اور ان کے نگہبان بھی ہیں۔ جن کے مایہ ناز اسلاف نے علم وحکمت کے خیابانوں میں تحقیق کے وہ پھول کھلائے ہیں، جن کی مہک سے دنیا کی دانش گاہیں معطر ہیں۔ جن کے غازیوں نے مشرق ومغرب کے وہ قلعے مسخر کیے، جہاں کوئی فاتح اپنا پرچم نہ لہرا سکا۔

ان حالات کے پیش نظر بین الاقوامی سنی کانفرنس کا پلیٹ فارم موزوں ترین جگہ ہے، جہاں سے ان سوالات کا جواب دیا جانا چاہیے۔

حاضرین کرام! میں پورے وثوق سے اعلان کرتا ہوں کہ اہل پاکستان نے نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفاذ کا نعرہ کسی اندھی عقیدت، وقتی جوش، بیجا تعصب یا کسی نظریۂ حیات

Marfat.com

سے جاہلانہ عداوت اور احمقانہ مخاصمت کی بناء پر نہیں لگایا تھا، بلکہ انہوں نے عصر حاضر کے نظریات کا منصفانہ تجزیہ کیا۔ انسانیت کے لیے انہیں تباہ کن پایا اور بے جھجک انہیں مسترد کر دیا۔ وقت کی تنگ دامانی تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اشارات پر ہی اکتفا کروں گا۔ داناؤں کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

آج کل جن نظریات کی شوکت وسطوت سے سارا عالم گونج رہا ہے، وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظریات ہیں۔ بظاہر یہ دونوں نظام جدا جدا ہیں جو باہم متصادم بھی ہیں اور بسا اوقات متحارب بھی، لیکن اگر دقت نظر سے دیکھا جائے، تو ان کی حقیقت و ماہیت بھی ایک ہے اور ان کے مبداء و مآل میں بھی چنداں تفاوت نہیں۔ دونوں کا سر چشمہ الحاد ہے اور مطمع نظر مادی ترقی ہے۔ دونوں ایک خالق حکیم کے منکر ہیں اور زیادہ سے زیادہ مادی آسائشوں کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک بس یہی دنیوی زندگی ہے۔ اخروی زندگی کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں۔ از راہ انصاف آپ خود ہی بتائیے کہ جن نظریات کا منبع شرک اور الحاد ہوگا، کیا وہاں اعتدال کہیں نظر آئے گا؟ افراط و تفریط کے جھکڑ کبھی بلندی پر اور کبھی پستی پر پٹخ رہے ہوں گے۔ لندن کا وہ گنبد (پلینٹیریم) جس میں مصنوعی سورج، چاند اور ستاروں کے طلوع و غروب کے مناظر دکھائے جاتے ہیں، لوگ اس کے بارے میں تو یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں ماہر انجینئر نے اس کی تعمیر و تکمیل میں حصہ لیا، لیکن زمین کے قرص زمردیں، اس کے فلک بوس پہاڑ، یہ نیلگوں بے کراں سمندر، آسمان کا یہ گنبد نیلوفری، اس میں حقیقی مہر و ماہ کا طلوع و غروب، اس میں فروزاں ان گنت ضیا بار قندیلیں، ان کی پختگی اور حیران کن باہمی نظم وضبط، کیا کسی خالق حکیم کے بغیر معرض وجود میں آسکتا ہے؟ جو عقل اس روشن حقیقت کا عرفان حاصل کرنے سے قاصر ہے، زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کے لیے اس پر کیوں کر کلیۃً انحصار کیا جاسکتا ہے۔

جو لوگ حیات اخروی کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ دنیا کا نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ ہمارے سامنے سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں ہیں کہ

Marfat.com

اسمگلر، چور بازاری کرنے والے، قمار باز، قزاق اور ظالم، عیش و عشرت اور عزت و احترام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور قوم و وطن کے مخلص خادم، علم اور ثقافت کے بے لوث خدمت گار، بنی نوع انسان کے سچے خیر خواہ، مفلسی، غربت، ذلت اور گمنامی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم بھی کوئی ہوسکتا ہے کہ زمانے کے نمرود و فرعون تو اورنگ شاہی پر بیٹھیں اور اپنے شبستانوں میں عمر بھر دادِ عیش دیتے رہیں اور خلیل و کلیم کے پیرو دھکے کھاتے رہیں اور اس ایک ایکٹ پر زندگی کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اگرچہ اپنی روشن آیات اور واضح دلائل کے باعث اظہر من الشمس ہے، پھر بھی حواس و عقل کی رسائی سے ماورا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں انسان نے خود اپنے بارے میں کیا کیا گلفشانیاں کی ہیں؟ اپنے بارے میں اس کے نظریات کے تضاد اور افکار کی بے اعتدالیوں کا کیا عالم ہے؟

ہم یونان اور روم کے عہد قدیم اور ان کے نظریات کو بیان کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ جبکہ انسان اپنے دیوتاؤں سے برسر پیکار رہتا تھا۔ ان کے اختیارات چھیننے، ان کو مسند اقتدار سے محروم کرنے کے لیے ہمیشہ سازشیں کرتا رہتا تھا۔ ہم عہد جدید کے مفکرین کی آراء کا اجمالی تذکرہ کریں گے۔ اس سے فکر انسانی کی بے اعتدالیوں کا آپ بہ آسانی اندازہ لگا سکیں گے۔

قسطنطین قیصر روم کے سہارے عیسائیت نے جب یورپ میں اپنے قدم جمائے تو اس نے انسان کو ایک پیدائشی گنہگار کے روپ میں پیش کیا اور اس کی بخشش کے لیے خداوند کے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کو سولی پر چڑھا کر کفارہ کا عجیب و غریب نظریہ پیش کیا۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں جب عیسائیت کے خلاف شدید ردعمل رونما ہوا، تو ایک ایسے دور کا آغاز ہوا، جسے یورپ کی تاریخ میں روشن دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وقت کے فلسفیوں نے عقل کو کائنات اور زندگی کے تمام معاملات میں "حکم" تسلیم کیا۔ اس کے فیصلے کو قطعی اور آخری فیصلہ مانا گیا۔ ہر وہ چیز خواہ وہ خدا کی ذات کیوں نہ ہوں، جو عقل

Marfat.com

کے ظرف میں سمانہیں سکتی اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ اس طرح مذہب کو زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے خاتمہ سے یہ روشن دور بھی اپنی انتہا کو پہنچا۔ انیسویں صدی کے اہل فکر نے عقل اور انسان دونوں کا قصہ پاک کر دیا۔ فلسفہ نے بتایا کہ مادہ ہی خدا ہے، مادہ ہی عقل کو پیدا کرتا ہے۔ اب انسان کی الوہیت اور عقل انسانی کی حاکمیت کا دور ختم ہو گیا۔ نیچر خدا بن گئی اور انسان اس کا بندہ۔

اس کے بعد ڈارون آیا۔ اس نے انسان کے بارے میں ایک بالکل جدید نقطہ نظر پیش کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ انسان، حیوان ہے۔ اس کے درمیان اور دیگر بے خرد اور بے شعور حیوانات کے درمیان چند ارتقائی کڑیوں کا فرق ہے۔ اس طرح انسانی شرف و کرامت کی ساری خلعتیں تار تار ہو گئیں۔ انسان کے ارد گرد تقدس کا جو ہالہ تھا، وہ کافور ہو گیا۔ ڈارون کے اس نظریہ کو توقع سے زیادہ قبول عام نصیب ہوا۔ اس نظریہ کی مقبولیت کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس کی کوئی علمی یا سائنسی بنیاد تھی، جس پر اس نظریہ کا محل تعمیر کیا گیا۔ ڈارون کے مداح بھی اس کی لغویت کو جانتے تھے۔ ''جیولین ہیکسلے'' جو ڈارون کا پر جوش مبلغ تھا، اس نے بھی ڈارون کے اس نظریہ کو جوں کا توں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت ہے کہ جن خلیوں سے انسان کا جسم مرتب ہے، وہ ان خلیوں سے یکسر مختلف ہیں جو دیگر حیوانات کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ محض کلیسا سے نفرت ڈارون کے نظریہ کی مقبولیت کا سبب بنی۔ لوگ کلیسا اور اس کے ناقابل فہم عقائد سے یوں دلبرداشتہ تھے کہ وہ ہر اس نظریہ کو بے تابی سے خوش آمدید کہتے، جس سے کلیسا کا وقار مجروح ہو اور اس کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑے۔

انسان کے ساتھ یہ مذاق یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ یہودی، جو اپنے آپ کو خدا کی پسندیدہ قوم یقین کرتے اور باقی اقوام عالم کو گدھا تصور کرتے ہیں اور ان کو دبوچ کر ان پر سواری کرنا اپنا حق جانتے ہیں، انہوں نے ڈارون کے نظریہ کو مزید مضحکہ خیز بنانے کے لیے اپنی دانش، قوتِ استدلال اور اہل یورپ کی مذہب سے بیزاری اور کلیسا سے برہمی کا فائدہ اٹھا

Marfat.com

کر انسان کو مزید ذلت کی پستیوں میں گرا دیا۔

اس سلسلہ میں تین یہودی علماء کی کاوشیں ساری انسانیت کو ذلیل کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ کارل مارکس نے کہا کہ انسان ذرائع پیداوار کے رحم و کرم پر ہے۔ اسباب معیشت میں جب تبدیلی آتی ہے تو انسانی اخلاق و کردار میں بھی از خود تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ جو اعمال پسندیدہ اور قابل ستائش ہوتے ہیں اس تبدیلی سے فرسودہ اور بیہودہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اخلاقی قدروں کو اٹل اور غیر متبدل سمجھنا جہالت اور نادانی ہے۔ اس کے اس نظریہ نے ان تمام اخلاقی اقدار کو خاک میں ملا دیا، جو انسان کی ابتدائے آفرینش سے اب تک مقدس اور محترم سمجھی جاتی تھیں۔

دوسرا یہودی عالم ''سگمنڈ فرائیڈ'' آگے بڑھا اور اس نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کرنے کے لیے اپنی ابلیسی ذہانت اور زور قلم صرف کر دیا کہ انسان کے جملہ اعمال کا سرچشمہ جنسی شہوات کی تسکین کا جذبہ ہے۔ اس ظالم نے ان جلیل القدر ہستیوں کے عظیم کارناموں کی ایسی بھونڈی تاویلیں کیں، جس سے انسان اس غلط فہمی میں بہ آسانی مبتلا ہو جاتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے عظیم کارنامے بھی جنسی شہوات کی صدائے بازگشت ہیں۔ اس نے معصوم بچے کے دودھ پینے، انگوٹھا چوسنے، ماں سے لپٹ جانے جیسے اعمال کو بھی جنسی عشق کی تکمیل کا نام دیا ہے۔ یوں انسانیت کو اس کی مسند رفیع سے دھکا دے کر حیوانیت کے گہرے گڑھے میں پھینک دیا۔

اس کے بعد اجتماعیت کے مورچہ سے تیسرے یہودی عالم ''ڈرکائم'' نے گولہ باری شروع کی اور کہا کہ شادی کی رسم نہ صرف یہ کہ لغو ہے بلکہ انسانیت کے خلاف سنگین جرم اور گناہ ہے۔

وہی انسان جو کبھی حق کو سربلند کرنے کے لیے جان کی بازی لگاتا ہوا نظر آتا تھا، انسانی فلاح و بہبود کے لیے اپنے مادی وسائل اور ذہنی صلاحیتیں وقف کر دیا کرتا تھا، جس کی عفت قلب و نگاہ پر ملائکہ کا تقدس نثار تھا، گاؤخر کی طرح اب صرف شکم اور نفس کی شہوتوں کا اسیر بن

Marfat.com

کر رہ گیا۔ اس کی تمام علمی اور سائنسی تگ ودو اسی ایک نقطہ کے گرد گردش کرنے لگی۔

ان تمام نظریات کے برعکس اسلام نے انسان کو نہ اپنے مقام سے بڑھا کر الوہیت کی مسند پر بٹھایا، نہ اسے گرا کر ذلیل حیوان بنایا، بلکہ بتایا کہ اللہ کی زمین پر یہ اس کا خلیفہ ہے۔ اس کے سر پر لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل: ۷۰) کا تاج سجایا۔ اس کی بے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں سے یہ کہہ کر پردہ اٹھایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (التین) اس کا خمیر مٹی سے اٹھا۔ اسے فقط زندگی سے بہرہ ور نہیں کیا بلکہ ادراک، آگہی اور شعور کی دولت سے اس کا دامن بھر دیا۔ اس عالم رنگ و بو کو اس کی قوتوں کی جولان گاہ بنا دیا۔ ارشاد ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (جاثیہ)

"اللہ وہ ہے جس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے سمندر کو تاکہ رواں رہیں اس میں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ بحری تجارت سے تلاش کرو اس کا فضل اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ اور اس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ "سب کا سب اپنے حکم سے" بے شک اس نظام میں نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کیا کرتے ہیں"۔

انسان کے رہوارِ شوق و تحقیق کو یہ کہہ کر ایسی مہمیز لگائی کہ وہ کہیں رکتا ہی نہیں۔ ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (النحل)

"اور اللہ تعالیٰ نے مسخر کر دیا تمہارے لیے رات دن، سورج اور چاند کو اور تمام ستارے بھی اس کے حکم کے پابند ہیں۔ بے شک ان تمام چیزوں میں قدرتِ الٰہی کی

Marfat.com

نشانیاں ہیں، اس قوم کے لیے جو دانش مند ہو''۔

اتنی بے انداز صلاحیتیں اور بے پناہ قوتیں دینے کے بعد انسان کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا تا کہ اس کی بغاوتوں اور سرکشیوں سے زندگی جہنم نہ بن جائے، بلکہ یوم حساب کی آمد کی اطلاع دے کر اس میں ذمہ داری اور جواب دہی کی شمع روشن کر دی تا کہ ہر عمل سے پہلے، وہ اس پر مترتب ہونے والے نیک و بد نتائج کا اندازہ کر لے۔ اگر اس کائنات کو حادثہ اور اتفاق کی پیداوار قرار دیا جائے تو اس کا کوئی مقصد نہیں ہوگا۔ زندگی کا کارواں بغیر منزل کے وقت کے بیابان میں دھکے کھاتا رہے گا اور انسان پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے اس کی منزل چھین لی جائے اور اس کے اعمال کو نتائج سے بیگانہ کر دیا جائے۔

انسان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انسان کا رشتہ وحی الٰہی سے ٹوٹا، وہ افراط و تفریط کا شکار ہو گیا۔ جب حقیقت انسان کے بارے میں عقل کی ٹھوکروں کا یہ حال ہے تو دوسرے انسانی مسائل کے بارے میں اس کی لغزشیں بعید از قیاس نہیں۔

فرد اور معاشرہ کا باہمی تعلق کیا ہے؟

انسانی سوسائٹی میں عورت کا مقام کیا ہے؟

گناہ کیا ہے؟

خیر و شر کا کیا معیار ہے؟

حاکم اور رعایا میں تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

دولت کی آفرینش میں سرمایہ اور محنت کا کتنا کتنا حصہ ہے؟

اسی طرح کے کئی دیگر مسائل ہیں۔ ہم یہاں صرف چند مسائل کے بارے میں بحث کریں گے۔

یورپ میں تحریک احیائے علوم سے پہلے وہاں کا عام شہری دوہری غلامی کے شکنجوں میں کراہ رہا تھا۔ ایک طرف کلیسا کی جابرانہ مذہبی بالادستی تھی، دوسری طرف جاگیردار کی معاشی برتری تھی۔ ہر شخص اربابِ کلیسا کو اپنی پیداوار کا ایک حصہ دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ

Marfat.com

اس بات کا بھی پابند تھا کہ وہ کلیسا کی زمینوں میں بطورِ بیگار کام کرے اور کلیسا کی جنگوں میں بطورِ رضا کار شریک ہو۔ جاگیردار کا گویا یہ زرخرید غلام تھا۔ دن رات بے زبان جانوروں کی طرح یہ اس کے کھیتوں میں جتا رہتا۔ ایک جاگیردار کی زمین چھوڑ کر وہ نہ کسی دوسرے جاگیردار کے پاس جا سکتا تھا، نہ کوئی دوسرا پیشہ اپنا سکتا تھا۔ جب کوئی جاگیردار زمین فروخت کرتا تو کسان بھی زمین کے ساتھ نئے مالک کے قبضہ میں منتقل ہو جاتا۔

نشاۃ ثانیہ نے کلیسا کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیا۔ صنعتی انقلاب نے جاگیرداروں کی بالادستی کا خاتمہ کر دیا۔ دوہری غلامی سے یہ آزادی یورپ کے عام شہری کو بڑی مشکل اور دیر کے بعد میسر آئی تھی۔ اس لیے اس نے فرد کی آزادی کے گیت گانے شروع کر دیے۔ وہاں کوئی ایسی قوت نہ تھی جو اس آزادی کو آئین کا پابند بنا کر راہِ راست پر گامزن کر دیتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ہر شخص من مانی کرنے لگا۔ حکومت کو بھی اجازت نہ تھی کہ فرد کی آزادی میں مخل ہو۔ اس کا یہ فرض تھا کہ اگر کوئی شخص یا ادارہ فرد کی آزادی میں مخل ہو تو اس کو ایسا کرنے سے روکے۔ آزادی کی اس لہر سے عوام کو صرف شراب پینے کی، جوا کھیلنے کی، محفل رقص و سرود میں شرکت کرنے کی اور ہر طرح کی بدکاری کی آزادی ملی، لیکن سرمایہ دار نے عوام کی اس غفلت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ معاشی لوٹ کھسوٹ کی آزادی حاصل کر کے اس نے انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا۔ اسے سود لینے کی اور حسب منشا اس کی شرح مقرر کرنے کی آزادی تھی۔ اسے دلکش اور نظر فریب قمار خانے تعمیر کرنے اور اس میں سادہ لوح عوام کو جوا کھیلنے کے رنگ برنگے مواقع فراہم کر کے انہیں لوٹنے کی آزادی تھی، مزدور کا استحصال کرنے کی آزادی تھی۔

اس نے سینما بنائے اور ان میں عریاں اور انتہائی اشتعال انگیز فلمیں دکھا کر لوگوں کے اخلاق کو برباد کرنا شروع کر دیا۔ سب اسی آزادی کی دیوی کے قصیدے گا رہے تھے۔ ادیب اپنے افسانوں، ڈراموں اور ناولوں میں اس کی تقدیس بیان کر رہے تھے۔ غرض انفرادیت پرستی کا ایک ایسا جھکڑ چلنے لگا، جس نے معاشرہ کی تمام اخلاقی قدریں پامال کر

Marfat.com

دیں، لیکن کسی کو اف کرنے کی مجال نہ تھی۔

قوم کا سرمایہ چند حریص اور عیار سرمایہ داروں کے قبضہ میں آ رہا تھا۔ عوام اور مزدور شراب میں مست ہو کر رات بھر رقص کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہودی ساہوکاران کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ رہا تھا۔ معاشرہ غریب اور امیر میں تیزی سے بٹنے لگا۔ فرد کی یہ مادر پدر آزادی اپنے جلو میں بربادیوں، محرومیوں اور مایوسیوں کا لشکر جرار لے کر تباہی مچا رہی تھی، یہاں تک کہ صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فضا آہوں اور سسکیوں سے بھر گئی، اب اس کا ردعمل شروع ہوا۔ سود خوروں، سٹہ بازوں اور صنعتی اجارہ داروں کے خلاف نفرت اور عداوت کا ایک طوفان امڈ آیا۔ کارل مارکس یہودی نے آگے بڑھ کر اسے فلسفیانہ بنیاد اور دلائل و براہین کا انبار مہیا کر دیا۔ یوں کیمونزم نے اجتماعیت کا پرچم لہرایا اور اس کی قربان گاہ پر فرد کو اس کی تمام عزیز اقدار سمیت بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

فرد کو ہر قسم کی ملکیت کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اظہارِ خیال، تقریر و تحریر کی آزادی سلب کر لی گئی۔ یوں فرد کی وہ ساری انانیت اور نخرے خاک میں مل گئے۔ وہ معاشرے کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا۔ ان بدلے ہوئے حالات میں فرد کا مفاد پیش نظر نہیں ہو گا بلکہ معاشرہ کا مفاد پیش نظر ہو گا۔ اب فرد کی مرضی نہیں چلے گی، معاشرہ کی مرضی چلے گی۔ درحقیقت معاشرہ کا لفظ تو محض ایک دھوکا اور فریب تھا جس کے پردے میں پرولتاری آمریت اپنے بے پایاں اختیارات کے ساتھ فرد کی بیخ کنی میں سرگرمِ عمل تھی۔ جہاں بھی اشتراکیت کے سبز قدم پہنچے، انسانی خون کے دریا بہہ گئے۔ سائبیریا کے برفانی جنگل دانشوروں، پروفیسروں، انجینئروں، سائنس دانوں، قانون دانوں اور عوام کے جم غفیر سے بھر گئے۔ جہاں موسم کی چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ نامناسب غذا، طبی سہولتوں کے فقدان، کیمپوں کے افسران کی سنگدلیوں کے باعث ہزاروں نہیں لاکھوں قیمتی افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

حاضرین کرام! کاروانِ انسانیت کی قیادت کا رشتہ جب بھی وحی الٰہی سے چھوٹا اور عقل زیاں اندیش نے اس کی زمام اپنے ہاتھ میں لی، افراط و تفریط کی ان بھول بھلیوں میں

Marfat.com

ہی وہ ٹھوکریں کھاتا رہا۔ کبھی ذاتی مفادات کے خارزاروں میں الجھ کر رہ گیا اور کبھی اجتماعی مفاد کی تند لہریں اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئیں۔

اسلام نے جہاں خود انسان کے بارے میں ایک متوازن نظریہ پیش کیا جو عین حقیقت تھا۔ اسی طرح فرد اور معاشرہ میں ایسا ربط باہم قائم کیا کہ نہ افراد کی چیرہ دستیاں معاشرہ کے مفادات کو پامال کر سکتی ہیں اور نہ معاشرہ کا عفریت فرد کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما میں حائل ہو سکتا ہے۔ اسلام نے فرد کا احترام کیا، اس کو اپنی مرضی کے مطابق پروان چڑھنے کی اجازت دی۔ اس کو کمانے اور کھانے کی آزادی مرحمت کی، لیکن یہ آزادی مادر پدر آزادی نہیں، بلکہ اس کے لیے حدود مقرر کیں۔ وسائل معیشت میں حلال و حرام کا امتیاز قائم کیا ہے تاکہ کوئی کسی کی مجبوری، ناواقفی اور سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ سود، جوا، بے جا نفع خوری، چور بازاری، اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی نیز ایسی صنعتیں جن کا مقصد ہی انسان کے شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے، ان سب کو ممنوع قرار دیا۔ جہاں تک فرد کی اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے کا تعلق ہے، وہ آزاد ہے۔ اس کی آزاد محنت سے کمائے ہوئے سرمائے کے حقوق ہیں، جن کی حفاظت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے اس کے بھائی کے جائز حقوق پر زد پڑتی ہو یا معاشرہ کا مفاد مجروح ہوتا ہو۔

ایک اور پیچیدہ مسئلہ مرد و زن کا باہمی تعلق ہے۔ یہاں بھی ہمیں عقل انسانی قلابازیاں کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عورت کے بارے میں اہل خرد کے نظریات کا اتار چڑھاؤ بڑا ہی کرب انگیز ہے۔ کبھی اسے مرد کے غلام کی حیثیت دی گئی۔ مرد کی خدمت اور آسائش اس کا مقصد حیات تھا۔ یونان کے فلسفی تو برسوں اس مسئلہ پر بحث کرتے رہے کہ عورت ذی روح بھی ہے یا نہیں۔ اسے گناہ اور برائی کی دعوت دینے والی یعنی شیطانِ مردود قرار دیا گیا۔

رومی اپنے ابتدائی دور میں اسے اپنے خاوند کی غلام تصور کرتے۔ بعض حالات میں خاوند کو اجازت تھی کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کر دے۔ آہستہ آہستہ عورت کی حیثیت بڑھتی گئی۔

Marfat.com

یہاں تک کہ سارا رومی معاشرہ اس کے اشارۂ ابرو پر رقص کرنے لگا۔ نکاح کی اہمیت ختم ہوتی گئی۔ بات بات پر طلاق دینے کا عام رواج ہو گیا۔ عورتیں بار بار شادی کرنے کو سرمایۂ افتخار سمجھنے لگیں۔ "سینٹ جردم" ایک با کمال عورت کا ذکر کرتا ہے، جس نے آخری بار تیسویں شادی کی اور اپنے شوہر کی اکیسویں بیوی تھی۔ نکاح کے بغیر ازدواجی تعلقات قائم کرنا معیوب نہ رہا۔ فسق و فجور کا سیلاب امڈ کر آ گیا۔ شاہی خاندانوں میں بھی ایسے حکمران گزرے، جنہوں نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو اپنے شبستانِ عشرت کی زینت بنا لیا تھا۔ قحبہ گری کا پیشہ معیوب نہ رہا۔ رومیوں میں فلورا نامی کھیل از حد مقبول تھا، کیونکہ اس میں ننگی دوشیزائیں دوڑ میں شریک ہوتی تھیں۔ مالدار بیویاں اپنے شوہروں کو بھاری شرحِ سود پر قرضہ دیا کرتی تھیں۔

اس بے راہروی کے دور میں قسطنطین کی سرپرستی میں عیسائیت نے یورپ میں قدم رکھا اور ایک نئے ردِعمل کا آغاز ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے۔ اس کا عورت ہونا ہی شرمناک ہے۔ اس کو اپنے حسن و جمال پر اترانا نہیں، شرمانا چاہیے۔ "طرطولیاں" جو ابتدائی دور کے ائمہ مسیحیت میں سے تھا کہتا ہے:

"عورت شیطان کے آنے کا دروازہ ہے، وہ شجرِ ممنوعہ کی طرف پہنچانے والی، خدا کے قانون توڑنے والی اور خدا کی تصویر، مرد کو غارت کرنے والی ہے"۔

"کرائی سوسٹم" جو مسیحیت کے اولیاء کبار میں شمار ہوتا ہے، عورت کے حق میں کہتا ہے:

"ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک غارت گر دلربائی، ایک آراستہ مصیبت"۔

یہی نہیں، بلکہ مرد و عورت کا صنفی تعلق خواہ نکاح سے ہو، بجائے خود ایک نجاست اور قابلِ اعتراض چیز بن گیا۔ مذہبی زندگی کے لیے ضروری ہو گیا کہ انسان نکاح نہ کرے۔ اگر نکاح کر لیا ہو تو قرابت سے باز رہے۔ مذہبی انجمنوں نے یہ قانون پاس کیا کہ چرچ کے عہدہ دار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے بھی نہ ملیں۔ چرچ کے تہوار میں وہ مرد اور عورت شریک

Marfat.com

نہیں ہو سکتے تھے، جنہوں نے پہلی رات ایک ساتھ گزاری ہو۔ اس راہبانہ تصور نے خاندانی تعلق حتیٰ کہ ماں اور بیٹے کے تعلق میں بھی تلخی گھول دی۔

صدیوں عورت نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی۔ وہ نہ اپنے باپ کی وارث ہوسکتی تھی، نہ اپنے خاوند کی، نہ اپنے بیٹے کی۔ اسے یہ حق ہی نہ تھا کہ کسی جائیداد کی مالک بن سکے۔ کلیسا نے فطرتِ انسانی کے جبلی تقاضوں کے سامنے بند باندھنے کی جو کوشش کی تھی، اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی۔ لٹے ہوئے جذبات سیلاب بن کر امڈے اور ان خانقاہوں کے تقدس کو بھی خاروخس کی طرح بہا کر لے گئے، جہاں مقدس راہب اور مقدس راہبات اس نجاست سے دامن بچانے کے لیے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ راہبوں کی خانقاہیں جنسی آلودگیوں میں یوں مبتلا ہو گئیں کہ ان کی سرانڈ سے دماغ پھٹنے لگے۔ آخر جب نشاۃ ثانیہ سے کلیسا کی گرفت ڈھیلی پڑی تو ان غیر فطری پابندیوں کے خلاف بڑی شدت سے ردعمل رونما ہوا۔

انیسویں صدی میں ڈارون نے انسان کو حیوان ثابت کر کے پرانی اخلاقی قدروں کو روند ڈالا۔ لذت گیری اور شہوت رانی زندگی کا مقصد اعلیٰ بن گئی۔ فرائیڈ نے یہودیوں کی عالمی سازش کے تحت انسان کو جنسی شہوات کا صید زبوں ثابت کیا۔

انسانی تخلیق کا مقدس فریضہ بھی مرد وزن کی آزاد خواہشات کی راہ میں حائل ہوا تو اسے بھی اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ ضبط تولید کے نت نئے طریقے ایجاد کیے جانے لگے۔ لائق فائق ڈاکٹروں کی ٹیمیں سارے کام چھوڑ کر ایسی مؤثر دوائیں بنانے میں منہمک ہو گئیں جن کے استعمال سے پیدائش اطفال کے عمل کو مؤثر طور پر روکا جا سکے۔ جہاں یہ سارے حربے ناکام ثابت ہوئے وہاں کنواری ماؤں کو اسقاطِ حمل کی قانونی اجازت دے دی گئی۔ اور ہسپتالوں میں ایسے شعبے کھولے گئے جو صرف اس کام کے لیے ہی مخصوص ہیں۔ اس کام کے کم وکیف کی تفصیلات ہوشربا ہیں۔ صرف ایک مثال بطورِ نمونہ سماعت فرمائیے۔

۲۷ مارچ ۱۹۷۳ء کی صبح سوا چھ بجے بی بی سی لندن نے یہ خبر سنائی:

''آج برطانیہ کے شہر ''نوٹنگھم'' میں پچاس ہزار افراد نے حمل گرانے کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ ہسپتالوں سے جمع کردہ اعداد بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء میں ایک لاکھ انسٹھ ہزار دو صد پچاس حمل گرائے گئے تھے۔ یہ سب کنواری لڑکیوں کے تھے۔ روزانہ اوسط چار صد پچاس بنتی ہے۔ یہ ان بچوں کے علاوہ تھے جنہیں یا تو دوشیزہ ماؤں نے خود رکھ لیا تھا یا سرکاری پرورش گاہوں میں بھجوا دیا تھا''۔

مغرب کے علماء اس جنسی عمل کو عین حیاتیاتی عمل بتاتے ہیں۔ جب خواہش پیدا ہو، اسے پورا کر لینا چاہیے، ورنہ طرح طرح کی نفسیاتی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ عمل بعینہٖ اس طرح ہے جس طرح کسی کو پیاس لگے، وہ پانی کا گلاس پی لے یا بھوک لگے تو کھانا کھا لے۔ وہ ہم پر خفا ہوتے ہیں کہ تم لوگوں نے اس سادہ سے حیاتیاتی عمل میں اخلاق کو گھسیڑ دیا ہے اور اس کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ یہ ابلہی اور حماقت کیونکہ اہل مغرب سے سرزد ہوئی ہے، اس لیے اسے ابلہی اور حماقت کہنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟

بے شک یہ دانائی اور خردمندی ہے۔ اس میں صرف مرد کی خود غرضی کا زہر ملا ہوا ہے۔ مرد عورت کی سادہ لوحی کا پہلے بھی استحصال کرتا رہا، اب جبکہ اس کی خودی بیدار ہو رہی ہے، اسے اچھے کپڑے پہنا کر، وسائل زینت سے آراستہ کر کے، نائٹ کلبوں میں شب بھر گھومنے کی آزادی دے کر، رقص گاہوں میں اسے مصروف رقص رہنے کی اجازت دے کر، مرد آج بھی اس مسکینہ کے بھولے پن سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مانا کہ بے مروت مرد تو اس حیاتیاتی عمل سے فارغ ہو کر، دامن جھاڑ کر چلا گیا، لیکن کبھی کسی نے اس صنف نازک کا بھی خیال کیا کہ اس عمل سے اس کی زندگی کن کن خطرات میں گھر جاتی ہے؟ ضبط تولید کی دوائیں اگر مؤثر بھی ثابت ہوں، تو ان کا خطرناک ردعمل بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ اس سے اس مظلومہ کو کون بچائے گا؟ باوجود کوشش کے اگر حمل ٹھہر گیا تو اسقاطِ حمل کا مرحلہ کتنا جانگسل ہوتا ہے۔ اگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور بچے نے جنم لے لیا تو اس کو شفقت پدری اور آغوشِ مادری کون مہیا کرے گا؟ سرکاری پرورش گاہیں مانا، سب سہولتیں فراہم

Marfat.com

کرتی ہیں۔ لیکن ماں کا پیار تو نہیں دے سکتیں۔ نیز اس تہذیب کے اثرات تو ان ملکوں میں بھی تیزی سے پھیل رہے ہیں، جہاں لوگوں کو بنیادی ضرورتیں بھی میسر نہیں، چہ جائیکہ ان سہولتوں کے بارے میں سوچا جائے۔

کوریا اور ویت نام میں امریکہ کے فوجی، آوارہ بچوں کے جو لشکر ہائے جرار چھوڑ کر آئے ہیں، ان کی حالت زار پر کبھی آپ کی آنکھ نمناک ہوئی؟ کیا یہ مسئلہ اتنا سادہ ہے جتنا پیاسے کے لیے ایک گلاس پانی یا بھوکے کے لیے ایک ڈبل روٹی؟ سنگدلی اور کند ذہنی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔

اسلام نے اس نازک اور پیچیدہ مسئلہ کو جس عمدگی اور فطری سادگی سے حل کیا ہے، یہ اس کے دین فطرت ہونے کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ اسلام نے عورت کی فطرت کے متعلق بحث کی ہے۔ اسے انسانیت کے لحاظ سے مرد کا ہم پایہ قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت کے مجموعہ کو اسلام ایک وحدت سمجھتا ہے، جس سے انسانی معاشرہ کا قصر رفیع تعمیر ہوتا ہے۔ یوں ان تمام نظریات کو باطل قرار دے دیا، جو عورت کو مرد سے انسانی نقطہ نظر سے فروتر سمجھتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء:1)

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے، جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اس سے جوڑا اس کا۔ اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں)۔"

اس بات کا بھی اعلان کر دیا کہ اپنے خالق اور پروردگار سے مرد اور عورت کا تعلق یکساں نوعیت کا ہے۔ عورت بھی اپنے اعمالِ صالحہ کے لیے اس کی بارگاہ سے اس اجر اور انعام کی مستحق ہے جس کا حق مرد کو پہنچتا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم

Marfat.com

مِّنۢ بَعۡضٍ (آل عمران۔ ۱۹۵)

"تو قبول فرمالی ان کی التجا، ان کے پروردگار نے (اور فرمایا) میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ بعض تمہارا جزء ہے بعض کی"۔

پھر اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک صنف دوسری صنف کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ بعینہٖ وہی فائدہ دوسری صنف پہلی صنف سے حاصل کرتی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ۔ ۱۸۷)

"عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"۔

اس لحاظ سے دونوں کے حقوق و فرائض مساوی ہیں۔ پھر لباس کی تعبیر کتنی معنی خیز ہے۔ مختصر الفاظ میں لباس پردہ ہے، ہر عیب کو چھپاتا ہے، زینت ہے، حسن و جمال کو نکھارتا ہے، راحت ہے، سردی اور گرمی سے بچاتا ہے۔ کیا ایک اچھی بیوی اپنے خاوند کے لیے اور ایک اچھا خاوند اپنی بیوی کے لیے پردہ، زینت اور راحت نہیں؟ یقیناً ہے۔ جس ملت کے ہر گھر میں زوجیت کا یہ بلند تصور اور اعلیٰ معیار ہو اس کے لیے یہ دنیا جنت نہیں تو اور کیا ہے؟ (ضیاء القرآن)

ایک دوسری آیت میں مرد اور عورت کے تعلقات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ (الروم)

"اور اس کی قدرت کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں تاکہ تم سکون حاصل کرو ان سے۔ اور پیدا فرمائے تمہارے درمیان محبت اور رحمت کے جذبات۔ بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔

اور جب سے ہم نے آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کا رویہ ترک کر دیا ہے، ہماری زندگی کے

Marfat.com

گلشن میں کھلنے والے پھول، رنگ اور مہک، دونوں سے محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔

عورت کے لیے کسب معاش کا حق تسلیم کیا۔ فرمایا:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء: ۳۲)

''مردوں کے لیے حصہ اس سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے حصہ اس سے جو انہوں نے کمایا''۔

اس کے لیے حق ملکیت ثابت کیا ہے اور اس کو اپنے باپ، خاوند اور دیگر قریبی رشتہ داروں کا مردوں کی طرح وارث بنایا۔ ارشاد گرامی ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿﴾ (النساء)

''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ یا رشتہ دار، اس ترکہ میں سے جو تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے''۔

انسانی زندگی کے چند گوشے اور وہ بھی بڑے اختصار کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ عقل انسانی نے ان مسائل کو حل کرنے میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں، ان کا بھی آپ نے مشاہدہ فرمایا۔ اس کی فکری بے راہروی سے کس طرح انسان، انسانیت کے منصب جلیل سے گر کر حیوان کی جنسی آلودگی کی دلدل میں پھنس کر رہ گیا۔ اس کی زندگی سے وابستہ مسائل بڑی بے دردی سے افراط و تفریط کی قربان گاہ پر ذبح کیے جاتے رہے۔ ہر بار انسان نے اس ظلم کو ہی حق و عدل سمجھا اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے اپنے تمام وسائل اثر و رسوخ اور قوت و جبروت کو بڑے شرح صدر سے استعمال کیا۔ کشتوں کے پشتے لگا دیے، خون کے دریا بہا دیے، آبادیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ یہ بربریت، یہ چنگیزیت، انسان کی مشکلات کو حل کرنے کے نیک جذبہ کے تحت روا رکھی گئی۔ اس کے باوجود کوئی گرہ کھلی نہیں، بلکہ اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں۔

Marfat.com

اس کے برعکس اسلام نے انسان کے بارے میں جو نقطہ نظر بیان کیا، اس کے پیچیدہ مسائل کو جس سادگی اور آسانی سے حل کیا، اس کو بھی آپ ملاحظہ فرما چکے۔ یہاں آپ کو افراط وتفریط کا کہیں نشان بھی نہیں ملے گا۔ ایک ظلم کو مٹانے کے لیے اس سے بھی زیادہ ظلم کو جائز نہیں رکھا گیا۔ ایک کو حق دلانے کے لیے دوسرے کی حق تلفی نہیں کی گئی۔ پھر اس دین حق کے نبی کریم رءوف رحیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل آپ کو "امین" بنایا گیا۔ زیب عنوان آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرۃ۔ ۱۴۳)

اے غلامانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے تمہیں ایک ایسی امت بنایا، جو راہِ اعتدال پر گامزن ہے۔ جس کا دامن افراط وتفریط کے بدنما داغوں سے آلودہ نہیں۔ جس کے نظامِ حیات میں عقل کی قلابازیوں کے المناک مناظر دیکھنے میں نہیں آتے اور اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی صراحت کر دی کہ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس نظامِ حیات کے مطابق ایسا معاشرہ وجود میں لاؤ، جس میں ایسے پاکیزہ نفوس آباد ہوں، جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی محبت کی شمع فروزاں ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے خلوص اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہوں۔ جس معاشرہ کے افراد روشن دماغ بھی ہوں اور روشن ضمیر بھی۔ عدل اور مساوات کے جاں پرور، روح افروز مناظر قدم قدم پر دامن نگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہے ہوں۔ جہاں نہ کوئی مظلوم ہو نہ ظالم۔ مادی ترقی بھی اپنے عروج پر ہو اور دنیائے روحانیت میں بھی بہار کا سماں ہو۔ وہاں بسنے والے دولت مند سخی اور کریم ہوں اور فقراء خوددار اور بے نیاز ہوں۔ تب ہی تمہاری گواہی قابل قبول ہو گی اور اس قسم کی گواہی ادا کرنے کی ذمہ داری ہم پر عائد کی گئی ہے۔ لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ:143) میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

اسی مقصد کے لیے لاکھوں نوجوانوں نے پاکستان کے حصول کے لیے سروں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ اپنے معصوم بچوں کو دشمنوں کی تلواروں کی دھار پر کٹتے دیکھا تھا اور

وہ خوش تھے کہ انہوں نے بندگی کا حق ادا کر دیا۔ ان کے اس خلوص نے ہمیں پاکستان جیسا عظیم ملک دیا۔ اس کو اس نہج پر آباد کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے ہم اہل سنت، نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں اور جب تک اس منزل تک رسائی حاصل نہ کر لیں، اس وقت تک آرام کا سانس لینا ہمارے لیے جائز نہیں۔

وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ:143) فرما کر بتا دیا کہ میرے اس دین کی حقانیت کا سب سے بڑا گواہ میرا محبوب اور برگزیدہ بندہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، جن کو میں نے اولین و آخرین کا رسول بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی حقانیت اور سچائی کے گواہ ہیں، اسی طرح قیامت کے روز اپنی امت کے اعمال حسنہ کی بھی گواہی دیں گے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گواہی پر ہی امت کی نجات اور بخشش کا دارومدار ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان کلمات کی کیا بصیرت افروز تفسیر فرمائی ہے۔ اپنی تفسیر ''فتح العزیز'' میں لکھتے ہیں۔

باشد رسولِ شما بر شما گواہ زیراں کہ او مطلع است بنور نبوت بر رتبہٴ ہر متدین بدین خود، کہ در کدام درجہ در دین من رسیدہ و حقیقت ایمانِ او چیست؟ وحجابے کہ براں از ترقی محجوب ماندہ است کدام است؟ پس اومی شناسد گناہاں شمارا و درجاتِ ایمان شمارا و اعمال نیک و بد شمارا و اخلاص و نفاق شمارا (1)

''تمہارا رسول تم پر گواہی دے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں اپنی نبوت کے نور سے اپنے دین کے ہر ماننے والے کے رتبہ کو کہ میرے دین میں اس کا کیا درجہ ہے؟ اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کون سا پردہ ہے جس سے اس کی ترقی رکی ہوئی ہے؟ پس وہ تمہارے گناہوں کو بھی پہچانتے ہیں، تمہارے ایمان کے درجات کو بھی، تمہارے نیک و بد سارے اعمال کو، تمہارے اخلاص اور نفاق کو بھی خوب پہچانتے ہیں''۔

1۔ فتح العزیز، پارہ دوم، صفحہ 436

Marfat.com

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں حسن وخوبی سے انجام دیں، تا کہ اسلام کے بارے میں دشمنانِ اسلام کی پھیلائی ہوئی طرح طرح کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے اور لوگ اس چشمہ فیض سے فیضیاب ہو سکیں اور قیامت کے دن بھی ہم اللہ کی جناب میں سرخروئی حاصل کر سکیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

Marfat.com

عدل وانصاف

قرآن کریم کی روشنی میں

حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ ایم اے (الازہر)
نے یہ مقالہ 5/جون کو شام ہمدرد کے ایک بارونق اور پروقار
اجتماع میں سنایا۔ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل لاہور میں منعقد ہونے
والے اس اجتماع کا اہتمام محترم حکیم محمد سعید دہلوی (ستارۂ امتیاز)
نے کیا اور صدارت جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس نے کی

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَحۡمَةٍ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ۔

عدل وانصاف زندگی کی بوقلموں رعنائیوں اور دلآویزیوں کی جان ہے۔ اگر عدل و انصاف کے سوتے خشک ہو جائیں تو سارا گلشن ہستی اجڑ کر رہ جائے۔ یہ ایک عالمگیر صداقت ہے، جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے اور جسے ہر کوئی تسلیم کرتا ہے، حتی کہ وہ ظالم اور سفاک لوگ جن کی بربریت اور ستم رانیوں نے شرف انسانیت کی دھجیاں اڑا دیں، وہ بھی یہ نہیں کہہ سکے کہ عدل وانصاف سے ظلم وعدوان بہتر ہے، بلکہ جہاں تک ان سے بن پڑا، وہ اپنی چیرہ دستیوں کو بھی عدل وانصاف کا لباس پہنا کر پیش کرتے رہے۔

محترم جناب حکیم محمد سعید صاحب مدظلہ العالی نے مجھے ارشاد فرمایا ہے کہ میں اس باوقار محفل میں قرآنِ کریم کی روشنی میں عدل وانصاف کے موضوع پر اظہارِ خیال کروں۔ اس عزت افزائی کے لیے میں ان کا از حد ممنون ہوں۔ خدا کرے میں ان کے حسن ظن پر پورا اتر سکوں۔

جب ہم اقوامِ عالم کے دساتیر اور قوانین پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو بجز حیرت وحسرت کے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حیرت اس لیے کہ انسانی عقل نے انہیں قبول کیونکر کیا اور حسرت اس بات پر کہ بے کس انسانیت پر عدل کے نام پر کتنے ظلم ہوتے رہے۔ ہر معاشرہ میں ہمیں جھوٹے امتیازات اور ظالمانہ مراعات کے صنم کدے آباد نظر آتے ہیں۔ اور لوگ ہیں کہ فرطِ عقیدت سے ان کے گرد مصروف طواف ہیں، جہاں یہ حالت ہو وہاں عدل و انصاف کا فرضی وجود تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کا حقیقی وجود نہیں پایا جا سکتا جو خیرات وبرکات کا سرچشمہ ہے، جس کے گھنے اور خنک سائے میں ستم رسیدہ انسانوں کو سکون نصیب ہوتا ہے۔

تین سو سال قبل مسیح بھارت میں برہمنی تہذیب اپنے شباب پر تھی۔ اسی زمانہ میں ہندی

Marfat.com

معاشرہ کے لیے ایک دستور مرتب کیا گیا، جس میں سیاسی، تمدنی اور اخلاقی قواعد وضوابط کی وضاحت کر دی گئی۔ ملک بھر کے دانشوروں نے اسے بہ نظر استحسان دیکھا اور اسے ایک قانونی دستاویز کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہندو دھرم کے پرستار اپنے تمام معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اس دستور کے مصنف ہیں منوجی، اور انہی کے نام پر اس کتاب کو منوشاستر کہا جاتا ہے۔ اس متفقہ طور پر منظور شدہ قانونی اور آئینی دستاویز نے اہالیانِ ہند کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کا مقالہ نگار BRAHMANISM کے عنوان میں رقمطراز ہے۔

منوجی کے مرتب کردہ صحیفۂ قانون کو ایک آسمانی تقدس حاصل ہو گیا۔ اس کے قوانین ہر شک وشبہ سے بالاتر اور تنقید سے ماوراء تھے۔ منوشاستر میں تمام طبقات کی درجہ بندی کر دی گئی اور تفصیل سے ہر طبقہ کے فرائض بیان کر دیئے گئے اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزائیں بھی مقرر کر دی گئیں۔ (ج ۳ ص ۱۰۱۲) مقالہ نگار کے یہ جملے آپ کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں:

on the contrary, the offences committed by Brahmans against other castes are treated with remarkable jemency, whilst the punishments inflicted for trespasses on the rights of heigher classes are the more severe and in human the lower the offender stands in the social scale.

Encyclopaedia Britannica Volume 3 Page 1012 Printed London.

یعنی جرائم کا ارتکاب اگر برہمن کریں تو ان کی سزاؤں میں غیر معمولی نرمی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اگر نچلے طبقے کا کوئی فرد اعلیٰ طبقہ کے حقوق کو پامال کرے تو اس کے لیے بڑی وحشیانہ

Marfat.com

اور غیر انسانی سزائیں مقرر ہیں۔ معاشرہ میں مجرم کا درجہ جتنا گھٹیا ہو، اتنی ہی سزا اسے سخت دی جاتی ہے۔

اس کتاب کے دوسرے صفحہ پر مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ منو کے آئین کے مطابق شودروں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا بھی حق حاصل نہیں، ایسا اجتماع جس میں نیچ قوم کا کوئی فرد موجود ہو، وہاں برہمن کو بھی اجازت نہیں کہ وہ مقدس کتابوں کی تلاوت کرے۔

ایک ہی قوم کے افراد میں قانون کی یہ ناہمواری عدل و انصاف کے تصور کو ہی ختم کر دیتی ہے۔ ابوریحان البیرونی نے اپنی زندگی کے پندرہ قیمتی سال ہندو معاشرہ کے مطالعہ میں صرف کیے۔ پھر بڑی دیانت اور ثقاہت کے ساتھ اپنی تصنیف ''کتاب الہند'' میں اپنے مشاہدات کو قلمبند کر دیا۔ اس کی نگارشات کو ہندو فضلاء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ایسے ثقہ مؤرخ کا یہ اقتباس آپ کے لیے یقیناً مفید ہوگا۔ شودر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شودر کی حیثیت برہمن کے غلام کی ہے۔ اس کو برہمن کے کام میں مصروف رہنا اور اس کی خدمت کرنا چاہیے۔ ہر وہ کام جو برہمن ہی کے واسطے مخصوص ہے، مثلاً مالا جپنا، وید پڑھنا اور آگ کی قربانی، شودر کے لیے منع ہے۔ اگر شودر یا ویش کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے وید پڑھا ہے تو برہمن اس کی اطلاع حاکم کو دے اور حاکم اس کی زبان کاٹ دے''۔ (کتاب الہند ص ۵۰ ۳ سنگ میل لاہور)

اسی طرح البیرونی تیسویں باب میں سزاؤں اور کفاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جرم کی یہ حالت ہے کہ اگر قاتل برہمن ہے مقتول دوسروں طبقہ کا تو قاتل پر کفارہ کے سوا کوئی سزا لازم نہیں ہے''۔ (الہند ص ۷ ۷ ۳)

جناب عبدالمجید سالک اپنی کتاب ''مسلم ثقافت'' میں لکھتے ہیں:

''اگر کوئی برہمن کسی دوسری ذات کے آدمی کو قتل کر دیتا تو اس کو صرف برت، پرارتھنا اور دان پن کرنا پڑتا۔ اس کے سوا اسے کوئی سزا نہ دی جاتی۔ دوسرے جرائم یہ تھے۔ گاؤ ہتھیا، شراب خوری، زنا کاری، خاص کر اپنے باپ کی بیوی یا گورو کی استری کے ساتھ، لیکن

کوئی راجہ ان جرائم کی وجہ سے کسی برہمن یا کھشتری کو سزائے موت نہ دیتا تھا، بلکہ اس کی جائیداد ضبط کر کے اسے ملک بدر کر دیتا''۔

سالک صاحب منوسمرتی، باب اول منتر نمبر ۹۲ تا ۱۰۱ کے حوالہ سے برہمن کی برتری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منوجی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دنیا میں برہمن سے زیادہ برتر کوئی نہیں ہے۔ وہ دھرم کی مورت، نجات کا حقدار اور دھرم کے خزانے کا محافظ ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے سب برہمن کے لیے ہے''۔

منوسمرتی کے آٹھویں باب منتر ۳۶۴ میں مذکور ہے:

''زنا بالجبر کی سزا قطع عضو تناسل ہے لیکن برہمن کو یہ سزا بھی نہ دی جائے کیونکہ اس کو سزائے جسمانی دینا قطعاً ممنوع ہے''۔

مختلف طبقات میں جو ظالمانہ امتیازات موجود تھے ان کا مختصر سا خاکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، لیکن ایک طبقہ کے مرد وزن کے حقوق بھی یکساں نہ تھے۔ یہاں بھی بین تفاوت تھا اور اسے قانون کی پشت پناہی حاصل تھی۔ عورت خاوند کے تابع مہمل کی حیثیت رکھتی تھی۔ خاوند اسے جوئے میں داؤ پر لگا سکتا تھا اور جوا ہارنے والے کی عورت، جیتنے والے کے تصرف میں چلی جاتی تھی اور قانون کو اس ظالمانہ طریقہ کار پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ عورت جائیداد کی کامل مالک نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر کوئی عورت عنفوانِ شباب میں ہی بیوہ ہو جاتی تو اسے دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے بیوگی کی بے آبرومندانہ زندگی بسر کرنا پڑتی یا اپنے جوان سینے میں اپنی جواں امنگوں کو دبائے اس الاؤ میں کود جانا پڑتا جس میں اس کے خاوند کی لاش جل رہی ہوتی۔

حقوق و فرائض میں اس ظالمانہ تفاوت کو اہل ہند نے صدق دل سے تسلیم کر لیا تھا۔ کیا ایسے معاشرہ میں عدل و انصاف کی بالادستی قائم کی جا سکتی ہے؟ اگر اسی ظلم و عدوان کو کوئی عدل و انصاف کہنے پر مصر ہو تو ہم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔

ایران ہزاروں سال تک مشرقی دنیا کی مسند قیادت پر متمکن رہا۔ طبقاتی تقسیم، جس کی چیرہ دستیوں کی المناک داستان بھی آپ سن آئے ہیں، ایران میں بھی پوری قوت اور شدت کے ساتھ موجود تھی۔ ہندوستان میں برہمن کے ہاتھ صرف اقتدار تھا، کاروبار سلطنت اور تاج وتخت کے مالک راجے مہاراجے ہوا کرتے تھے۔ یہاں مذہبی اور سیاسی دونوں اقتدار بیک وقت ساسانی خاندان میں مرکوز تھے۔ اہل ایران کا یہ عقیدہ تھا کہ ساسانی فرماں روا اس شاہانہ شان وشوکت کے نمائندے ہیں جو انہیں ہرمز (خدا) نے عطا کی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹیانیکا جلد ۱۷ صفحہ ۵۶۴ پر مرقوم ہے:

''اہل ایران کی روایات میں ہے کہ یہ آسمانی حکومت ایران میں صرف اسی خاندان کو عطا ہوئی ہے۔ کوئی دوسرا ایرانی اس شرف میں ان کا مساہم نہیں ہوسکتا۔ ان کے تراشے ہوئے مجسموں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اردشیر اول یا شاپور اول ہرمز کے ساتھ ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہیں اور یہ خدا، بادشاہ کو شہنشاہی کی انگوٹھی پہنا رہا ہے۔ اسی وجہ سے ایرانیوں کے نزدیک بادشاہی اس خاندان کا موروثی حق ہے کیونکہ ہرمز نے فقط اسی خاندان کو شہنشاہی کی انگوٹھی پہنائی ہے اور صرف اسی خاندان کو اپنی خدائی طاقتوں سے سرفراز کیا ہے''۔

علامہ ابن جریر طبری نے بھی ایرانیوں کے اس نظریہ کو بیان کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:

''ایرانی اپنے بادشاہوں کو ہر قانون سے بالاتر اور ہر تنقید سے ماوراخیال کرتے تھے''۔

اب ذرا یونان کی اس سرزمین کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائیے جہاں فلسفہ پیدا ہوا اور جس کی فضاؤں میں پروان چڑھا اور اپنے نامور فرزندوں کی عظیم کوششوں کے باعث یونانی فلسفہ کی روشنی سے نہ صرف یورپ بلکہ ایشیا اور شمالی افریقہ کے دور افتادہ ممالک کے درو دیوار بھی جگمگانے لگے۔ یونان کو بجا طور پر ناز ہے کہ اس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے نابغہ روزگار فلاسفر پیدا کیے جن کی عبقریت اور غیر معمولی ذہانت کو دنیا بھر کے دانشور خراج پیش کرتے رہے ہیں اور پیش کررہے ہیں لیکن جب ہم دقت نظر سے ان عظیم دانشوروں کی

Marfat.com

تعلیمات کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرتے ہیں، تو ان کی اچھی باتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں ایسے خرافات بھی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر عقل انسانی کی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ابونصر فارابی جو یونانی فلسفہ کا بہترین ترجمان اور قابل اعتماد مفسر ہے، اس نے اپنے رسالہ میں افلاطون اور ارسطو کی آراء و نظریات میں تضاد دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس رسالہ کا نام "کتاب الجمع بین رای الحکیمین" ہے۔ میرے پاس اس کا وہ نسخہ ہے جو مطبع کاتولیکیہ بیروت نے بڑی تحقیق اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کا مقدمہ لبنان یونیورسٹی کے دکتور البیر نصری نادر نے لکھا ہے جو وہاں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر مذکور اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"افلاطون سے جب پوچھا گیا کہ ہم اپنے شہر کا نظم ونسق کس طرح چلائیں تاکہ وہ آبادی اور خوشحالی میں بامِ عروج تک پہنچ جائے اور اس میں عدل وانصاف کے تمام قواعد پر عمل ہو سکے؟

اس کے جواب میں افلاطون کہتا ہے کہ اس کے لیے اس شہر کے باشندوں کو تین طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔ حکام، لشکر اور عوام الناس۔ پہلے دو طبقے اس مثالی شہر کے نگہبان ہیں۔ داخلی انتشار اور بیرونی حملوں سے بچانا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے ان دو طبقوں کی طرف خصوصی توجہ دی جائے اور ان کی خصوصی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ افلاطون پھر تاکید کرتا ہے کہ ان طبقوں کو ہر قسم کی مالی پریشانیوں سے بچانا حکومت کا فرض ہے۔ اس طرح حکومت پر لازم ہے کہ ان کے دلوں سے خاندانی جذبات کی بیخ کنی کر دے اور انہیں اپنا علیحدہ خاندان بنانے سے قانونی طور پر روک دے۔ حکومت کو خوشگوار اوقات میں ایسے مذہبی تہوار منعقد کرنے چاہئیں، جن میں یہ چنے ہوئے مرد، صحت و جمال میں ہر طرح ممتاز عورتوں کے ساتھ وقتی طور پر رشتۂ ازدواج قائم کر سکیں اور اس کا مقصد صرف حکومت کے لیے بہترین بچوں کا پیدا کرنا ہو۔ جب وہ عورتیں بچے جنیں تو ان بچوں کو ان سے لے لیا جائے اور تمام بچوں کو ایک مکان میں رکھا جائے۔ وہ عورتیں آ کر انہیں دودھ پلائیں اور کوئی

Marfat.com

عورت یہ امتیاز نہ کرے کہ یہ کس کا بچہ ہے اور نہ ان کو پہچان سکے۔ اس طرح اس طبقہ میں کوئی مخصوص رشتہ داری نہیں پائی جائے گی۔ وہ سب ایک خاندان کے افراد شمار ہوں گے۔ سب کے ساتھ یکساں نوعیت کی قرابت ہوگی"۔

آخر میں افلاطون جیسا فیلسوف کہتا ہے کہ یہ آزادانہ اختلاط کرنے والے مرد اور عورتیں ممتاز صلاحیتوں کے مالک ہوں گے اور ان کی اولاد بھی یقیناً دوسرے لوگوں سے برتر و اعلیٰ ہوگی۔ (کتاب الجمع صفحہ ۱۶،۱۷)

افلاطون جیسے فلسفی کے یہ خیالات پڑھ کر سر چکرانے لگتا ہے۔ کیا یہ وہ شخص ہے جس کی علمیت اور حکمت کا ڈنکا چار وانگ عالم میں بج رہا ہے؟ کیا یہ وہ شخص ہے جسے دنیا حکیم اور فیلسوف کہتی ہے؟ کیا انسانی نفسیات سے اس کی بے خبری کا یہ عالم ہے؟

ذرا آگے بڑھیے۔ افلاطون کے فلسفہ کے ایک گوشہ سے نقاب الٹیے۔ وہاں افلاطون حکیم کی بجائے آپ کو ایک جلاد نظر آئے گا، جس کا دل رحمت و شفقت کے جذبات سے یکسر عاری ہے۔ جس کے سامنے عدل و انصاف کی بات کرنا بھی ان الفاظ کی توہین ہے۔ پروفیسر مذکور ہی کے الفاظ میں افلاطون کے اس نظریہ کو ملاحظہ فرمائیے:

فَاِنْ وُلِدَ لِلشَّعْبِ وَلِلْحُرَّاسِ اَطْفَالٌ فِیْ غَیْرِ زَمَنِ الْمُحَدَّدِ اُعْدِمُوْا وَ کَذٰلِکَ یُعْدَمُ الطِّفْلُ نَاقِصُ التَّکْوِیْنِ وَالْوَلَدُ فَاسِدُ الْاَخْلَاقِ وَالرَّجُلُ الضَّعِیْفُ عَدِیْمُ النَّفْعِ وَالْمَرِیْضُ الَّذِیْ لَا یُرْجٰی لَهٗ شِفَاءٌ لِاَنَّ الْغَایَةَ هِیَ اَنْ یَظَلَّ عَدَدُ السُّکَّانِ فِی الْمُسْتَوِی الَّذِیْ یَکْفُلُ سَعَادَةَ الْمَدِیْنَةِ۔

(کتاب الجمع۔ ص ۱۸، الکاثولیکیۃ بیروت)

"اگر عوام الناس اور اہل لشکر کے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے اور مقررہ وقت میں وہ پیدا نہ ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ بچہ جو جسمانی طور پر ناقص ہے، وہ لڑکا، جس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں، وہ کمزور مرد جس سے کوئی نفع نہیں، وہ بیمار جس کے تندرست ہونے کی کوئی امید نہیں، ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، کیونکہ

مقصد تو یہ ہے کہ اس مثالی شہر کے باشندوں کی تعداد اس سطح سے اوپر نہ ہو جن کی سعادت مندی کی ذمہ داری اٹھائی جا سکتی ہے"۔

جو فلسفی بے گناہ بچوں کو قتل، بیماروں، لاچاروں اور کمزوروں کو تہ تیغ کرنے کی یوں کھلی اجازت دے رہا ہے اور اپنے مثالی شہر میں عدل و انصاف کے قیام کی اولین بنیاد قرار دیتا ہے، اس سے عدل و انصاف کی توقع سادہ لوحی کی انتہا ہے۔

افلاطون کے بعد اس کا شاگرد ارسطو یونان کے افق پر حکمت و فلسفہ کا آفتاب بن کر طلوع ہوتا ہے اور اپنے استاد کے ان نظریات کی پرزور تردید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

فَقَدْ ظَنَّ اَفلاطُوْنُ اَنَّ شُيُوْعِيَّةَ الْاَطْفَالِ تُوَسِّعُ دَائِرَةَ التَّعَاطُفِ لٰكِنَّهَا فِي الْحَقِيْقَةِ تُؤَدِّيْ اِلَى انْتِفَاءِ الْمَحَبَّةِ وَالْاِحْتِرَامِ لِاَنَّ الطِّفْلَ الَّذِيْ هُوَ ابْنُ الْجَمِيْعِ لَيْسَ ابْنَ اَحَدٍ. (کتاب الجمع ص ۳۸)

افلاطون نے بچوں کو ان کے والدین سے منسوب کرنے کی مخالفت کی ہے اور انہیں مشترکہ ماں باپ کی اولاد قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح باہمی محبت و پیار کا دائرہ وسیع ہوگا۔ درحقیقت یہ سراپا افتراء و بہتان ہے۔ اس طرح تو محبت و احترام کے سارے جذبات نیست و نابود ہو جائیں گے، کیونکہ جو بچہ سب کا ہوتا ہے وہ کسی کا بھی نہیں ہوتا۔

ارسطو کے اپنے نظریات بھی کم تعجب انگیز نہیں۔ وہ اپنی کتاب "السیاسہ" میں نوع انسانی کی یوں تقسیم کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"بعض لوگ ایسے ہیں جو طبعاً احرار (آزاد) ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو طبعاً غلام ہوتے ہیں۔ شمالی یورپ کے لوگ بہادر ضرور ہیں لیکن ذہانت اور سیاسی سوجھ بوجھ سے بے بہرہ ہیں۔ مشرقی ممالک کے لوگ ذکی اور ماہر تو ہیں، لیکن ان میں شجاعت کا جوہر مفقود ہے، لیکن یونانی (ارسطو کی اپنی قوم) ان دونوں خصوصیتوں کے مالک ہیں۔ یہ بہادر بھی ہیں اور ذکی اور فطین بھی۔ اس کے بعد ارسطو یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

اِذًا فَالْيُوْنَانِيُّ سَيِّدٌ حُرٌّ وَالْاَجْنَبِيُّ عَبْدٌ لَهٗ وَ لَا يَسْتَعْبِدُ الْيُوْنَانِيُّ اَخَاهُ بِاَيِّ

Marfat.com

حَالٍ۔ هٰذِهِ فِكْرَةُ الشَّعْبِ الْمُخْتَارِ ظَنَّهَا اَرَسْطُوْا اَوَّلِيَّةً كُلِّيَّةً ضَرُوْرِيَّةً۔

(کتاب الجمع صفحہ ۳۸،۳۹)

یعنی مندرجہ بالا تشریح سے یہ ثابت ہو گیا کہ اہل یونان سردار ہیں، آزاد ہیں اور باقی سب ملکوں کے باشندے ان کے غلام ہیں۔ کوئی یونانی، یونانی بھائی کو غلام نہیں بنا سکتا۔ یہی وہ شعب مختار (برگزیدہ قوم) کا نظریہ ہے جسے ارسطو اولین ضرورت قرار دیتا ہے، جس کی کلیت مسلم ہے۔

جب ارسطو کے نزدیک یونانی سردار ہیں، آزاد ہیں اور باقی ساری قومیں ان کی غلام ہیں تو انسانی مساوات کا تصور کہاں سے آئے گا؟ مالک اور غلام میں، آزاد اور اسیر میں عدل وانصاف کا برقرار رکھنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اپنی قومی برتری کا یہی جنون مختلف طالع آزما لوگوں کو مختلف اوقات میں برانگیختہ کرتا رہا اور وہ اپنی سیادت و برتری کا سکہ جمانے کے خبط میں انسانیت کو مصیبتوں اور ہلاکتوں کے شعلوں میں بھونتے رہے۔ ہٹلر کے دماغ میں جرمن قوم کی برتری کا خبط سمایا ہوا تھا، جس کے باعث اس نے ساری دنیا کو دوسری عالمگیر جنگ میں جھونک دیا۔ اموال و املاک کے نقصان کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا، مرنے والوں کی تعداد کروڑوں سے زیادہ ہے۔ صرف روس کے پچھتر لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور ساڑھے اٹھائیس لاکھ جرمن لقمۂ اجل بنے۔ کسی قوم کی برتری کا نظریہ جو ارسطو نے بڑے فلسفیانہ آب و تاب سے پیش کیا، اب تک سینکڑوں فتنوں کا باعث بنا۔ معلوم نہیں کتنے سر پھرے ایسی قومی عصبیت اور برتری کا علم بلند کر کے انسانیت کو مصائب و آلام کے جہنم میں جھونکتے رہیں گے؟

یہ تو ہوا ارسطو کا سیاسی نظریہ۔ اب ذرا قانون کے بارے میں اس کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔ ارسطو کی مشہور کتاب ''السیاسۃ'' کا ترجمہ پروفیسر احمد لطفی السید نے عربی میں کیا ہے، جو مصر میں شائع ہوا ہے۔ اس کی آٹھویں باب میں ارسطو لکھتا ہے:

اِنَّ الْقَانُوْنَ لَا يَنْبَغِيْ ضَرُوْرَةً اَنْ يُّطْبَقَ اِلَّا عَلٰى اَفْرَادٍ مُّتَسَاوِيْنَ بِالْمَوْلِدِ

Marfat.com

وَ بِالْمَلَكَاتِ غَيْرَ اَنَّ الْقَانُوْنَ لَمْ يُشْرَعْ قَطُّ لِهٰؤُلَاءِ النَّاسِ الْاَفْذَاذِ اَنَّهُمْ هُمْ اَنْفُسُهُمُ الْقَانُوْنُ وَ مِنَ السُّخْرِيَّةِ اَنْ يُجَادَلَ اَخْضَاعُهُمْ لِلدُّسْتُوْرِ۔

یعنی قانون تمام اہل ملک کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کا مساویانہ انطباق صرف ان افراد پر ہوگا جو نسب اور قابلیت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ رہا حکمران طبقہ، تو ان لوگوں کے لیے قانون نہیں بنایا جاتا بلکہ یہ لوگ بذاتِ خود قانون ہیں۔ اور یہ کھلا مذاق ہے کہ ان اکابر کو دستور کی پابندی پر مجبور کیا جائے۔ (السیاسۃ ص ۲۱۷) دار الکتب مصر۔

ارسطو نے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے ایک حکایت بیان کی ہے:

خرگوشوں کا ایک جلسہ عام ہوا، جس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ تمام حیوانات میں مساوات کا قاعدہ جاری ہونا چاہیے جب شیروں نے یہ ریزولیشن سنا تو انہوں نے کہا، پہلے ہمارے جیسے طاقتور پنجے اور تیز دانت لاؤ، پھر ہمارے ساتھ مساوات کا مطالبہ کرو۔

انسانی مساوات کے نظریئے کے متعلق اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ مذاق کرنے والا ارسطو ہو تو اس مذاق کی سنگینی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ اسی کتاب کے صفحہ ۲۳۴ پر ارسطو امراء طبقہ کے تفوق کو قانونی تحفظ دیتا ہے۔ اس کی عبارت سنیے:

فَلَيْسَ مِنَ الْعَدْلِ قَتْلُ مِثْلِ هٰذَا السَّرِيِّ وَ لَا اِهْدَارُ حَقِّهٖ بِالتَّغْرِيْبِ وَ لَا اِخْضَاعُهٗ لِمُسْتَوَى الْعَامَّةِ۔

یہ عدل کے خلاف ہے کہ ایسے سردار کو کسی عامی کے بدلے میں قتل کیا جا۔ یا اسے جلا وطن کر دیا جائے اور اسے عام لوگوں کی سطح پر اترنے پر مجبور کیا جائے۔

ہندوستان میں برہمنوں کو جو قانونی امتیازات حاصل تھے، ان کے بارے میں آپ سن چکے ہیں۔ یورپ کے پادریوں کو جو خصوصی مراعات حاصل تھیں، اب ان کے بارے میں پروفیسر کینی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ پروفیسر مذکور نے کتاب کے صفحہ ۷۵ پر لکھتے ہیں:

قسیسوں اور کلیسا کے پادریوں کو بے حد و قید خصوصی امتیازات و حقوق حاصل تھے۔ ان

Marfat.com

میں سے ایک یہ تھا کہ عام عدالتوں کو ان کے محاسبہ کا اختیار نہ تھا، خواہ ان کے جرم کی نوعیت کتنی ہی سنگین ہو۔ ان کے لیے خاص عدالتیں تھیں جن کا صدر ایک پادری ہوا کرتا تھا۔ مجرم پادری کو بری ثابت کرنے کے لیے خاص وسائل سے کام لیا جاتا اور اگر اس کو بری کرنا کسی صورت میں ممکن نہ ہوتا، تو انہیں صرف یہ سزا دی جاتی کہ انہیں اپنے منصب سے گرا دیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ عرصہ کے لیے اسے قید کر دیا جاتا۔ کوئی حاکم خواہ اس کا بڑا عہدہ ہو، اس بات کا مجاز نہ تھا کہ ایسے پادری کو پھانسی کی سزا دے، جس نے ایک بے گناہ شخص کو دانستہ قتل کیا ہے۔

اب آیئے، ہادیٔ برحق نبی الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء نے تمام دنیائے انسانیت کے لیے عدل وانصاف کا جو نظام پیش کیا، قرآن کریم کی روشنی میں اس کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کس طرح ان بتوں کو پاش پاش کر دیا گیا جو سچے انصاف کے قیام میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ نیز کس طرح اس قوم کی ذہنی تربیت کی گئی جس نے اقامت عدل کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ انسانی نفسیات کا کس طرح حقیقت پسندانہ محاسبہ کیا گیا ہے۔ تعلیم و تربیت اور تنفیذ نظامِ عدل کے سارے مرحلوں کو جس عمدگی سے بیان کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر یہ یقین آ جاتا ہے کہ قرآنِ کریم واقعی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ وہ اللہ جو عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (حشر: ۲۲) ہے، جو اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ (ملک) ہے، جو اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ (بقرہ) کی شان کا مالک ہے۔

سب سے پہلے سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۳ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۳﴾ (الحجرات)

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندان بنا دیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب

Marfat.com

کچھ جاننے والا ہر چیز سے باخبر ہے"۔

دورِ جاہلیت کے عرب دیگر گوناگوں خرابیوں کے ساتھ تفاخر کی بیماری میں بری طرح مبتلا تھے۔ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر، اشرف اور اعلیٰ خیال کرتے۔ ان سب میں قریش کے فخر و مباہات کی شان ہی نرالی تھی۔ جب مکہ فتح ہوا اور اس کی فضاؤں میں پرچم اسلام لہرا دیا گیا تو نبی رحمت ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ جاؤ اور اذان دو۔ جب انہوں نے اذان دینی شروع کی، تو شرفائے قریش پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ ان کے دلی حزن و ملال کا اندازہ اس مکالمہ سے لگایئے جو ان کے چند اکابر کے درمیان ہوا۔

عتاب بن ارسید بولا: "اللہ کا شکر ہے کہ میرا باپ یہ روح فرسا منظر دیکھنے سے پہلے مرگیا"۔

حارث بن ہشام کہنے لگا کہ اس کالے کوے کے بغیر محمد (فداہ ابی و امی) کو اور کوئی مؤذن نہیں ملا۔

سہیل بن عمرو نے بڑی بے بسی سے کہا: "جیسے اللہ کی مرضی"۔

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان کے اس زعم باطل کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔

(تفسیر قرطبی ج ۱۶ ص ۳۴۱)

وطنیت، قومیت، رنگ و نسل اور زبان کے بتوں کی پوجا آج بھی بڑے زور و شور سے ہو رہی ہے۔ اس مختصر سی آیت میں ان تمام بنیادوں کو منہدم کر کے رکھ دیا۔ صرف پرہیزگاری اور تقویٰ کو وجہ عزت و افتخار مانا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ کی بنیاد پر جو معزز اور محترم ہو گا وہ فخر و غرور سے یکسر پاک ہو گا۔ ایسے شخص کا وجود نہ صرف اپنی قوم کے لیے بلکہ ساری نوع انسانی کے لیے بھی خیر و برکت کا باعث ہو گا۔ حضورِ اکرم رحمت عالم ﷺ نے مختلف مواقع پر بڑے اثر انگیز انداز میں انسانی مساوات کا درس دیا۔ فتح مکہ کے دن حضور ﷺ نے اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہو کر طواف کیا۔ مطاف اور مسجد، لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس وقت ارشاد فرمایا:

Marfat.com

یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَ تَعَظُّمَهَا بِاٰبَائِهَا۔ فَالنَّاسُ رَجُلَانِ۔ رَجُلٌ بَرٌّ تَقِيٌّ كَرِيْمٌ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰی وَ فَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيِّنٌ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰی وَ النَّاسُ بَنُوْ آدَمَ وَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ۔

(کنز العمال ج ۱ ص ۲۵۸)

اے لوگو! آج اللہ تعالیٰ نے تم سے عہد جاہلیت کی نخوت اور اپنے باپ دادا پر فخر کرنے کی عادت دور کر دی ہے۔ اب لوگوں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک وہ جو نیکو کار ہے، پرہیز گار ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز و مکرم ہے۔ دوسرا وہ شخص جو فاسق ہے، بد بخت ہے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں حقیر و ذلیل ہے۔ (سن لو) سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا فرمایا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ خطبہ بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ذرا صاحب جوامع الکلم کی فصاحت و بلاغت اور تقریر کی دلربائی و دلپذیری کی شان ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یَاَیُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَ لَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَ لَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ وَ لَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ۔ اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ۔ (کنز العمال ج ۳ ص ۹۵ التراث الاسلامیہ)

اے لوگو! خوب سن لو! تمہارا پروردگار ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر برتری حاصل ہے، نہ کوئی کالا کسی سرخ سے اور نہ کوئی سرخ کسی کالے سے افضل ہے مگر تقویٰ کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ کیا تمہیں میں نے پیغام پہنچا دیا؟ سب نے جواب دیا: بے شک۔ ارشاد فرمایا کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں، وہ ان تک یہ پیغام پہنچا دیں جو یہاں حاضر نہیں۔

اس طرح ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا گیا، جن کے باعث بہترین کوششوں کے باوجود

Marfat.com

نوعِ انسانی عدل و انصاف کی برکتوں سے بہرہ ور نہ ہو سکی۔ اب راستہ صاف ہے، ساری چٹانیں پاش پاش ہو چکی ہیں، عدل و انصاف کا گلستان آباد کرنے کے لیے زمین بالکل تیار ہے۔ فرمانِ الٰہی نازل ہوتا ہے:

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (الاعراف:29)

''اے محبوب! آپ اعلان کر دیجئے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں انصاف کروں''۔

یہ حکم کسی معمولی ہستی کا نہیں بلکہ میرے رب کا حکم ہے۔ یہ حکم کسی ایسے شخص کو نہیں دیا جا رہا جو امتثالِ امر میں سستی اور کاہلی روا رکھتا ہو۔ یہ حکم مجھے دیا جا رہا ہے جسے اپنے خالق کا بندہ ہونے پر ناز ہے اور جو ہر قیمت پر اس کے فرمان کی تعمیل کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس لیے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ میں عدل و انصاف کی تنفیذ میں کسی قسم کی کمزوری یا کوتاہی روا رکھوں گا یا کسی کے پاس خاطر کے لیے اپنے رب کے فرمان سے سرتابی کروں گا۔

اس کے بعد قرآنِ کریم کی یہ جامع آیت تلاوت فرمائیے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰ (النحل)

بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملہ) میں انصاف کرو اور ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرو اور اچھا سلوک کرو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے برے کاموں سے اور سرکشی سے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔

یہ آیت جب نازل ہوئی، تو اسلام کے کئی کینہ پرور دشمن اس کے اعجاز اور جامعیت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ حضور نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کو پڑھ کر سنائی، تو اس نے کہا: یَا ابْنَ اَخِیْ! اَعِدْ، (میرے بھتیجے! ایک بار پھر پڑھو) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے پھر پڑھا، تو وہ دشمن اسلام اور منکر قرآن یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

وَاللّٰهِ! اِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً وَ اِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً وَ اِنَّ اَصْلَهٗ لَمُوْرِقٌ وَ اَعْلَاهُ

Marfat.com

لَمُثْمِرٌ وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ بَشَرٍ (تفسیر قرطبی ج ۱۰، ص ۱۶۵)

بخدا! یہ تو بڑا شیریں کلام ہے۔ اس کا ظاہر بڑا رنگین ہے، اس کا تنا پتوں والا ہے اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہیں۔ بخدا! یہ کسی بشر کا کلام نہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے قرآنِ کریم کی جامع ترین آیت قرار دیا ہے۔

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے:

"اَلْعَدْلُ الْاِنْصَافُ، وَالْاِحْسَانُ التَّفَضُّلُ"

(تفسیر قرطبی ج ۱۰ ص ۱۶۵ دار الکتب المصریۃ)

یعنی عدل سے مراد انصاف کرنا اور احسان سے مراد فضل و کرم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کسی معاشرہ کا صحت مند بنیادوں پر قائم ہونا، انہی دو چیزوں پر موقوف ہے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو، قانون کے سامنے شاہ و گدا سب برابر ہوں، لیکن تنہا یہی کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر فرد اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ برتاؤ کرنے میں احسان کو بھی پیش نظر رکھے۔ اگر کسی سے کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے تو عفو و درگزر سے بھی کام لے۔ اس طرح اس معاشرہ سے صرف یہ نہیں کہ حسد و عناد کے شعلے بھڑکنے نہ پائیں گے، بلکہ انس و محبت کی نسیم بھی ان کے غنچہ ہائے دل کو تبسم آشنا کرتی رہے گی۔

مندرجہ ذیل آیات میں مخاطب عوام نہیں، بلکہ خواص ہیں۔ جنہوں نے صدق دل سے اسلام کو قبول کیا ہے اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر انہیں یقین محکم ہے۔ اس لیے اس کا اسلوبِ بیان ہی نرالا ہے۔ اس کا ہر کلمہ جلال و جمالِ خداوندی کا آئینہ دار ہے۔ اپنے پڑھنے والے کو یہ آیت مجبور کر دیتی ہے کہ ہر حالت میں وہ عدل و انصاف کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ ارشاد گرامی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ (النساء)

Marfat.com

”اے ایمان والو! ہو جاؤ، مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر، گواہی دینے والے محض اللہ تعالیٰ کے لیے چاہے گواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف (جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے) وہ دولت مند ہو یا فقیر، پس اللہ تعالیٰ زیادہ خیر خواہ ہے، دونوں کا۔ نہ پیروی کرو خواہش نفس کی، انصاف کرنے میں، اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو (اس سے) اچھی طرح باخبر ہے“۔

اہل ایمان کو پہلے شرف تخاطب سے نوازا۔ اس کے بعد انہیں یہ اہم حکم دیا، اس فرمانِ خداوندی کے پہلے دو لفظوں میں جو شکوہ اور سطوت ہے اس پر بھی غور فرمائیے ارشاد ہے: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (النساء۔ ۱۳۵) (اے میرے بندو! پوری قوت اور طاقت کے ساتھ انصاف کو قائم کرنے والے بن جاؤ۔) کسی قسم کے ضعف اور کمزوری کا مظاہرہ مت کرو۔ یاد رکھو! تمہاری یہ گواہی کسی انسان کے لیے نہیں، اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ رحمت خداوندی نے اسی فرمان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام کمزوریوں کی نشان دہی بھی کر دی، جن کی وجہ سے انسان حق کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ تمام محاذ جن سے شیطان کی یلغار کا اندیشہ ہوتا ہے، ان تمام سے مومن کو خبردار کیا جا رہا ہے اور اسے تاکید کی جا رہی ہے کہ وہ ابلیس کی لشکر کشی سے ہوشیار رہے۔ سب سے پہلا اور خطرناک محاذ انسان کی ذاتی مصلحت اور عزت ہے۔ انسان اپنے فائدے کے لیے عام حالات میں بڑی سے بڑی بے انصافی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اپنی عزت کو بچانے کے لیے وہ جھوٹی گواہی دینے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اس لیے تاکیدی حکم فرمایا کہ خبردار! تمہیں ہر قیمت پر عدل و انصاف کا علم بلند کرنا ہے، ہر حالت میں سچی گواہی دینا ہے، خواہ اس کی زد تمہاری اپنی ذات ہی پر کیوں نہ پڑے۔ اپنی ذات کے بعد والدین کا مقام ہے، وہ اس کے نزدیک محترم و مکرم بھی ہیں، عزیز اور محبوب بھی۔ نیز ان کے نفع و نقصان میں یہ برابر کا شریک ہے۔ ایسے موقع پر انسان کے ہاتھ سے عدل و انصاف کے دامن کا چھوٹ جانا بعید از امکان

Marfat.com

نہیں۔اس لیے جھڑک دیا کہ خبردار! کسی حالت میں بھی یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ تم ظلم و عدوان کی راہ اختیار کرو، خواہ معاملہ تمہارے والدین کا ہی کیوں نہ ہو۔قریبی رشتہ داروں کے بارے میں بھی اسی قسم کی صورت حال رونما ہوتی ہے۔فرمادیا، کوئی قرابت، کوئی رشتہ، انصاف کے قیام میں مت حائل ہونے پائے۔

مندرجہ بالا موانع کے علاوہ کبھی یہ خیال انسان کو اظہارِ حق سے روک دیتا ہے کہ جس کے خلاف میں گواہی دے رہا ہوں، وہ امیر کبیر ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی غریب کی مسکنت اور غربت کا احساس انسان کے دل میں رحمت وشفقت کے جذبات ابھار دیتا ہے اور اس غریب کے خلاف سچی بات کہنے سے اس لیے ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ کہیں اس غریب کو نقصان نہ پہنچے۔انسانی نفسیات کا کتنا دقیق محاسبہ ہے۔ہدایت فرمائی، عدالت میں کھڑے ہوکران احساسات کو بالکل دل سے نکال دو۔کسی کے نفع ونقصان کی پروا کیے بغیر سچی بات کہواور عدل وانصاف قائم کرو۔**فاللہ اولٰی بھما**۔ کتنا پیارا جملہ ہے۔یعنی تم کسی کی خیر خواہی بھلا کیا کرو گے۔تم اپنا فرض ادا کرو، اپنے رب کا حکم مانو، تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ خود ان دونوں (غریب وامیر) کا خیر خواہ ہے۔

آیت کریمہ کا یہ پرشکوہ اور دلفریب انداز کیا بندۂ مومن میں یہ جرأت پیدا نہیں کر دیتا کہ وہ تمام امتیازات کو پس پشت ڈالتے ہوئے، تمام تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے، عدل وانصاف کی بالادستی کو قائم کرے اور کسی قیمت پر ایسی بات زبان پر نہ آئے جو انصاف کے قیام میں رکاوٹ بن جائے۔

کفارِعرب کی قوت دم توڑ رہی ہے۔اسلام کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت نے ان کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔اب ان میں اپنے دفاع کی ہمت بھی نہیں رہی۔کفر وگمراہی کی طویل رات سحر آشنا ہونے والی ہے۔وہ صبح سعید طلوع ہونے والی ہے، جب اللہ تعالیٰ کا محبوب اور اس کی مخلوق کا ہادی، اپنے جانفروش مجاہدین کے ساتھ فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہوگا۔مسلمانوں کے مکمل غلبہ کے قرائن اب ہر شخص کو نظر آرہے ہیں۔اس وقت اللہ تعالیٰ یہ آیت

Marfat.com

نازل فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾ (المائدہ)

''اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے، اللہ تعالیٰ کے لیے گواہی دینے والے، انصاف کے ساتھ اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس بات پر کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو، یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور ڈرتے رہا کرو اللہ تعالیٰ سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔

اس آیت میں پہلے ہی تنبیہ فرمادی کہ قوت واقتدار اہل ایمان کو عطا ہونے والا ہے۔ اس لیے نہایت وضاحت سے انہیں حکم دیا کہ خبردار! کسی قیمت پر انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ جب تم اپنے دشمن سے بھی معاملہ کرو، تو پھر بھی عدل وانصاف کے اصولوں کی پابندی کرو۔ اللہ تعالیٰ اسلامی مملکت کے بانیوں کو یہ تلقین فرما رہا ہے کہ جب وہ کرسی صدارت پر بیٹھیں تو دوست اور دشمن کی تمیز کیے بغیر عدل وانصاف کو قائم کریں۔ یہی تقویٰ کی روح ہے۔ اسی مفہوم کی ایک اور آیت بھی سماعت فرمائیے۔

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِن جَاءُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۖ وَإِن تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَن يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٤٢﴾ (المائدہ)

''قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو، بڑے حرام خور ہیں۔ تو اگر وہ (کوئی مقدمہ لے کر) آپ کے پاس آئیں تو چاہے فیصلہ فرمائیے ان کے درمیان یا ان سے منہ پھیر لیں، آپ کو اختیار ہے۔ اور آپ اگر ان سے منہ پھیر لیں تو وہ آپ کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اور اگر آپ فیصلہ کریں تو فیصلہ فرمائیے ان کے درمیان انصاف سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے''۔

Marfat.com

یہ ارشاد یہود کے بارے میں ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، جن کی عہد شکنی اور خیانت کے باعث مسلمانوں کو بڑے جانگسل حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ فرمادیا کہ اگر ایسے سفلہ مزاج دشمنوں کے درمیان کبھی کسی تنازعہ کا فیصلہ فرمائیں تو میزانِ عدل کا پلڑا ہرگز جھکنے نہ پائے۔ اگر کفارِ مکہ اور یہودیوں جیسے دشمنوں کی حق تلفی کی قرآن کریم اجازت نہیں دیتا، تو پھر اور کون سا ایسا دشمن ہے جس کی دشمنی کے باعث ایک مومن انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تساہل سے کام لے؟

قرآنِ کریم کے نزدیک عدل وانصاف کا دائرہ فقط ان معاملات تک ہی محدود نہیں، جو معاملات عدالت میں پیش ہوتے ہیں یا کسی بین الاقوامی کونسل میں زیر بحث آنے والے ہوں۔ قرآنِ کریم ان بظاہر غیر اہم معاملات میں بھی عدل وانصاف برپا کرنے کا حکم دیتا ہے، جن کا تعلق ہماری خانگی یا خاندانی یا کاروباری زندگی سے ہے۔ جن کے بارے میں کسی عدالت میں رجوع کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ فرمانِ الٰہی ملاحظہ ہو:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ (الانعام)

''اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے، مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور پورا کرو ناپ اور تول انصاف کے ساتھ۔ ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر جتنی اس کی طاقت ہے اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کی کہو، اگرچہ کسی رشتہ دار کا معاملہ ہو اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرو۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو''۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ان امور میں بھی عدل وانصاف کا حکم دیا جارہا ہے جو بظاہر بالکل معمولی اور غیر اہم دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم اسلامی معاشرہ کے کسی گوشہ میں

Marfat.com

بھی ظلم وعدوان کو برداشت نہیں کرتا۔ وَ بِعَهْدِ اللهِ اَوْفُوْا کے کلمات میں غور فرمائیے۔ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اسلام قبول کرتے وقت تم نے میرے احکام کی تعمیل کا پختہ وعدہ کیا تھا۔ ہوشیار! اس پر آنچ نہ آنے پائے، ہر قیمت پر اس وعدہ کو پورا کرو۔

کسی معاشرہ میں عدل وانصاف کا قیام خلفاء اور امراء کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو خصوصی تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں تساہل سے کام نہ لیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا ہے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص:26)

''اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس آپ لوگوں کے درمیان حق اور انصاف سے فیصلہ کیا کریں اور خواہش کی پیروی ہرگز نہ کریں ورنہ یہ تمہیں راہِ خدا سے بہکا دے گی''۔

جب ایک صاحب کتاب رسول کو عدل وانصاف سے حکومت کرنے کا حتمی حکم دیا جا رہا ہے، جب اسے ہوائے نفس کی پیروی سے روکا جا رہا ہے تو اور کون ہے؟ جسے ظلم کرنے کی اجازت ہو، جس کی ذاتی خواہشات اور شخصی مفادات پر عدل وانصاف کو قربان کیا جا سکے۔

خلفائے اسلام، مملکت اسلامیہ کے حکام، قضاۃ اور قائدین کو حکم دیا جا رہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ (النساء)

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں اور جب بھی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہر چیز دیکھنے والا ہے''۔

ادائے امانت کا مفہوم یہاں بہت وسیع ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو محنت اور دیانت سے

Marfat.com

ادا کرنا، حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لیے کنبہ پروری اور دوست نوازی کے بجائے صرف اہلیت و قابلیت کو معیار قرار دینا بھی اس حکم کی تعمیل میں داخل ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ جب تم عدالت کی کرسی پر بیٹھو اور لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے لگو، تو عدل وانصاف کے اصولوں کو قطعاً نظر انداز نہ کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ میں اپنے بندوں کی جس طرح دلنوازی فرمائی گئی ہے، کون ہے جو اس نکتہ کو سمجھے اور جھوم نہ اٹھے؟ فرمایا، تمہارے ربِ کریم نے یہ نصیحتیں جو تمہیں کی ہیں، یہ تمہارے لیے از بس مفید اور باعث برکت ہیں۔ جب تک تم ان ہدایات پر کاربند رہو گے، تمہارا آفتابِ اقبال نصف النہار پر چمکتا رہے گا۔

جی تو چاہتا ہے کہ بوستانِ نبوت کے رنگین اور مہکتے ہوئے پھولوں کے گلدستے بھی پیش کروں، لیکن وقت کی تنگ دامانی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ صرف دو ارشاداتِ رسالت پر اکتفا کرتا ہوں، شاید کسی غافل کی آنکھ کھل جائے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

مَا مِنْ عَبْدٍ یَسْتَرْعِیْهِ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ رَعِیَّةً یَمُوْتُ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ هُوَ غَاشٌ لِرَعِیَّتِهٖ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ۔ (کنز العمال ص ۲۵ ج ۶ التراث الاسلامی)

''یعنی وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا والی بناتا ہے اور وہ اس حالت میں مرتا ہے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ دھوکہ اور فریب کر رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے''۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِیْ لَنْ تَنَالَهُمَا شَفَاعَتِیْ۔ اِمَامٌ ظَلُوْمٌ غَشُوْمٌ وَ كُلُّ غَالٍ مَارِقٍ۔

(مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۴۴ دار الفکر بیروت)

''یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کے دو ایسے گروہ ہیں جن کو میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی۔ وہ فرمانروا جو ظالم اور خائن ہو اور وہ شخص جو دھوکہ کرنے والا اور

دین کی حدوں کو توڑنے والا ہو''۔

کثیر آیات اور صدہا احادیث سے صرف چند چیزیں آپ کے سامنے بیان کی گئی ہیں۔ ہر حق شناس پر یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ عدل کا جو جامع نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے، اس کی نظیر دنیا کے قدیم و جدید دساتیر اور مجموعہ ہائے قوانین پیش نہیں کر سکتے۔ اسلامی نظامِ عدل کی برتری صرف گزشتہ زمانوں تک محدود نہیں بلکہ انسانیت کا کارواں چودہ سو سال بعد بھی اس مقام پر نہیں پہنچ سکا جس پر نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض نگاہ اور حسن تربیت سے عرب کے اکھڑ مزاج جاہل بدو پہنچ گئے تھے۔

یہ تو ہوا اس مسئلہ کا نظری پہلو۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو قوم قرآن کی آغوش میں پروان چڑھی، جس کے قلب و نگاہ کو آفتابِ نبوت نے روشن کیا، ان کی عملی زندگی کیسی تھی؟ عدل و انصاف کے قرآنی نظام کو انہوں نے کس طرح اپنے معاشرہ میں نافذ کیا؟

بڑے اختصار کے ساتھ تاریخ اسلام کے صرف چند ورق آپ کے سامنے کھول کر رکھتا ہوں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمانہ جاہلیت کی تمام قبیح رسوم کا قلع قمع کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

وَاِنَّ رِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَ اِنَّ اَوَّلَ رِبًا اَبْدَءُ بِهٖ رِبَا عَمِّي الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ وَ اِنَّ دِمَاءَ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَ اِنَّ اَوَّلَ دَمٍ اَبْدَءُ بِهٖ دَمُ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ۔

''میں جاہلیت کے تمام سود کو کالعدم قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس کے سود کو کالعدم قرار دیتا ہوں۔ نیز عہد جاہلیت میں جو خونریزیاں ہوئیں، میں ان کو بھی کالعدم قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے میں اپنے چچازاد ربیعہ بن حارث کے بیٹے عامر کا خون کالعدم قرار دیتا ہوں''۔ (الوثائق السیاسیہ ص ۳۶۱ مطبوعہ دار النفائس بیروت)

اس سے بھی زیادہ ایمان افروز اور روح پرور منظر اس وقت دکھائی دیتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا پیارا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دار فانی سے رخصت ہونے والا ہے، رفیق اعلیٰ سے ملنے کا

وقت آ گیا ہے، مسجد نبوی ﷺ میں مسلمانوں کا ہجوم ہے، حضور ﷺ بیماری کی حالت میں تشریف لاتے ہیں۔

اَیُّهَا النَّاسُ مَنْ كُنْتُ جَلَدْتُهٗ لَهٗ ظَهْرًا فَهٰذَا ظَهْرِیْ فَلْیَسْتَقِدْ مِنْهُ۔ وَ مَنْ كُنْتُ شَتَمْتُ لَهٗ عِرْضًا فَهٰذَا عِرْضِیْ فَلْیَسْتَقِدْ منه۔ وَ مَنْ كُنْتُ اَخَذْتُ لَهٗ مَالاً فَهٰذَا مَالِیْ فَلْیَاْخُذْ مِنْهُ۔ وانَّ الشَّحْنَآءَ لَیْسَتْ مِنْ شَاْنِیْ۔

(ابن عساکر) (تاریخ مدینہ دمشق ج ۴۸ ص ۳۲۳ دار الفکر)

"اے لوگو! اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر کبھی کوئی درہ مارا ہے تو یہ میری پیٹھ حاضر ہے، وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے۔ اگر میں نے کسی کو برا بھلا کہا ہے تو میری آبرو حاضر ہے، وہ اس سے انتقام لے سکتا ہے۔ اگر میں نے کسی کا مال چھینا ہے تو میرا مال حاضر ہے، وہ اس سے اپنا حق لے سکتا ہے اور تم میں سے کوئی یہ اندیشہ نہ کرے کہ اگر کسی نے انتقام لیا تو میں اس سے ناراض ہوں گا میری یہ شان نہیں ہے"۔

آپ خود سوچیے کہ جب اللہ تعالیٰ کا پیارا حبیب اور اہل ایمان کے ایمان کی جان، محمد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثناء اپنی ذاتِ اقدس، کو اپنے خاندان کو اور اپنے اقرباء کو قانونِ شرعی سے بالاتر نہیں سمجھتا تو قیامت تک آنے والا کوئی کلمہ گو خواہ اس کا سیاسی یا ادبی مقام کتنا ہی اونچا ہو، اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

عہد رسالت میں متعدد ایسے واقعات ہوئے کہ معزز اور طاقت ور قبیلہ کے کسی فرد نے کسی کمزور پر دست تعدی دراز کیا، لیکن جب عدل کا وقت آیا تو حضور ﷺ نے ان امتیازات کو پرکاہ کی وقعت بھی نہ دی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نضر کی بیٹی ربیع نے ایک لڑکی کے دانت توڑ دیے۔ ربیع کے گھر والوں نے اس لڑکی سے عفو و درگزر کی درخواست کی لیکن اس کے گھر والوں نے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے معاوضہ دے کر صلح کرنا چاہی، لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ بارگاہِ رسالت میں آ کر انہوں نے فریاد کی اور عرض کیا کہ ہم تو

Marfat.com

ربیع سے اپنی بچی کا قصاص ہی لیں گے۔ حضور ﷺ نے ربیع، اس کے باپ اور اس کے خاندان کی وجاہت و وقار کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ فرمایا کہ ربیع سے قصاص لیا جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ کیا ربیع جیسی شریف زادی کے دانت توڑ دیے جائیں گے؟ حضور نے جواب دیا کِتَابُ اللّٰهِ الْقِصَاصُ۔ (اے انس! قصاص لینا اللہ کا حکم ہے)۔ اس میں ہیر پھیر ممکن نہیں۔ چنانچہ جب اس عورت کے خاندان والوں نے عدل وانصاف کی اس بالادستی کو دیکھا، تو ان کا غصہ فرو ہو گیا اور انہوں نے خوش دلی سے ربیع کی خطا معاف کر دی۔

اسی طرح عہد رسالت کا ایک مشہور واقعہ ہے، جسے آپ بارہا سن چکے ہوں گے۔ بنی مخزوم کی ایک عورت نے کسی کا زیور چرا لیا۔ حضور ﷺ نے اس پر چوری کی حد قائم کرنے کا حکم دیا۔ مہاجرین نے حضرت اسامہ کو سفارشی بنا کر بھیجا۔ اسامہ کی بات سن کر فرطِ غضب سے حضور ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ فرمایا:

اے اسامہ! کیا تو اللہ تعالیٰ کی حد کے قائم کرنے کے بارے میں سفارش کرتا ہے؟ تم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ہلاک کر دیا جن میں اگر کوئی شریف زادہ چوری کرتا تو اس کو معاف کر دیتے اور اگر کوئی ضعیف یا کمزور شخص چوری کا ارتکاب کرتا تو اس پر حد قائم کی جاتی۔

اقلیم عدل وانصاف اور کشورِ فضل واحسان کے فرمانروا نے فرمایا:

وَاللّٰهِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا۔

''خدا کی قسم! (بفرضِ محال) اگر میری اپنی لختِ جگر فاطمہ بھی اس جرم کی مرتکب ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا''۔ (بخاری شریف ج ۲ ص ۶۱۶ وزارتِ تعلیم)

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ اَفْضَلَ الصَّلٰوةِ وَ اَجْمَلَ التَّسْلِيْمَاتِ۔

عہد فاروقی میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مصر فتح کرتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ ان کا ایک لڑکا جس کا نام محمد

تھا۔ اسے گھڑ دوڑ کا بڑا شوق تھا۔ ایک مصری نے ان کے ساتھ گھوڑا دوڑایا اور جیت گیا۔ مصر کے فاتح اور گورنر کے بیٹے کو بڑا غصہ آیا اور اسے کئی بید رسید کیے اور کہا: خُذْهَا وَ اَنَا ابْنُ الْاَكْرَمِيْنَ۔ (کہ اور بید کھاؤ۔ تم مجھے نہیں پہچانتے میں بڑے معزز و محترم آباؤ اجداد کا چشم و چراغ ہوں)۔ مصری مار کھانے کے بعد دادرسی کے لیے مدینہ طیبہ پہنچتا ہے اور عدالت فاروقی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کی فریاد سن کر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اپنا قاصد مصر روانہ کرتے ہیں، تاکہ وہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے محمد کو ساتھ لے کر فوراً حاضر ہو۔ چند روز کے بعد دونوں مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور عدالت فارقی میں پیش کیے گئے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاگردِ رشید اور جانشین، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، فاتح مصر کے بیٹے اور ایک عام مصری کے مقدمہ کی سماعت کر رہا ہے۔ آپ نے بلند آواز سے کہا۔ این المصری؟ (وہ فریاد کرنے والا مصری کہاں ہے؟) وہ حاضر ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ میں اپنا درہ دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ فَاضْرِبْ بِهَا ابْنَ الْاَكْرَمِيْنَ۔ کہ معزز محترم آباؤ اجداد کے اس چشم و چراغ کو کوڑے لگاؤ، جس طرح اس نے تجھے کوڑے لگائے تھے۔ وہ کوڑے لگا رہا ہے، عمرو بن عاص اپنے بیٹے کو پٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، لیکن کسی کو مجالِ دم زدن نہیں۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے جاتے ہیں: ''اے مصری! اور مار، اور مار''۔ جب مصری اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا، تو آپ نے کہا:

اب ذرا فاتح مصر کی بھی خبر لو۔ ان کے بیٹے نے تجھے مارنے کی جرأت اس لیے کی کہ وہ اپنے آپ کو مصر کے فاتح اور گورنر کا بیٹا سمجھتا تھا۔

مصری عدل و انصاف کے اس نرالے منظر کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ عرض کرنے لگا:

اے امیر المومنین! جس نے مجھے مارا ہے میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔ اس میں عمرو بن عاص کا کوئی قصور نہیں۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ غصہ سے عمرو بن عاص کی طرف دیکھتے ہیں اور ایک جملہ ان کی زبان سے نکلتا ہے جس میں اسلامی فتوحات کا فلسفہ اور روح سمٹ کر آ گئی ہے:

Marfat.com

يَا عَمْرو! مَتٰى تَعَبَّدْتُمُ النَّاسَ وَ قَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا۔

''اے عمرو! جن لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا ہے ان کو تم نے کب سے اپنا غلام سمجھ لیا ہے''۔

اسی طرح کا ایک اور تاریخ ساز واقعہ عہد فاروقی میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔

غسان کا آخری بادشاہ جبلہ بن ایہم اسلام قبول کرتا ہے اور فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ آتا ہے۔ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے۔ اس کی قیمتی چادر پر ایک بدو اپنا پاؤں رکھ دیتا ہے۔ جبلہ مڑ کر دیکھتا ہے، غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے اور اس بدو کو زور سے طمانچہ رسید کرتا ہے، جس سے اس کی ناک زخمی ہو جاتی ہے اور اس کے اگلے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ بدو امیر المومنین کے پاس حاضر ہو کر فریاد کرتا ہے۔ آپ جبلہ کو بلاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ یا تو اس بدو سے معافی مانگ لو اور اسے راضی کر لو، ورنہ قصاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔

جبلہ یہ بات سن کر حیران ہو جاتا ہے اور فرطِ حیرت سے پوچھتا ہے کہ کیا اس معمولی بدو کے لیے مجھ بادشاہ سے قصاص لیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: ''اسلام قبول کر لینے کے بعد اب تم دونوں یکساں ہو گئے ہو۔ اب برتری کا معیار صرف تقویٰ ہے''۔

جبلہ کہنے لگا کہ میں نے تو اسلام اس خیال سے قبول کیا تھا کہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ وقار نصیب ہو گا۔ آپ نے فرمایا: ''جبلہ یہ نادانوں کی سی باتیں چھوڑ دو''۔ اس نے جب دیکھا کہ امیر المومنین اس سے قصاص لینے پر مصر ہیں، تو اس نے عرض کیا مجھے آج رات سوچنے کی مہلت دیجئے۔ رات کو ہی وہ اپنے ساز و سامان اور ہمراہیوں سمیت وہاں سے بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور عیسائی بن گیا۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک بادشاہ کا مرتد ہونا گوارا کر لیا، لیکن قرآنِ کریم کی تعلیمات پر حرف نہ آنے دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جس قرآن کی روشنی سے ہمارا عرصۂ حیات منور ہے، وہاں شاہ و گدا میں کوئی فرق نہیں۔ اگر اسلام کی قوت وعظمت کا راز

Marfat.com

کسی بادشاہ یا بادشاہ زادے کے مسلمان ہونے میں مضمر نہیں بلکہ اس کے ابدی اور ازلی قواعد میں مضمر ہے، جہاں عدل و انصاف کے راستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو ریزہ ریزہ کر دیا جاتا ہے۔

خلافت راشدہ کے عہد ہمایوں کے بعد بھی مسلمان خلفاء اور قاضیوں میں ایسی برگزیدہ ہستیاں بکثرت ملتی ہیں، جن کا وجود بھی ظلمت کدۂ عالم میں ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔

عباسی خلافت کا آفتاب اپنے شباب پر ہے۔ قاضی کوفہ شریح کی عدالت میں ایک غریب عورت حاضر ہوئی اور اس نے فریاد کی، مجھ پر ظلم کیا گیا۔ دادرسی فرمائیے۔ قاضی نے پوچھا تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟ اس خاتون نے کہا: امیر المومنین کے عم زاد موسیٰ بن عیسیٰ نے مجھ پر زیادتی کی ہے۔ فرات کے کنارے میرا ایک کھجوروں کا باغ تھا جو مجھے اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ میں نے اور میرے بھائیوں نے اسے آپس میں تقسیم کر لیا۔ میں نے اپنی حد پر ایک دیوار تعمیر کر لی۔ شہزادۂ موسیٰ نے میرے بھائیوں سے ان کا حصہ خرید لیا اور میرا حصہ بھی خریدنا چاہا۔ میں رضا مند نہ ہوئی۔ رات کے وقت اس نے اپنے نوکر بھیج کر اس دیوار کو مسمار کرا دیا۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ میرا کون سا حصہ ہے؟ قاضی شریح نے اسی وقت اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ فوراً جاؤ اور امیر المومنین کے عم زاد موسیٰ کو عدالت میں حاضر کرو۔ وہ خادم گیا، قاضی کا حکم سنایا۔ موسیٰ غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا اور حکم دیا کہ پولیس افسر کو میرے پاس لاؤ، جب وہ آیا تو اسے کہا کہ فوراً قاضی شریح کے پاس جاؤ اور کہو کہ تم نے ایک عورت کی بات سن کر میرے خلاف وارنٹ جاری کر دیئے۔ یہ کسی طرح درست نہیں۔ پولیس افسر نے جانے سے معذرت کی۔ موسیٰ کے مجبور کرنے پر اسے جانا پڑا۔ جب وہ قاضی کے پاس گیا اور موسیٰ کا پیغام سنایا تو قاضی نے حکم سنایا کہ پولیس افسر اور اس کے سپاہیوں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جائے۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ موسیٰ کو جب پتہ چلا تو وہ غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ خود جیل میں گیا اور دروازہ کھول کر ان سب کو رہا کر دیا۔ جیل کے داروغہ نے شریح کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ قاضی نے اپنے خادم کو کہا کہ اٹھو، ہم بغداد

Marfat.com

جاتے ہیں۔ بخدا! ہم نے خلیفہ سے درخواست نہیں کی تھی کہ وہ ہمیں قاضی بنائے، بلکہ خلیفہ نے مجبور کیا تھا اور اس کی ضمانت دی تھی کہ اگر ہم اس کی پیشکش قبول کر لیں، تو ہماری عزت و وقار کا وہ خود ضامن ہوگا۔

قاضی جب عازمِ بغداد ہوا، امیر موسیٰ کو اطلاع ملی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ دوڑا دوڑا پیچھے گیا اور قاضی شریح کی منتیں سماجتیں کرنے لگا۔ قاضی نے کہا کہ جب تک تم میرے حکم کی تعمیل نہیں کرو گے، میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ چنانچہ آپ واپس کوفہ آئے، اس عورت کو بلایا اور کہا کہ یہ تیرا مجرم موسیٰ تیرے سامنے کھڑا ہے، اب تم اپنا دعویٰ پیش کرو۔ اس نے اپنی داستان سنائی۔ موسیٰ نے اس کی تصدیق کی۔ قاضی نے حکم دیا کہ جو تم نے اس سے چھینا ہے وہ واپس کرو اور اس کی دیوار از سرِ نو تعمیر کر دو۔ موسیٰ نے تعمیل حکم کا وعدہ کیا۔ پھر قاضی نے عورت سے پوچھا: کیا تیرا کوئی اور مطالبہ ہے؟ عورت نے سراپا تشکر و امتنان بن کر کہا: میرا اور کوئی مطالبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو برکت دے اور آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ قاضی نے کہا اب تم جا سکتی ہو۔ جب وہ عورت واپس چلی گئی، اس وقت اپنی نشست سے اٹھے، شہزادے کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا الْاَمِیْر، کوئی حکم ہو تو ارشاد فرمائیے۔

شہزادہ ہنس دیا اور کہا: میں آپ کو کیا حکم دے سکتا ہوں؟ قاضی نے کہا: اے شہزادے! مظلوم کی فریاد رسی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس میں میں سرِ مو کوتاہی نہیں کر سکتا۔ شہزادہ سراپا ادب بن کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ بے شک جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے بڑے بڑے جابر اور طاقتور لوگ بھی اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۹۱، ۲۹۰ السعادۃ مصر)

گبن اپنی تاریخ کی مشہور کتاب (رومن امپائر) کی چھٹی جلد میں لکھتا ہے کہ ایک دن سلطان محمود غزنوی اپنے دیوان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی رعایا کا ایک غریب آدمی اس کے تخت کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا اور شکایت کی کہ ایک ترکی سپاہی نے اس کو اس کے

Marfat.com

گھر سے نکال دیا ہے اور اس کی بیوی پر قبضہ کر لیا ہے۔ محمود نے اس کی شکایت سن کر کہا: اب صبر سے کام لو، رونا چلانا چھوڑ دو، جب دوبارہ آئے تو مجھے اطلاع دو۔ میں بہ نفس نفیس وہاں پہنچ کر تیری دادرسی کروں گا۔ تین روز بعد مجرم دوبارہ رات کو اس کے گھر میں داخل ہوا۔ تو وہ بھاگا ہوا سلطان محمود غزنوی کے پاس آیا۔ سلطان چند سپاہیوں کو ہمراہ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر مکان کے اردگرد پہرے دار متعین کر دیے۔ تمام روشنیاں بجھا دی گئیں اور اعلان کر دیا کہ یہ نابکار قابل گردن زنی ہے، کیونکہ یہ موقع پر بدکاری کرتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ جب اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا تو پھر چراغ روشن کر دیے گئے۔ مقتول کو دیکھ کر محمود نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اس نے کہا کہ اگر گھر میں کھانے کے لیے کچھ ہے تو پیش کرو۔ اس غریب آدمی نے روکھی سوکھی روٹی لا کر اس کے سامنے رکھ دی جس کو سلطان نے بڑی رغبت سے کھایا۔ پھر محمود سے اس حیرت انگیز طریقہ کار کے بارے میں پوچھا گیا، تو سلطان نے جواب دیا: ''مجھے خیال گزرا، مبادا میرے کسی بیٹے نے ایسی جرأت کی ہو۔ میں نے چراغ گل کرنے کا حکم دیا تا کہ اگر اس حرام کاری کا مرتکب میرا کوئی بیٹا ہو تو شفقت پدری قیامِ عدل میں رکاوٹ نہ بنے۔ میرے انصاف کو نابینا اور بے رحم ہونا چاہیے۔ جب سے اس شخص نے اپنی داستانِ غم مجھے سنائی، مجھے اتنا دکھ ہوا کہ میں نے تین دن سے کوئی چیز نہیں کھائی۔ (رومن امپائر، ص ۴ مطبوعہ نیویارک)

آخر میں اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک ورق آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ واقعہ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اپنے مخصوص انداز میں ''اسرار ورموز'' میں لکھا ہے۔

''سلطان مراد نے اقلیم خجند سے ایک ماہر معمار بلوایا اور اسے مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جب مسجد تعمیر ہو چکی تو سلطان مراد اسے دیکھنے کے لیے آیا۔ بادشاہ کو مسجد کی عمارت پسند نہ آئی۔ اس نے غصہ میں آ کر معمار کا ہاتھ کاٹ دیا۔ حضرت علامہ کے رقت انگیز الفاظ میں یہ قصہ سنیے:

جوئے خون از ساعد معمار رفت
پیش قاضی ناتوان و زار رفت

Marfat.com

(یعنی معمار کے بازو سے خون کی ندی جاری ہوگئی اور اس بے چارگی اور خستگی کی حالت میں وہ قاضی کے سامنے پیش ہوا)۔

گفت اے پیغام حق گفتارِ تو
حفظِ آئین محمد کارِ تو

(معمار نے کہا: اے قاضی! تیری گفتگو اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے اور تیرا فرضِ منصبی آئین مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی حفاظت کرنا ہے)۔

سفۃ گوشِ سطوت شاہاں نیم
قطع کن از روئے قرآں دعویم

(میں بادشاہوں کی عظمت کا غلام نہیں ہوں۔ میرے دعویٰ کا فیصلہ قرآن کی رو سے کرو)۔

قاضی نے اسی وقت وارنٹ جاری کئے اور بادشاہ کو اپنی عدالت میں طلب کیا۔

رنگ شاہ از ہیبت قرآں پرید
پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید

(قرآن کی ہیبت وجلال سے بادشاہ کا رنگ فق ہوگیا اور خطا کاروں کی طرح قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا)۔

علامہ فرماتے ہیں: اس وقت ایک عجیب مسحور کن منظر تھا۔

یک طرف فریادیٔ دعویٰ گرے
یک طرف شاہنشہ گردوں فرے

(ایک طرف فریادی کھڑا ہے اور دوسری طرف صاحب شوکت وجبروت بادشاہ ہے)

بادشاہ نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا اور اپنی ندامت وخجالت کا اظہار کیا۔

گفت قاضی فی القصاص آمد حیات
زندگی گیرد بایں قانوں ثبات

(قاضی نے کہا کہ اب تم سے قصاص لیا جائے گا اور اس قانون پر عمل کرنے سے ہی زندگی کو استحکام نصیب ہوتا ہے)۔

عبد مسلم کمتراز احرار نیست
خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

(عدالت کے سامنے غلام اور آزاد دونوں یکساں ہیں۔ معمار کے بازو سے بہنے والا خون اتنا ہی سرخ ہے جتنا بادشاہ کا خون سرخ ہے)۔

چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید
دست خویش از آستیں بیروں کشید

(بادشاہ مراد نے قرآنِ کریم کی جب یہ آیت سنی تو سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنی آستین سے باہر نکالا تا کہ اس کو کاٹ دیا جائے)۔

مدعی را تاب خاموشی نماند
آیۂ بالعدل والاحسان خواند

(یہ منظر دیکھ کر مدعی کو یارائے ضبط نہ رہا، فوراً اس نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل۔ ۹۰)

گفت از بہر خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیٰ بخشیدمش

(معمار کہنے لگا: میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس کو بخش دیا، میں نے محمد مصطفیٰ ﷺ کے صدقے اس کو معاف کر دیا)۔

اس واقعہ کو ختم کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں:

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر

(خاتم النبیین رحمۃ للعالمین کے آئین کی سطوت و ہیبت کا اندازہ لگاؤ کہ چیونٹی نے

سلیمان پر کامیابی حاصل کر لی)۔

پیش قرآں بندہ و مولے یکے ست
بوریا و مسند دیبا یکے ست

(کلیاتِ اقبال فارسی ص ۱۰۷ غلام علی اینڈ سنز)

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَ عَلٰی آلِهٖ وَ صَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔

Marfat.com

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا

معاشی انقلاب

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انسان نہ صرف روح کا نام ہے نہ فقط جسم کا، بلکہ دونوں کے مجموعے کو انسان کہا جاتا ہے۔ اس لیے نوع انسانی کا عالمگیر اور ابدی دین وہی ہو سکتا ہے جو روح اور جسم دونوں کے تقاضوں کو پورا کرے، جو دونوں کی نشوونما اور بالیدگی کا ضامن ہو، دونوں میں باہمی کشمکش اور محاذ آرائی کو ختم کرے اور ان میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر دے کہ دونوں ایک ہی راہ پر، ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں رہیں۔ مذہب کے نام پر جو نظامہائے حیات اس وقت موجود ہیں وہ مادی نظامہائے فکر سے مات کھا چکے ہیں، ماننے والوں سے تقاضا نہیں کر سکتے کہ وہ بے راہروی کو چھوڑ دیں، ان کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اس مذہب کا لیبل اپنے اوپر چسپاں کیے رکھیں، اس کے بعد جو جی میں آئے کریں۔ شراب پییں، جوا کھیلیں، قمار بازی کے لیے بے شک عالیشان کازینو تعمیر کریں، شبینہ کلبوں میں دادِ عیش دیں، ننگے ناچ ناچیں، حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے بے شک وہ غیر حیوانی طریقے اختیار کریں، حتیٰ کہ مرد، مرد کے ساتھ برملا شادیاں رچائیں، انہیں قانونی جواز اور عدالتی تحفظ میسر آ جائے، وہ سودی کاروبار کریں، جس طرح جی میں آئے ضرورتمندوں کا خون چوستے رہیں، مذہب کوئی مزاحمت نہ کرے گا۔ مغربی یورپ اور امریکہ وغیرہ میں عیسائیت کی بے بسی اور مجبوری دیکھ کر باشعور انسان کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

رہے موجودہ دور کے مادی نظام، تو ان کے علمبرداروں کے نزدیک انسان کے انسانی پہلو کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ انہوں نے اس کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ رہا انسان کا حیوانی پہلو، تو اس میں بھی سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظاموں میں جو خوفناک تصادم برپا ہے اس نے انسانیت کا حلیہ بگاڑ دیا ہے بلکہ اس کی ہڈیاں پیس کر رکھ دی ہیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو تہس نہس کرنے کے لیے اپنے جنگی ذخائر میں ہر آن مہلک ترین اسلحہ کا

Marfat.com

اضافہ کرتے جارہے ہیں۔ جب بھی کسی نے بٹن دبایا، تو دنیا بھر میں ایک ایسا کہرام مچے گا جو مشرق و مغرب دونوں کو تباہ و برباد کردے گا۔

نظام سرمایہ داری اگر انسان کی محنت اور عرق ریزی کو کوئی وقعت نہیں دیتا تو اشتراکی کیمپ انسان کی حریت ضمیر اور آزادیٔ فکر کو برداشت نہیں کرتا اور اسے آہنی زنجیروں میں جکڑ دینے کے درپے ہے۔

اس ہنگامۂ دار و گیر میں کہیں امید کی کرن نظر آتی ہے تو وہ سید کائنات، فخر موجودات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین فطرت ہے جسے ہم اسلام کے نام سے پہچانتے ہیں۔ میں یہاں بڑے اختصار کے ساتھ ان خطوط کا اجمالی تذکرہ کروں گا جو اس دین حنیف نے انسانی زندگی کو متوازن، خوشحال، پاکیزہ اور بابرکت بنانے کے لیے پیش کیے ہیں۔

دیگر مذاہب کی طرح اسلام نے انسان کی جسمانی زندگی، اس کے تقاضوں اور اس کی مادی ضرورتوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ آخرت کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ترکِ دنیا ناگزیر ہے۔ اپنے ماننے والوں کو جنگلوں، پہاڑوں، ویران جزیروں میں بھاگ جانے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ اسلام کے نزدیک انسان میں مستور ممکنہ قوتیں فقط اسی وقت بیدار ہوتی ہیں جب وہ کشمکش حیات میں بھرپور حصہ لیتا ہے۔ اس کی توانائیوں کی آزمائش کے لیے حادثات سے ٹکرانا ضروری ہے۔ زندگی کی گراں باریوں سے نجات حاصل کر کے کسی گوشۂ عافیت میں پناہ لینا مومن کے لیے جائز نہیں۔ اس کے ہادیٔ برحق نے وضاحت سے فرمادیا: "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ"۔ اس لیے قرآن کریم اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑے شوق آفریں انداز میں کسب مال، اکتسابِ دولت اور حصولِ منفعت کی دعوت دی گئی ہے۔

ارشاد گرامی ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:10)

"یعنی جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو تلاش

Marfat.com

کرو"۔

چنانچہ اس آیت میں مال کو فضل الٰہی فرما کر اس کی عزت افزائی کی گئی ہے۔ اسی طرح سورۂ فاطر میں ارشاد ہے:

وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (فاطر)

"یعنی تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ پانی کو چیر کر جارہی ہیں تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم اس کا شکر ادا کر سکو"۔

یہاں بھی مال کو اپنا فضل فرمایا ہے۔ سورۂ نساء میں مال کو زندگی کا سہارا کہا گیا اور ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اموال احمقوں اور نادانوں کے سپرد نہ کردو تا کہ وہ سوئے تصرف سے تمہیں زندگی کے اس سہارے سے محروم نہ کریں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء۔۵)

"تم اپنے اموال نادانوں کو نہ دو جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے سہارا بنایا ہے"۔

احادیث طیبہ میں بھی مسلمانوں کو کسب حلال کی رغبت دلائی گئی ہے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

طَلَبُ الْحَلَالِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔ (1)

"رزق حلال کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے"۔

ایک اور مقام پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

طُوبٰى لِمَنْ طَابَ كَسْبُهٗ وَ صَلُحَتْ سَرِيرَتُهٗ وَ كَرُمَتْ عَلَانِيَتُهٗ وَعَزَلَ عَنِ النَّاسِ شَرَّهٗ۔ (2)

"یعنی وہ انسان بڑا فیروز بخت اور ارجمند ہے جس نے پاکیزہ مال کمایا، جس کا باطن نیک اور جس کا ظاہر محترم ہے اور اس نے لوگوں کو اپنی شرانگیزی سے محفوظ کر دیا"۔

ایک صحابی کے ہاتھ کو دیکھا کہ وہ محنت مزدوری کرنے سے سوج گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

1۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 5، التراث الاسلامی 2۔ الترغیب والترہیب، جلد 3، صفحہ 558، دار الفکر بیروت

Marfat.com

تِلْکَ یَدٌ یُحِبُّهَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ۔

''یعنی کسب رزق میں مزدوری کرنے سے سوج جانے والا ہاتھ وہ ہاتھ ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند فرماتا ہے''۔

ان آیات اور احادیث سے واضح ہو گیا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو کسب مال سے روکتا نہیں ہے بلکہ رغبت دلاتا ہے اور ان کی جدوجہد کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ مال کمانے کی کھلی اجازت نہیں دے دیتا، بلکہ اکتسابِ مال کے بعض ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے اور بعض کو ناجائز۔ وسائل معاش میں جائز اور ناجائز، حلال اور حرام کی اساس یہ ہے کہ تمام وہ ذرائع جن میں دوسرے شخص کی ضرورت، مجبوری، سادہ لوحی یا ناتجربہ کاری سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہو یا دھوکہ دہی یا جبر سے کسی کا مال ہتھیا لیا گیا ہو، وہ تمام وسائل، شریعت میں ممنوع اور خلافِ قانون ہیں۔ سود، جوا، ذخیرہ اندوزی، رشوت، بلیک مارکیٹنگ اور دیگر ہر قسم کی دھاندلیاں اسلام کے نزدیک حرام ہیں۔ ان ذرائع سے کمایا ہوا روپیہ اگر خدا کی راہ میں بھی خرچ کر دیا جائے تو اس کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ ایسے رزق سے جسم میں جو قطرۂ خون بنتا ہے اور جو گوشت پوست کی صورت اختیار کرتا ہے، ارشادِ مصطفوی ﷺ کے مطابق وہ جہنم میں جلایا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

لَا یَغْبِطَنَّ جَامِعُ الْمَالِ مِنْ غَیْرِ حِلِّهٖ اَوْ قَالَ مِنْ غَیْرِ حَقِّهٖ فَاِنَّهٗ اِنْ تَصَدَّقَ بِهٖ لَمْ یُقْبَلْ مِنْهُ وَ مَا بَقِیَ کَانَ زَادَهٗ اِلَی النَّارِ۔ (المستدرک ج ۲ ص ۵ دار العلمیۃ بیروت)

''وہ آدمی جو حرام ذریعہ سے مال جمع کرتا ہے وہ خوش نہ ہو، اگر وہ اس سے خیرات بھی کرے گا تو ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اور جو باقی رہے گا وہ جہنم کے لیے زادِ راہ ثابت ہوگا''۔

یَا کَعْبَ بْنَ عُجْرَةَ اِنَّهٗ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ۔

''اے کعب بن عجرہ! وہ گوشت جو حرام رزق سے پیدا ہوا ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا''۔ (سنن دارمی ج ۲ ص ۲۲۶ دار المحاسن قاہرہ)

Marfat.com

دولت کی کثرت وفراوانی قلب وذہن میں بسا اوقات بڑے ناخوشگوار تاثرات پیدا کر دیتی ہے۔ کم ظرف انسان دولت کو ہی شرفِ انسانی کا معیار سمجھنے لگتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو دولت میں ان سے فروتر ہو، ان کی نگاہوں میں گھٹیا اور حقیر دکھائی دینے لگتا ہے۔ دولت کی حرص تیز تر ہو جاتی ہے۔ وہ دولت آفرین ہاتھوں کو صحیح معاوضہ دینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر معصوم عصمتوں کو داغدار اور محترم حقوق کو زک پہنچانے سے باز نہیں آتا۔ وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ زیرک اور دانشور شمار کرنے لگتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ فتور بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ خدا کے نزدیک وہی برگزیدۂ خلائق ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتا ہے بارگاہِ الٰہی سے اسے سند جواز حاصل ہے۔ وہ ملکی دولت کے سارے ستونوں کا رخ زور وجبر سے یا مکر وفریب سے اپنی طرف پھیرنے میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ اس کی آتش جوع ہر دم بھڑکتی رہتی ہے۔ اس کی تشنہ لبی میں ثروت کی بے پناہ کثرت کے باوجود کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اسلام ایسے انسان کو اپنے معاشرہ میں ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ وہ اپنے ماننے والوں کی ابتدا سے ہی ایسی تربیت کرتا ہے اور ان کو ایسی راہ پر گامزن کرتا ہے کہ اس کی زندگی میں ایسا کوئی مرحلہ نہ آئے جب وہ دوسرے انسانوں کی شرافت اور احترام کو صرف دولت کے معیار پر پرکھنے کا خوگر ہو جائے۔ وہ تمام وسائل جن کی وجہ سے دولت کا بہاؤ کسی فردِ واحد یا معاشرہ کے ایک مخصوص طبقہ کی طرف مڑ جاتا ہے، اسلام نے ان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ وہ ممالک جہاں سرمایہ داری کا عفریت اپنے ہم وطنوں کا خون چوس رہا ہے اور ضرورتمندوں کی ہڈیوں کو چبا رہا ہے، اگر ان کے حالات کو آپ بنظر غائر دیکھیں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دولت کی اس غیر متوازن بلکہ ظالمانہ تقسیم میں ان وسائل معاش کا ہی عمل دخل ہے جنہیں اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ جو قوم یا ملک کے باشندے اسلامی وسائل معاش کی اس تقسیم پر ایمان رکھتے ہیں اور حرام ذرائع سے ایک پائی کمانا بھی جرم تصور کرتے ہیں، وہاں کے معاشرہ میں دولت کی یہ ظالمانہ تقسیم آپ کو نظر نہیں آئے گی۔

دوسرے ازموں کے برعکس اسلام کا اندازِ اصلاح یہ نہیں کہ پہلے غلاظت کے ڈھیروں

Marfat.com

کو جمع ہونے کی کھلی چھٹی دی اور جب اس کی عفونت سے دماغ پھٹنے لگے تو ان غلاظت کے ڈھیروں کو دور کرنے کی مجنونانہ مہم میں تخریب کاری کو روا رکھنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں مرض کا سد باب نہ کیا۔ جب جسم کے ہر حصے کو وہ متاثر کر چکیں تو پھر اس کے علاج کے لیے قطع و برید کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسلام ان راستوں کو ہی بند کر دیتا ہے اور ان دروازوں کو ہی مسدود قرار دیتا ہے جہاں سے اس قسم کی خرابیاں معاشرے میں داخل ہوتی ہیں۔ اگر ایک سود کو کسی ملک میں حتمی طور پر بند کر دیا جائے، تو وہاں چند دنوں میں سرمایہ داری کا ظالمانہ نظام دم توڑ دے گا۔ اگر رشوت، جوٗا بازی، ذخیرہ اندوزی کی لعنتوں سے کوئی قوم اپنا دامن بچا لے تو معاشی ناہمواریاں اور خوفناک نشیب و فراز کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ اسلام نے وہ تمام راہیں بند کر دیں جن کے ذریعے سرمایہ داری کو غذا پہنچتی ہے اور اس کا دیو انسانی شرافت کے مقدس اور نورانی میناروں کو پامال کرنے کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔

پاکستان میں بھٹو حکومت کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے بائیس خاندانوں کے خلاف بڑا شور مچایا گیا۔ ان کو وطن کا غدار، غریبوں کے حق غصب کرنے والا، محنت کش طبقہ کا خون چوسنے والا اور معلوم نہیں کن کن القابات و خطابات سے نوازا گیا، لیکن اس تحریک کے علمبرداروں کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ ان اسباب و عوامل کا تجزیہ کریں، جن کی وجہ سے بائیس خاندان معرضِ وجود میں آئے۔ تیس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود پاکستان کی معاشی حالت زبوں سے زبوں تر ہوتی چلی گئی۔ پہلے صرف بائیس خاندان تھے اب کئی سو بلکہ کئی ہزار اس قسم کے مگرمچھ پیدا ہو گئے ہیں جو عوام کی ہڈیوں کو چبانا اپنا پیدائشی حق تصور کرنے لگے ہیں۔ جب تک حکومت ایسے بالغ نظر اور تعلیماتِ اسلامی پر یقین محکم رکھنے والوں کے ہاتھوں میں نہیں آئے گی، اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

حضور سرورِ عالم ﷺ پر جو کتابِ مقدس نازل ہوئی تھی، اس میں بار بار سرمایہ دارانہ ذہن کی سفاکیوں، فتنہ انگیزیوں اور مفسدہ پردازیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ

فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ (اسراء)

''اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اس کے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں اس میں۔ پس واجب ہو جاتا ہے ان پر (عذاب کا) فرمان۔ پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیتے ہیں''۔

سورۂ سبا میں ہے کہ دولت کی فراوانی کے باعث ان کے امراء و اغنیاء کے ذہن اتنے بانجھ ہو گئے تھے کہ جو انبیاء اپنی صداقت کی روشن نشانیاں لے کر مبعوث کیے گئے تھے اور جن کی آمد کا مقصد صرف یہ تھا کہ انہیں ان بدکاریوں کے ہولناک انجام سے بروقت متنبہ کریں، انہوں نے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور اپنی غلط فہمی کا برملا اظہار کر دیا کہ ان کے پاس دولت کی فراوانی ہے، ان کے بیٹوں کی تعداد کافی ہے، کوئی طاقت انہیں سزا نہیں دے سکتی۔ ارشاد ربانی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾ (السباء)

''یعنی جب ہم کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجتے ہیں تو وہاں کا دولت مند طبقہ برملا کہہ دیتا ہے کہ اے رسولو! ہم تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہمارے پاس دولت کے انبار ہیں اور اولاد کثیر ہے ہمیں کوئی عذاب نہیں دیا جا سکتا''۔

اس لیے اسلامی معاشرے میں سرمایہ داروں کے پنپنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کی جو حماقت اشتراکیت نے کی ہے، اسلام کا دامن اس سے بھی یکسر منزہ ہے۔ روس میں اشتراکی انقلاب کو برپا ہوئے پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ انفرادی ملکیت کو ختم کرنے کے لیے بڑے ہی پاپڑ بیلے گئے ہیں اور مظالم کی انتہا کر دی گئی ہے۔ صرف روس میں نجی جائیداد کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کروڑوں روسیوں کا خون بہایا گیا ہے، لیکن انسانی فطرت کو مسخ کرنے یا بدلنے کی

Marfat.com

مہم میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اسلام جس طرح عقیدہ، تقریر اور تحریر کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے بلکہ اس کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، اسی طرح وہ انسان کی حریت عملی پر بے جا پابندیاں لگانے کا قائل نہیں۔ جب تک کوئی شخص اسلام کی وضع کردہ حدود کو پامال نہیں کرتا، وہ اپنی تخلیقی، تعمیری قوتوں کو بروئے کار لانے میں بالکل آزاد ہے اور اسلام اس کو اس آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور وہ اپنے عمل سے جو جائز ثمرات حاصل کرے گا اس کی حفاظت کا اس سے عہد کرتا ہے۔ اگر مملکت اسلامیہ کا کوئی شہری قواعد وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے جائز اور حلال ذرائع سے دولت کماتا ہے، تو اسلام ایسے شخص کو معاشرہ کا بہترین فرد شمار کرتا ہے لیکن اس طرح کی کمائی ہوئی دولت کو بھی ایسے حکیمانہ انداز سے ایک ہاتھ سے لے کر متعدد اشخاص میں بانٹ دیتا ہے کہ دولت کی فراوانی سے جن برے نتائج کے ظہور کا خطرہ ہوتا ہے ان کا سدباب بھی ہو جاتا ہے اور کسی کی دل شکنی اور دل آزاری بھی نہیں ہوتی اور کسی کے جوش عمل میں بھی کوئی ضعف پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام کا نظامِ وراثت و وصیت وہ ہے جس میں متوفی کی متروکہ، منقولہ اور غیر منقولہ دولت اس کے بیٹوں، اس کی بیٹیوں، اس کی بیوی، اس کے ماں باپ اور بعض حالتوں میں کئی دوسرے قریبی رشتہ داروں میں بٹ جاتی ہے۔ وصیت کے ذریعے وہ اپنی دولت متروکہ کا ایک تہائی حصہ غیر وارثوں کو بھی دے سکتا ہے۔ اسلام ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ صرف بڑا بیٹا جدی جائیداد کا وارث ہو اور باقی اولاد کو محروم کر دیا جائے یا صرف بیٹوں کو وراثت میں حصہ ملے اور بیٹیوں کو محروم کر دیا جائے یا کوئی شخص کسی ترنگ میں آ کر اپنے وارثوں کو محروم کر دے اور غیر وارث کو ساری جائیداد کا مالک بنا دے، جس طرح یورپ کے ''مہذب وشائستہ'' لوگ ساری جائیداد اپنے کتوں اور بلیوں کے نام وصیت کر جاتے ہیں اور اپنے وارثوں کو محروم کر دیتے ہیں۔

ہر ملک میں خواہ معاشی طور پر ترقی یافتہ ہی کیوں نہ ہو، ایک طبقہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو بعض ناگزیر وجوہات کے باعث افلاس وتنگدستی کا شکار ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی کفالت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے صاحب حیثیت لوگوں پر ڈالی ہے۔ جہاں اپنی عبادت کا ذکر کیا ہے،

وہاں حاجت مند کی اعانت کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور متعدد مقامات پر اس کی تصریح کی ہے کہ اسلام کی نظر میں صرف رسومِ عبادت کو بجالانا ہی نیکی نہیں ہے بلکہ صدقِ دل سے ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اپنے رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں میں مال تقسیم کرنا حقیقی نیکی ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ (بقرہ۔۱۷۷)

''نیکی بس یہی نہیں کہ نماز میں تم اپنا رخ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ نیکی کا کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر اور دے اپنا مال اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں کو اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں''۔

سورۂ مدثر میں بڑے مؤثر پیرائے میں اس حقیقت کو ایک نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ اہلِ جنت اہلِ جہنم سے پوچھیں گے: مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ ۝ (مدثر) تمہیں کون سا جرم دوزخ میں لے گیا، تو وہ جواب دیں گے: قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ ۝ (مدثر) ''کہ ہم اس جرم کی پاداش میں دوزخ کا ایندھن بنا دیے گئے کہ ہم اپنے پروردگار کی جناب میں سجدہ نہیں کیا کرتے تھے اور مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے''۔ گویا قرآنِ کریم کی نظر میں نماز ادا نہ کرنا اور کسی غریب کی ضروریاتِ زندگی کو بہم نہ پہنچانا دونوں یکساں نوعیت کے گناہ ہیں۔

بلکہ سورۂ ماعون میں بڑی وضاحت سے بتادیا کہ جو شخص یتیموں کی توہین کرتا ہے، ان کو اپنے ہاں سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مساکین وغرباء کی بنیادی ضرورتوں کو بہم پہنچانے کی ترغیب نہیں دلاتا، وہ قیامت پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۝

Marfat.com

(الماعون) جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق سے غریبوں کی امداد نہیں کرتے اور ان کی ضرورت کی بہم رسانی میں اپنا فرض ادا نہیں کرتے، ان کے بارے میں قرآنِ حکیم کے دل دہلا دینے والے ارشادات سماعت فرمائیے۔ ارشاد ہے:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾

''اس (نابکار) کو پکڑ لو۔ اس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دو، پھر اسے ستر گز لمبے زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ (بدبخت) خداوند عظیم پر ایمان نہیں لایا تھا اور نہ ہی وہ غریبوں کو خوراک مہیا کرنے کی ترغیب دیا کرتا تھا''۔ (الحاقۃ)

ان آیات میں جو رعب اور جلال ہے، اس سے دل کانپ اٹھتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک منصف مزاج انسان پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اسلام نے انسان کی مادی ضروریات کو انتہائی اہمیت دی ہے اور جو شخص اپنے ضرورت مند بھائیوں کی امداد کی طرف متوجہ نہیں ہوتا وہ قیامت کا منکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں رکھتا اور اس کا ان برکتوں میں کوئی حصہ نہیں جو اسلام کے زیرِ سایہ انسان کو نصیب ہوتی ہیں۔ اسلام نے صرف پند و موعظت پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ قانونی طور پر ضرورت مند لوگوں کی کفالت کو اسلامی معاشرہ پر لازم قرار دے دیا ہے، جس کی ادائیگی ہر شخص پر حسبِ حیثیت لازم ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اسالیب سے ضرورت مند لوگوں کی امداد کا دلوں میں شوق پیدا کر دیا۔ کہیں فرمایا کہ ان لوگوں کی امداد کے لیے جو تم خرچ کرتے ہو، وہ گویا تم اپنے پروردگار کو قرض دے رہے ہو جو تمہیں یقیناً واپس ملے گا۔ کہیں فرمایا کہ تم اگر اپنے ضرورت مند بھائیوں کی امداد کے لیے ایک روپیہ خرچ کرو گے، تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض کم از کم دس گنا تمہیں عطا فرمائے گا اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

ذرا اس آیت کو بھی گوشِ ہوش سے سماعت فرمائیے۔ اس آیت کو سننے کے بعد اور اس کو سمجھ لینے کے بعد دل میں ایسا ولولہ اٹھتا ہے کہ ہر چیز اپنے ضرورت مند بھائیوں کی امداد

Marfat.com

کے لیے لٹادینے کو جی چاہتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ (بقرہ)

''یعنی ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو جو اگے اور اس میں سات خوشے لگیں اور ہر خوشہ میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے''۔

یہی وہ پاکیزہ تعلیمات تھیں، یہی وہ صحیح تربیت تھی، یہی وہ قرآن کا اعجاز تھا اور یہی وہ اسلام کا روح پرور نظام تھا جس نے ان قوموں کی کایا پلٹ دی جنہوں نے اس کو قبول کیا اور ان ملکوں کو جنت نظیر بنا دیا جہاں اس کا برکتوں والا پرچم لہرایا۔

قرآنِ کریم کی اعجاز آفرینی آج بھی اپنے شباب پر ہے۔ اسلام کی برکتوں اور سعادتوں کا چشمۂ شیریں آج بھی ابل رہا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ادائے رحمۃ للعالمینی اتنی وسیع ہے کہ ستم رسیدہ، افلاس گزیدہ انسانیت کو اس کے ظل عاطفت میں پناہ مل سکتی ہے بشرطیکہ ہم منافقت کو ترک کر دیں۔ شک وارتیاب کی دلدل سے اپنے آپ کو نکال لیں۔ ایمانِ صادق اور یقین محکم سے ان تعلیمات کو اپنا لیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ کریم، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمارے لیے، بلکہ ساری دنیائے انسانیت کے لیے نازل فرمائی ہیں۔ جس مبارک ہستی کا ہم یومِ میلاد منا رہے ہیں اس کے ساتھ محبت اور عقیدت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لائے ہوئے دین پر خود عمل پیرا ہوں اور دوسروں کے لیے راہِ حق پر گامزن ہونے کا دلکش نمونہ پیش کریں۔ اس محسن انسانیت کو یہ دین اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اس کے احکام کی تبلیغ کے لیے کون سا ستم ہے، جو محبوبِ رب العالمین نے برداشت نہیں کیا؟ کون سی مصیبت ہے جسے گوارا نہیں کیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس پاؤں میں کانٹے چبھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے لیے کفار نے ان گنت منصوبے بنائے، اپنے وطن سے نکالا، بارہا مدینہ طیبہ پر چڑھائی کی، ان جنگوں میں نبی

Marfat.com

اکرم ﷺ کے پیارے صحابہ اور عزیز رشتہ دار شہید ہوئے۔ ان تمام مصائب و آلام کو اس رحمت عالمیان نے بخوشی گوارا کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کا نام اونچا ہو اور اس کا دین پھیلے تا کہ انسانیت کی نکبت اور زبوں حالی کا دور ختم ہو اور صبح سعادت طلوع ہو۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کی محبت کا دم بھرتے ہیں، حضور ﷺ کی غلامی کے رشتہ پر ناز کرتے ہیں تو ہمارا یہ فرضِ اولین ہے کہ ہم سب راعی اور رعایا، حضور ﷺ کے اس یوم میلاد کو اس عزم کے ساتھ منائیں کہ ہم دین حق کی جو شمع اس سہانی گھڑی فروزاں کی گئی تھی، اس سے اپنی تاریک دنیا کو بھی منور کریں گے۔ ظلم، جہالت، گمراہی کا اندھیرا جہاں جہاں خیمہ زن ہے، اس کا قلع قمع کر دیں گے۔ آج کی مادیت گزیدہ انسانیت کو اسلام کے تریاق کی اشد ضرورت ہے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پاکستان اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر اخلاقی بلندی، روحانی بالیدگی اور معاشی خوشحالی کا مرقع زیبا نہ بن جائے۔

اسلام کا سیاسی نظریہ

اور

بیعت صدیقی

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے سے پہلے جہاں کہیں کوئی حکومت قائم تھی وہاں ملوکیت کا نظام اپنی جملہ خرابیوں کے ساتھ نافذ تھا۔ بعض ممالک میں فوجی قوت اور مادی طاقت بادشاہوں کا سہارا تھی اور بعض ممالک میں بادشاہ نے اپنے بارے میں اپنی رعایا کے قلوب و اذہان پر تصور قائم کر رکھا تھا کہ ان کے بادشاہ، ان کے معبودوں کی اولاد ہیں اور ان کے احکام بجالانا اپنے خداؤں کے احکام بجالانے کی طرح ان پر لازم ہے۔ ایران، چین، جاپان اور کئی دیگر ممالک میں رعایا اپنے حکمرانوں کو صرف خراج ہی ادا نہیں کرتی تھی، بلکہ ان کی بندگی اور پرستش کو بھی اپنے لیے اخروی نجات کا ذریعہ یقین کرتی تھی۔
مقصد یہ تھا کہ ان کی رعایا صبر اور سکون کے ساتھ ان کے جور و ستم کو برداشت کرتی رہے، ان کی لوٹ کھسوٹ کے سامنے دم تک نہ مارے، ان کے شبستانِ عیش و نشاط کی رونقوں میں اضافہ کرنے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ ان بادشاہوں کے صرف حقوق تھے، جن کی ادائیگی ان کی رعایا پر ضروری تھی۔ ان پر اپنی عوام کی طرف سے کوئی فرائض عائد نہ ہوتے تھے، جن کے بارے میں وہ ان سے باز پرس کر سکیں۔ رعایا تنگ آ کر ایک ظالم اور ستم شعار بادشاہ کے خلاف تو بغاوت کر سکتی ہے لیکن اپنے معبود کے خلاف سرکشی کا تصور کسی پرستار کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

شرق و غرب میں جتنی شہنشاہیاں قائم تھیں ان میں تین چیزیں قدرِ مشترک ہیں:

۱۔ بادشاہ کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات ایک قانون ہے، جس کی خلاف ورزی جرم ہے۔

۲۔ بادشاہ ہر قسم کے قانونی مؤاخذہ سے بالاتر ہے۔ وہ بے گناہوں کے کشتوں کے پشتے لگا دے، وہ لوگوں کے مال و دولت پر ڈاکے ڈالتا رہے، وہ لوگوں کی عصمتوں کو برباد کرتا رہے، اس سے کوئی بھی باز پرس نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

۳۔ بادشاہ کا جانشین اس کا بیٹا یا اس کا قریبی وارث ہی ہو سکتا ہے۔ شاہی خاندان کے علاوہ کوئی شخص بھی قصرِ شاہی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ خواہ علم و فضل، معاملہ فہمی، عاقبت اندیشی میں وہ اپنی نظیر نہ رکھتا ہو۔

اس غلط نظام کے باعث کروڑوں لوگ ایک آدمی کے رحم و کرم پر اپنی زندگیاں بسر کرتے۔ وہ اس نظام کی سنگدلیوں سے شکوہ بلب ضرور تھے، لیکن انہوں نے اسے ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ ان کے ذہن میں اس نظام سے رستگاری حاصل کرنے کا کبھی حوصلہ ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں خوش آئند تبدیلیاں برپا کیں، وہاں ملوکیت کے نظام کو بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اس نے اپنے سیاسی نظام میں ملک اور بادشاہ کا لفظ ہی خارج کر دیا، کیونکہ ان لفظوں سے بھی خودسری، مطلق العنانی اور حاکم حقیقی ہونے کی بو آتی ہے۔ اس نے خلیفہ کا لقب، سربراہِ مملکت کے لیے پسند فرمایا، جو ان تمام غلط تصورات سے بالاتر ہے۔ جس کا معنی نائب ہے اور نائب وہ ہوتا ہے جو اپنے مالک کی منشا اور مرضی کے مطابق اپنے اختیارات کو استعمال کرے۔ اس لفظی تبدیلی میں ہی حکمران طبقہ کے ناروا اور غیر محدود اختیارات پر ضربِ کاری لگا دی اور ان سے وہ تمام حقوق سلب کر لیے جن کے بل بوتے پر وہ مخلوقِ خدا پر مشق ستم کیا کرتے تھے۔

دوسری تبدیلی یہ کی کہ حکم، سلطانِ وقت کا نہیں چلے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا چلے گا، جو سب کا خالق و مالک ہے۔ خلیفہ کا کام ہے بادشاہ حقیقی، رب العالمین کی منشا کے مطابق ملک میں امن و امان برقرار رکھنا، عدل و انصاف کی بالادستی قائم کرنا، حقوق و فرائض میں ہم آہنگی کو ہر لحظہ پیش نظر رکھنا۔

تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ مسند حکومت کسی کی ذاتی جاگیر نہیں کہ اس کے بعد اس کا بیٹا یا دوسرا کوئی قریبی وارث اس پر متمکن ہو جائے، بلکہ یہ منصب لوگوں کا حق ہے۔ اپنے میں سے جس کو وہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے موزوں خیال کریں، اسے اپنا امیر اور سربراہ

Marfat.com

مملکت چن سکتے ہیں۔

حضور رحمت عالم ﷺ نے نظامِ حکومت میں یہ دور رس انقلابی تجاویز اور پھر ان کو عملی جامہ اس وقت پہنایا، جب کہ شرق و غرب میں کوئی مفکر اور دانشور ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ نبی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے **لَا قَیْصَرَ وَ لَا کِسْرٰی** کا لرزہ خیز اعلان اس وقت کیا، جب مشرق میں وسیع و عریض ممالک پر کسریٰ کی شہنشاہی کا پرچم لہرا رہا تھا اور مغرب میں قیصر کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ کیا کوئی انسان اس وقت یہ سوچ بھی سکتا تھا کہ بہت جلد وہ دن طلوع ہونے والا ہے، جب کہ نہ قیصریت رہے گی اور نہ کسرویت؟ نبی رحمت ﷺ نے اپنے دل نشین ارشادات سے اور اپنی تئیس سالہ پاکیزہ زندگی سے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ان نقوش کو راسخ کر دیا۔ انہیں اپنے آقا کے ارشادات پر یقین محکم تھا۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ سیاست کی پہلی بساط الٹ دی جائے گی۔ اب انسانوں کو بھیڑوں بکریوں کا ریوڑ سمجھنے والے بادشاہ ان پر حکومت نہیں کریں گے، بلکہ جس کو اب وہ مناسب سمجھیں گے اس منصب پر فائز کر دیں گے۔

سرورِ دو عالم ﷺ کی موجودگی میں ہی ایک اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آ چکی تھی، جو حجاز، یمن اور دیگر ملحقہ علاقوں پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کی تحقیق کے مطابق اس اسلامی سلطنت کا رقبہ دس لاکھ مربع میل تھا۔ حضور ﷺ نے اپنی جانشینی کے لیے نام لے کر کسی کو نامزد نہیں کیا بلکہ **وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ** کے فرمانِ الٰہی کے مطابق امیر کے انتخاب کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا تا کہ وہ جس کو اس منصب کا اہل خیال کریں اسے منتخب کریں۔

نظامِ حکومت کے بارے میں مسلمانوں میں سے دو مختلف مکتب فکر قدیم زمانہ سے موجود ہیں۔ ایک مکتب فکر اہل سنت کا ہے، جو امت کا سوادِ اعظم ہے اور ایک دو ممالک کے علاوہ تمام اسلامی ممالک میں ان کی غالب اکثریت ہے۔ دوسرا مکتب فکر شیعہ حضرات کا ہے جنہیں ایران میں عددی کثرت میسر ہے، عراق میں بھی ان کی تعداد نصف کے لگ

Marfat.com

بھگ ہے، دیگر تمام اسلامی ممالک میں وہ اقلیت میں ہیں۔

اہل سنت کا مسلک وہی ہے جو اسلام کی انقلابی روح کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ریاست کی ذمہ داری اس شخص کو سونپی جاتی ہے، جس کو امت مسلمہ اپنی سربراہی کے لیے پسند کرے۔ اس میں سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سیدہ کی اولاد میں سے ہونا ضروری نہیں۔ اس میں میراث کا نظام بھی جاری نہیں ہوتا۔ یہی وہ چیز ہے جو اسلامی نظامِ سیاست کو دیگر سیاسی نظاموں سے ممتاز کرتی ہے لیکن شیعہ حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ خلافت مصالح عامہ میں سے نہیں تاکہ اسے عوام کے غور و تدبر کے سپرد کر دیا جائے اور اس کی تعیین کا اختیار امت کو دیا جائے بلکہ یہ دین کا ایک رکن ہے اور اسلام کا ایک بنیادی مسئلہ ہے اور نبی کے لیے جائز نہیں کہ خلیفہ کے تقرر میں غفلت برتے یا اس کے تقرر کی ذمہ داری عوام کے سپرد کرے۔

بَلْ يَجِبُ عَلَيْهِ تَعْيِيْنُ الْإِمَامِ لَهُمْ وَ يَكُوْنُ مَعْصُوْمًا مِنَ الْكَبَائِرِ وَ الصَّغَائِرِ۔

''یعنی نبی پر واجب ہے کہ وہ امام کا تعین کرے اور امام ایسا ہونا چاہیے جو کبائر وصغائر ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہو''۔

اور یہ ہستی سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے، پھر یہ بطور ورثہ حضرت سیدہ کی اولاد میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے اور ہر امام نص سے مقرر ہوتا ہے۔

اس نظریہ کے عملی پہلو کو چند لمحوں کے لیے رہنے دیجئے۔ اس کے نظری پہلو پر غور فرمائیے۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ اگر یہ نظریہ اسلام کا نظریہ ہے تو یہ قطعاً کوئی جدید اور انقلاب آفریں نظریہ نہیں، بلکہ اسی پرانے نظام ملوکیت کی ایک نئی شکل ہے۔ اسی ملوکیت کو مذہبی تقدس کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اگر وہاں قیصر کی اولاد، قیصر کی جانشین ہو سکتی ہے اور دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تو یہاں بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدہ کی نسل سے ہی کوئی شخص اس مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے، کسی غیر کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خود اس مسند پہ متمکن ہو جائے یا قوم زمامِ اقتدار اس کے ہاتھوں میں پکڑا دے۔

Marfat.com

اس نظریہ کا عملی پہلو شیعہ کے لیے بھی بڑی پریشانیوں اور ہولناک نتائج کا باعث ثابت ہوا۔ بہت جلد ان میں مذہبی تفرقہ بازی کا دروازہ کھل گیا۔ ہر فرقہ، دوسرے فرقہ کو گمراہ بلکہ خارج از اسلام قرار دینے لگا۔ اس طرح یہ مسلک مختلف اور متضاد اور متحارب گروہوں میں بٹتا چلا گیا۔ ان کا پہلا اختلاف تو خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ جن نصوص سے آپ کی امامت ثابت ہے، ان میں آپ کے ایسے اوصاف بیان ہوئے ہیں جو بجز آپ کے کسی میں نہیں پائے جاتے۔ اس رائے کے قائلین "زیدیہ" کہلاتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کو چھوڑ کر شیخین کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ نصوص کو سمجھنے میں اور ان کی تطبیق میں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ "زیدیہ" نہ شیخین سے برأت کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ان کی امامت پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے افضل سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں اور شیخین مفضول ہیں، لیکن افضل کی موجودگی میں مفضول امام مقرر ہو سکتا ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ جن نصوص سے آپ کی جانشینی ثابت ہے اس میں آپ کا نام لے کر تعیین کی گئی ہے، اس لیے آپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو خلیفہ مقرر کرنا ضلالت و گمراہی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد پھر وہ بٹ گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ امامت سیدہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد میں منحصر ہے اور ہر امام کا نام نصاً ثابت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سیدہ طاہر کی نسل سے امام کا ہونا تو ضروری ہے لیکن ہر ایک کا منصوص ہونا ضروری نہیں بلکہ اس خاندان کے شیوخ اپنے میں سے کسی ایسے شخص کو منتخب کر سکتے ہیں جو عالم، زاہد، سخی اور شجاع ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی امامت قبول کرنے کی اعلانیہ دعوت بھی دے۔ یہ نظریہ حضرت زید کا ہے، جو حضرت امام علی زین العابدین کے فرزند ہیں اور امام محمد باقر کے برادر گرامی ہیں۔ حضرات حسنین کریمین کے بعد امام منصوص کون ہے؟ اس میں پھر ان کا باہمی اختلاف ہے۔ بعض نے ان کے بھائی حضرت محمد بن حنیفہ کو امام مانا ہے۔ جیسے جیسے یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا، ان میں بھی امام کے بارے میں اختلاف پیدا ہونے لگے اور یہ بھی کئی فرقوں میں

Marfat.com

بٹ گئے۔ اسی طرح ''زیدیہ'' میں بھی باہمی انتشار پیدا ہو گیا۔

اب رہے امامیہ، تو ان کی کہانی بھی کسی سے کم عبرتناک نہیں۔ ان کے نزدیک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی وصیت سے حضرت حسن، پھر امام حسین، پھر امام زین العابدین پھر امام محمد باقر، پھر آپ کے صاحبزادے جعفر صادق، اس کے بعد پھر یہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ بعض نے آپ کے فرزند حضرت اسماعیل کو اور بعض نے حضرت موسیٰ کاظم کو امام منصوص مانا ہے۔ امامیہ اثنا عشریہ جو بڑی سختی سے اس عقیدہ پر قائم تھے کہ امام منصوص اور معصوم ہونا چاہیے، وہ بھی بمشکل گیارہویں امام حضرت حسن عسکری تک پہنچے۔ آگے وہ بھی اس سلسلہ کو دراز نہ کر سکے اور آخر کار انہیں امام غائب کا سہارا لینا پڑا جو بقول ان کے پانچ سال کی عمر میں اپنے دشمنوں کے خوف سے ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ یہ واقعہ ۲۶۰ھ کا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہ روپوش ہیں۔ ان کی تشریف آوری کی مختلف تاریخیں وقتاً فوقتاً مقرر کی جاتی ہیں، لیکن امام تشریف نہ لائے۔ شیعہ حضرات صدہا سال تک مغرب کے وقت اس مزعومہ غار کے دہانے پر اکٹھے ہوتے رہے، فریادیں کرتے رہے، منتیں مانتے رہے، لیکن بے سود۔

ہمیں ان کے عقیدہ پر اعتراض کا حق نہیں، وہ جو چاہیں عقیدہ اختیار کر لیں، کیونکہ ہر شخص اپنے عقیدہ کی جزا و سزا کا خود ہی متحمل ہوتا ہے، لیکن یہ سوچنے کا حق تو ہمیں بہر حال ہے کہ جن اغراضِ عالیہ اور مقاصد رفیعہ کی تکمیل کے لیے منصوص اور معصوم خلیفہ کا بالفعل وجود لازمی اور ضروری قرار دیا گیا تھا، تقریباً گیارہ صدیوں سے امام غائب ہیں، کیا ان اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو رہی ہے؟ جن نصوص کا سہارا لے کر اس عقیدہ کی عمارت تعمیر کی گئی تھی، کیا اب وہ منسوخ یا معطل ہو گئی ہیں؟ اتنے اہم اور ضروری کام کو قدرت نے یوں مسلسل کیوں نظر انداز کر رکھا ہے؟ ان کی غیر موجودگی میں امت گمراہی کے گڑھے میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا امام منتظر امت مسلمہ کی خستہ حالی کا مشاہدہ فرما رہے ہیں اور روٹھے بیٹھے ہیں؟ ہمیں تو یہ گتھی سلجھتی نظر نہیں آتی۔

Marfat.com

پھر غور طلب امر یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایک منصوص اور معصوم امام کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ کیا حضور نبی کریم ﷺ نے دین کا کام ادھورا اور نامکمل چھوڑا تھا، جس کی تکمیل کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے؟ کیا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کوئی کمی رہ گئی تھی (العیاذ باللہ) جس کی تکمیل کے لیے سیدنا امام حسن مجتبیٰ نے کی؟ ہمارا تو یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب کریم دین کی تکمیل کرنے کے بعد، شریعت مطہرہ کا محل مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرنے کے بعد، رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرما ہوا۔ اس کی تصدیق خود رب السموات والارضین نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں یہ آیہ کریمہ نازل کر کے فرما دی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

(مائدہ۔ ۳)

یہ دین قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے۔ باقی رہا ہر لحظہ پھیلتی ہوئی اسلامی دنیا میں اس کا نفاذ، ہر داخلی انتشار اور بیرونی یلغار سے اس کا تحفظ، یہ امت کی اجتماعی ذمہ داری ہے اور جس کو وہ موزوں اور اہل خیال کرے یہ خدمت انجام دینے کے لیے اس کو منتخب کر لے۔ اگر وہ عزم و یقین کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہتا ہے تو فبہا۔ ورنہ اس کو معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو یہ خدمت سپرد کی جاسکتی ہے۔ اگر ایران کے شیعہ، نظامِ اسلام کے نفاذ کے لیے جناب آیت اللہ خمینی کو اپنا راہنما اور امام مقرر کر لیتے ہیں اور ان کی جاندار اور دیدہ ور قیادت میں شہنشاہی کی لعنت سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور اسلامی بنیادوں پر ایک پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کا آغاز کر سکتے ہیں، حالانکہ خمینی کی امامت کسی نص سے بھی ثابت نہیں، وہ معصوم بھی نہیں اور دودمانِ سیادت سے بھی نہیں اور ابھی امامِ منتظر غار میں ہی قیام فرما ہیں۔ اگر آج کل ایک شخصیت امام کی غیر موجودگی میں یہ کارنامہ انجام دے رہی ہے تو ۲۶۰ھ سے لے کر ۱۳۹۹ھ تک اسلامی معاشرہ اتنا بنجر اور بانجھ تھا کہ ان میں کوئی مردِ کار اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے ظاہر نہیں ہوا؟ دل اس کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

Marfat.com

واقعات کی روشنی میں اگر ان آراء و افکار کا دقت نظر سے تجزیہ کیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ تقرر خلیفہ کے بارے میں جمہور امت (اہلسنت) کا نظریہ ہی صحیح ہے۔ دین فطرت کے اصول و قواعد اسی کی تصدیق کرتے ہیں۔

سرورِ عالمیاں ﷺ نے اپنی امت کو ایک کتاب مبین، ایک جامع نظام حیات اور ایک نوخیز مملکت عطا فرمائی، جس میں پھیلنے کی بے پناہ قوتیں موجود تھیں، جس مقصد گرامی کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا، اس کی تکمیل ہو چکی تھی، رفیق اعلیٰ کی طرف رجوع کرنے کی گھڑی قریب آ رہی تھی، بظاہر مصلحت کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضور ﷺ کسی کو اپنا جانشین مقرر فرما دیتے۔ حضور ﷺ جسے بھی مقرر فرما دیتے، سب صدقِ دل سے اسے قبول کر لیتے، لیکن اگر ایسا کیا جاتا تو سیاست کی سنگلاخ اور اداس وادیوں میں روح پرور تبدیلیوں اور خوش آئند انقلابات کے جو گلشن نگاہِ مصطفوی ﷺ نے سجائے تھے ان کا حسن ماند پڑ جاتا۔ اس عمل کو سند بناتے ہوئے ہر حاکم جس کو چاہتا اپنا جانشین بنا لیتا۔ یوں جمہوریت کی روح نشو و نما پانے سے پہلے ہی کچل دی جاتی۔ اس لیے رحمت عالم ﷺ نے اپنی امت پر بلکہ ساری نوع انسانی پر کرم فرماتے ہوئے کسی کو نامزد نہیں کیا، لیکن ایسے اشارات ضرور فرما دیے جن سے ہر ذی فہم حضور ﷺ کا مدعا بآسانی سمجھ سکتا۔ چنانچہ آخری علالت میں جب نقاہت زیادہ ہو گئی اور مسجد میں جا کر امامت کرنا مشکل ہو گیا تو کریم آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مُرُوْا اَبَابَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ.

''یعنی ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں''۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ابوبکر بڑے نرم دل ہیں۔ جب وہ آپ کے مصلیٰ پر کھڑے ہوں گے تو ان پر گریہ و رقت طاری ہو گی اور لوگ ان کی قرأت کو نہ سن سکیں گے۔

قَالَ مُرُوْا اَبَابَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ فَاِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوْسُفَ.

Marfat.com

حضور ﷺ نے سختی سے حکم دیا کہ ابوبکر کو کہو وہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔ بے شک تم وہی عورتیں ہو جنہوں نے یوسف کو بہکانا چاہا تھا۔ (طبقات ابن سعد، جلد 2، صفحہ 224)

حضور ﷺ کے اس ارشاد سے اہل فہم کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہ رہا کہ اس موقع پر صدیق رضی اللہ عنہ کو خصوصی طور پر اپنے مصلے پر کھڑا کرنا اور تمام حلقہ بگوشانِ اسلام کو، جن میں سیدنا علی اور خاندان بنی ہاشم کی دوسری عظیم المرتبت ہستیاں بھی تھیں، ان سب کو آپ کی اقتداء میں نماز ادا کرنے کا حکم دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے اور یہ نیابت ایک دفعہ یا دو دفعہ نہیں، بلکہ حضور ﷺ کی موجودگی میں سترہ نمازوں کی آپ نے امامت کرائی اور حضور ﷺ اس منظر کو دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے:

لَمَّا ثَقُلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ اَبِىْ بَكْرٍ وَ قَالَ ائْتِنِىْ بِكَتِفٍ حَتّٰى اَكْتُبَ لِاَبِىْ بَكْرٍ كِتَابًا لَا يُخْتَلَفُ عَلَيْهِ فَذَهَبَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ لِيَقُوْمَ فَقَالَ اِجْلِسْ. اَبَى اللّٰهُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اَنْ يُخْتَلَفَ عَلٰى اَبِىْ بَكْرٍ۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۸۰ دار بیروت)

"جب حضور کریم ﷺ کی طبیعت زیادہ ناساز ہوئی تو حضور ﷺ نے عبد الرحمن بن ابی بکر کو حکم دیا کہ وہ کندھے کی ہڈی لے آئیں تا کہ ابوبکر کے لیے میں لکھ دوں، تا کہ کسی کو مجالِ اختلاف نہ رہے۔ عبد الرحمن اٹھنے لگے، فرمایا! بیٹھ جاؤ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اور مسلمان انکار کرتے ہیں کہ ابوبکر کے بارے میں اختلاف کیا جائے"۔

آخر وہ جاں فرسا لمحہ آ ہی گیا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دلوں کو سوگوار، روحوں کو بے قرار اور دیدہ ہائے شوق کو اشکبار چھوڑ کر، عالم فانی سے منہ موڑ کر عالم بقا کی طرف روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کے لیے یہ لمحے قیامت سے کم نہ تھے۔ جس کو ایک لمحہ دیکھے بغیر ان کو قرار نہیں آتا تھا، کیا وہ روئے زیبا انہیں پھر کبھی نظر نہ آئے گا؟ یہ تصور کر کے وہ کانپ جاتے۔ ان کے دلوں پر کلہاڑے چلنے لگتے۔ بعض تو اپنے ہوش وحواس بھی فرطِ غم سے کھو بیٹھے تھے۔

Marfat.com

سنح، مدینہ طیبہ کے نواح میں ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ وہاں رہائش پذیر تھے۔ بارہ ربیع الاول ۱۱ ھ صبح کی نماز مسجد نبوی ﷺ میں ادا کی۔ اس روز حضور ﷺ کا مزاج گرامی سنبھلا ہوا تھا۔ آپ واپس سنح چلے گئے۔ چاشت کے وقت سانحۂ ارتحال پیش آیا۔ ایک صحابی دوڑتے ہوئے گئے اور جا کر آپ کو اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع دی۔ آپ فوراً واپس لوٹے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا، صحابہ کی حالت غیر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خصوصاً اپنے آپ میں نہیں۔ حجرۂ مبارکہ میں حاضر ہوئے جہاں رحمت عالم کا جسد اطہر رکھا ہوا تھا۔ چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی، جبین سعادت پر بوسہ دیا، دل نیاز کیش کی طرف سے بارگاہ جمال میں ہدیۂ نیاز وعقیدت پیش کیا اور باہر آ گئے۔ صحابہ کے مجمع میں ایک مختصری تقریر فرمائی، جس سے صحابہ کرام کو کچھ صبر وقرار نصیب ہوا۔ دین کے غیر محفوظ مستقبل کے بارے میں جو اندیشے انہیں پریشان کر رہے تھے، ان کی تخفیف ہوگئی۔ اسی اثناء میں ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، جس نے آ کر یہ خبر سنائی کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار جمع ہیں اور وہ سعد بن عبادہ (رئیس قبیلہ خزرج) کو اپنا امیر بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اب سب ان کی بیعت کرنے والے ہیں۔ آپ ہی بتایئے، کیا ابوبکر اور عمر یہ سن کر بھی وہاں بیٹھے رہتے اور سقیفہ میں نہ جاتے اور انصار کو اپنی من مانی کرنے دیتے؟ اگر اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنا دیا جاتا اور انصار حضرت سعد کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تو اس کے نتائج کتنے تباہ کن ہوتے؟ شاید آپ میں یہ ہمت ہو کہ آپ بادِ صرصر کے تند جھونکوں کو گلشن اسلام کی بیخ کنی کی اجازت دے دیں اور اس منظر کا بخوشی مشاہدہ کرتے رہیں، لیکن ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما یقیناً ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ باغ، ان کے محبوب آقا نے لگایا تھا۔ اپنے خونِ ناب سے، اپنے پاک آنسوؤں سے اس کی آبیاری کی تھی اور اسے جواں کیا تھا۔ اپنے مرشد کی معیت میں انہوں نے بھی اپنی زندگیاں، اپنی توانائیاں اور جملہ صلاحیتیں اس دین حق کو پروان چڑھانے میں صرف کی تھیں۔ ان کا ایمان انہیں مجبور کر رہا تھا کہ یہاں مت بیٹھو، بلکہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس خطرے کے مقام پر پہنچو، جہاں نوزائیدہ اسلام کو خطرہ درپیش

Marfat.com

ہے۔ اسلام سے قلبی تعلق اور اپنے آقا سے جو عہد وفا انہوں نے باندھا تھا، دونوں کو کشاں کشاں وہاں لے گیا۔ آپ کا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ آپ اپنی خلافت کی بیعت لوگوں سے لیں۔ آپ نے تو ایک فتنہ کی آگ بھڑک اٹھنے کی وحشت ناک خبر سنی تھی۔ اس کو بجھانے کے لیے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ حالات نے اچانک ایسا رخ اختیار کیا کہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ آپ لوگوں کی بیعت کو قبول کریں۔ ایک لمحہ کی تاخیر کئی محشر بپا کر سکتی تھی۔

چودہ صدیوں کے بعد آج یہ الزام لگانا کہ آپ حضور کو یونہی چھوڑ کر چلے گئے، انہیں خلافت کا لالچ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہ تھی، یہ الزام انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ جس شخص نے اپنا تن، من، دھن، سب کچھ اپنے ہادیٔ برحق کے قدموں پر نثار کر دیا ہو، جس نے ہر پر خطر موقع پر اپنے آقا کا ساتھ دیا ہو، دنیا کی صحبت میں کوئی بھی جس کے صدق و وفا کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو، ایسی ہستی کے بارے میں اس قسم کا تصور بھی دل میں پیدا ہو تو اسے شیطان کی وسوسہ اندازی یقین کرنا چاہیے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جو کچھ ہوا، حالات نے جس تیزی سے کروٹ لی اور اس پر جو انمٹ نتائج مرتب ہوئے، ان کی تاریخی اہمیت ناقابل انکار ہے اور اس تاریخی حیثیت نے اس واقعہ کو ایک چیستان بنا کر رکھ دیا ہے۔ طرح طرح کی روایات کا ایک طومار ہے، جس میں حق کو باطل سے جدا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہاں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے ہم آگے بڑھیں گے۔ ہر قول و حکایت کو روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھیں گے، تاکہ حقیقت کا رخِ زیبا نکھر کر سامنے آجائے۔ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا۔

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

ہر زمانہ کا تالیف و تصنیف کا انداز جدا جدا ہوتا ہے۔ اگر ان خصوصیات کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو ان کتب سے صحیح استفادہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دیگر علوم کی کتب کی طرح تاریخ کی کتب جو مختلف زبانوں میں مرتب کی گئیں، ان کا

Marfat.com

اسلوبِ نگارش بھی جدا جدا ہے۔ آج کل تاریخ کی کتب لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک واقعہ کے بارے میں مختلف اقوال مروی ہوں تو مصنف ان میں سے اپنا پسندیدہ قول نقل کر دیتا ہے اور دیگر اقوال نقل کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا، لیکن قدماء مؤرخین کا یہ اسلوب نہ تھا۔ انہیں ایک واقعہ کے بارے میں جتنے اقوال ملتے، وہ ان سب کو ضبط تحریر میں لاتے اور اس کو وہ اپنی علمی دیانت سمجھتے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر روایت کی سند بھی بتمامہ نقل کر دیتے اور قاری سے یہ توقع رکھتے کہ وہ خود فیصلہ کر لے کہ ان میں سے کون سا قول صحیح ہے اور کون سا غلط۔ ہمارے طلباء جو آج کل کے مؤرخین کی تصنیفات کے مطالعہ کے عادی ہیں، وہ اس صورتِ حال سے واقف نہیں۔ ہر قول، جو وہ کسی کتاب میں دیکھتے ہیں، اسے مصنف کے سر تھوپ دیتے ہیں کہ طبری نے اپنی تاریخ میں یا ابن اثیر نے الکامل میں یا ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں یوں لکھا ہے۔ بے شک لکھا ہے، لیکن ساتھ اس کی سند بیان کر کے اس نے اپنی مؤرخانہ ذمہ داری پوری کر دی۔ اب یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے کہ ہم سوچیں اور صحیح و سقیم میں امتیاز کریں۔

اب چلیے، ہم آپ کو سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف لے چلتے ہیں، وہاں جو واقعات رونما ہوئے ان کے بارے میں مختلف روایات آپ کے گوش گزار کرتے ہیں، پھر آپ کی عقل سلیم کو زحمت دیں گے کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ ان میں سے کون سی بات قابل اعتماد ہے۔

پہلے ہم آپ کی خدمت میں طبری کی روایت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، جس کی ابتداء انہوں نے یوں کی ہے:

حدثنا ھشام بن محمد عن ابی مخنف...... الخ

یعنی یہ واقعہ بیان کیا ہم سے ہشام بن محمد نے، اس نے ابو مخنف سے روایت کیا۔

اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا، جس میں حضرت سعد بن عبادہ نے بھی شرکت کی۔ بیماری کے باعث اپنے بیٹے کو اپنا متکلم بنایا۔ تقریر میں انصار کی خدمات کے طویل

Marfat.com

تذکرے کے بعد بتایا کہ انصار خلافت کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ حضور ان کی خدمات سے ہمیشہ خوش ہوئے اور جب یہاں سے رخصت ہوئے تو بھی ان سے خوش تھے۔ سب نے ان کی تائید کی اور فیصلہ کن انداز میں کہا: ہم تمہیں اپنا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ ابھی گفتگو کا سلسلہ شروع تھا تو اس امکان پر بحث چھڑ گئی کہ اگر مہاجرین نے اسے نہ مانا تو پھر کیا ہوگا۔ بعض نے کہا اس صورت میں ہم کہیں گے:

اِذًا مِنَّا اَمِیْرٌ وَ مِنْکُمْ اَمِیْرٌ۔

کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے ہو۔

سعد نے سن کر کہا: یہ پہلی کمزوری ہے۔ ایک آدمی بھاگا ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، سارا ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو باہر بلایا اور سقیفہ کے حالات سے آگاہ کیا۔ دونوں بڑی سرعت سے ادھر روانہ ہوئے۔ راستہ میں ابوعبیدہ بھی مل گئے، ان کو بھی ہمراہ لے لیا۔ وہاں پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقریر کرنا چاہی لیکن حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلے مجھے کچھ کہہ لینے دو۔ آپ نے مہاجرین کے حقوق کا تذکرہ کیا۔ انصار کے مناقب بھی بیان کیے۔ آخر میں فرمایا:

فَنَحْنُ الْاُمَرَاءُ وَ اَنْتُمُ الْوُزَرَاءُ۔

یعنی ہم مہاجرین امیر ہیں اور تم ہمارے وزیر ہو۔

یہ سن کر حضرت خباب بن منذر اٹھ کھڑے ہوئے اور گویا ہوئے۔ انہوں نے انصار کو خوب اکسایا، کہ وہی امامت کے مستحق ہیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔ یہ شہر ان کا ہے، ان زمینوں، باغات کے وہ مالک ہیں، یہاں تعداد میں وہ زیادہ ہیں، مہاجرین غریب الدیار ہیں، تم نے انہیں اپنے ہاں پناہ دی ہے، اور اگر یہ اقتدار میں حصہ دار بننے پر اصرار کریں تو:

مِنَّا اَمِیْرٌ وَّ مِنْھُمْ اَمِیْرٌ۔

تو پھر ایک امیر ہم میں سے اور ایک ان میں سے۔

Marfat.com

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں۔ بخدا! اہل عرب تمہاری امامت کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے، جبکہ ان کے رسول قریش سے ہیں۔ حضرت خباب پھر اٹھے اور انصار کو مہاجرین کے خلاف خوب بھڑکایا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مہاجرین نے تمہارے اس دعویٰ کو تسلیم نہ کیا تو انہیں مدینہ طیبہ سے جلاوطن کر دیں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی جوابا دھمکی دی۔ حضرت ابوعبیدہ نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اِنَّكُمْ اَوَّلُ مَنْ نَصَرَ وَ اٰزَرَ فَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ مَنْ بَدَّلَ وَ غَيَّرَ۔

اے گروہِ انصار! تم نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے رسول کی مدد اور اعانت کی۔ پس اب اس کو تبدیل کرنے کا آغاز تم سے نہیں ہونا چاہیے۔

یہ سن کر بشیر بن سعد کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے: اے گروہِ انصار! ہم نے جو خدمات انجام دی ہیں، ہم اس سے دنیاوی مفاد ہرگز حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا ارادہ تو فقط یہ ہے کہ ہمارا پروردگار ہم پر راضی ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت کی توفیق مل جائے۔ (یہاں یہ بھی ذکر کیا کہ) اوس نے خزرج کی برتری سے بچنے کے لیے آپ کی بیعت کی۔

انہی دو صاحبان (ہشام اور ابی مخنف) نے ایک دوسری روایت میں کہا ہے کہ حضرت سعد اپنی ہٹ پر پکے رہے اور کہا: بخدا! میں بیعت نہیں کروں گا، جب تک میری ترکش کا آخری تیر بھی ختم نہ ہو جائے۔ یہاں یہ بھی مذکور ہے:

وَ كَانَ سَعْدٌ لَا يُصَلِّيْ بِصَلٰوتِهِمْ وَ لَا يُجَمِّعُ مَعَهُمْ وَ لَا يَحُجُّ وَ لَا يُفِيْضُ مَعَهُمْ۔ (طبری ص ۲۱۰ ج ۲) (مطبوعہ لوائع التراث العربی)

''یعنی سعد مسلمانوں کے ساتھ نماز بھی نہیں پڑھتے تھے۔ نہ ان کے ساتھ جمعہ ادا کرتے تھے، نہ حج کرتے تھے، نہ ان کے ساتھ افاضہ کرتے''۔

ان روایات کے مطالعہ سے قارئین کے دل میں انصار کے بارے میں بالعموم اور

Marfat.com

حضرت سعد بن عبادہ اور خباب بن منذر کے بارے میں بالخصوص طرح طرح کی غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ یعنی سب صحابہ اقتدار کے بھوکے تھے، اس کے لیے مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ خباب نے مہاجرین کو مدینہ طیبہ سے نکال کر باہر کرنے کی بار بار دھمکیاں دیں اور اپنی قوم کو ان کے خلاف خوب بھڑکایا۔ حضرت سعد نے بھی پورا پورا زور لگایا کہ وہ خلیفہ بن جائیں اور جب اس مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو ساری عمر الگ تھلگ بسر کر دی۔ غصہ اور ناراضگی کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز ادا کرنے اور جمعہ پڑھنے کے روادار نہ تھے۔ قبیلہ اوس نے بے شک حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، لیکن اس لیے نہیں کہ وہ اس منصب جلیل کے اہل ہیں، بلکہ بنوخزرج کے حسد کے باعث انہیں گوارا نہ تھا کہ خلافت کا منصب انہیں ملے۔ اس طرح کے کئی وسوسے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں اور اگر صورتِ حال درحقیقت ایسی ہی تھی تو پھر ان لوگوں کو تلاش کرنے میں ہماری مدد کیجیے، جن کے مناقب رفیعہ اور اوصافِ جمیلہ سے قرآن کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ جن کی للّٰہیت، جن کی خداشناسی، جن کے جذبۂ ایثار و خلوص پر نہ صرف امت مسلمہ کو بلکہ پوری انسانیت کو ناز ہے۔

لیکن جو اہل علم، علامہ ابن جریر اور ان کے ہمعصر مؤلفین کے اندازِ تالیف کو جانتے ہیں، وہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا شکار نہیں ہوتے۔ انہیں علم ہے کہ ابن جریر نے اس روایت کو سند کے ساتھ ذکر کیا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راویوں کے بارے میں تحقیق کریں کہ ان کی مرویات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس روایت کے پہلے راوی ہشام بن محمد ہیں۔ یہ کون ہیں اور ان کے استاد مکرم ابو مخنف کون بزرگوار ہیں؟ یہ علم ہو جائے تو غلط فہمی کی بدلیاں از خود چھٹ جائیں گی اور حقیقت عیاں ہو جائے گی۔

حافظ شمس الدین الذہبی اپنی کتاب میزان الاعتقاد فی نقد الرجال میں لکھتے ہیں کہ اس کا پورا نام ہشام بن محمد بن السائب الکلبی ہے۔ علمائے جرح و تعدیل نے ان کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

Marfat.com

قَالَ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ: اِنَّمَا کَانَ صَاحِبَ سَمَرٍ وَ نَسَبٍ۔ مَا ظَنَنْتُ اَنَّ اَحَدًا یُحَدِّثُ عَنْهُ۔ قَالَ الدَّارَ قُطْنِیُّ وَ غَیْرُهٗ: مَتْرُوْکٌ۔ قَالَ ابْنُ عَسَاکِرَ: رَافِضِیٌّ، لَیْسَ بِثِقَةٍ۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۵۶ مطبوعہ)

یعنی امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ وہ قصہ گو اور نسب بیان کرنے والا تھا، میں یہ خیال نہیں کرتا کہ کوئی شخص اس سے حدیث روایت کرتا ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ ابن عساکر کی رائے ہے کہ وہ رافضی ہے۔ غیر ثقہ ہے۔

اب ان کے استاد کے بارے میں سنیے۔ ابو مخنف کا نام لوط بن یحیٰ ہے۔

وَ قَدْ کَانَ شِیْعِیًّا وَ هُوَ ضَعِیْفٌ عِنْدَ الْاَئِمَّةِ۔

(البدایہ والنہایہ) (ج ۸ ص ۲۰۲ السعادۃ مصر)

یہ شیعہ تھا اور ائمہ فن کے نزدیک یہ ضعیف الحدیث ہے۔

جس روایت کے دو راوی اس قسم کے ہوں وہ روایت کیونکر قابل اعتنا ہو سکتی ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹۹ پر ایک دوسری روایت ہے جو صورتِ حال کا بالکل نیا نقشہ پیش کرتی ہے۔ روایت کی ابتداء میں تقریباً وہی حالات مذکور ہیں۔ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع کی خبر ملی تو آپ حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں فوراً وہاں پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس مجمع سے خطاب کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت صدیق رضی اللہ عنہ خود گویا ہوئے۔ آپ نے اپنے اس خطاب میں انصار کے حق میں جو آیات نازل ہوئی تھیں اور جو ارشادات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے تھے، انہیں ذکر کیا اور فرمایا کہ تمہیں علم ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر سارے لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار دوسری وادی میں چلیں تو میں انصار کی وادی کو اختیار کروں گا۔ پھر کہا:

لَقَدْ عَلِمْتَ یَا سَعْدُ! اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اَنْتَ قَاعِدٌ، قُرَیْشٌ وُلَاةُ هٰذَا الْاَمْرِ فَبَرُّ النَّاسِ تَبَعٌ لِبَرِّهِمْ وَ فَاجِرُهُمْ تَبَعٌ لِفَاجِرِهِمْ۔

Marfat.com

"اے سعد! تم خوب جانتے ہو، تم اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے، جب رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ خلافت کے حق دار قریش ہیں۔ نیک لوگ، قریش کے نیک لوگوں کے فرمانبردار ہوں گے اور بدکار لوگ قریش کے بدکاروں کے تابعدار ہوں گے"۔

یہ سنتے ہی جیسے حضرت سعد کو ہوش آگیا ہو اور ان کی آنکھیں کھل گئی ہوں۔ آپ نے کہا:

صَدَقْتَ، فَنَحْنُ الْوُزَرَآءُ وَ اَنْتُمُ الْاُمَرَآءُ۔ (تاریخ طبری ص ۱۹۹ ج ۲)

اے ابو بکر! جو قولِ رسالت مآب تو نے سنایا ہے یہ سچا ہے۔ میں اپنے دعوے سے دست کش ہوتا ہوں، تم امراء ہو اور ہم تمہارے وزراء ہیں۔

اس روایت میں نہ حضرت خباب کی دھمکیاں ہیں اور نہ حضرت سعد کی ہٹ دھرمی اور ضد کا کہیں ذکر ہے۔ ابتداء میں انصار کو یہ خیال گزرا کہ وہ خلافت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اسی لیے یہ اجتماع انعقاد پذیر ہوا، لیکن حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بروقت مداخلت سے یہ شرر، شعلہ بننے سے پہلے ہی بجھ گیا۔ جب انصار نے اور سعد نے اپنے آقا کا ارشاد سنا کہ خلیفہ قریشی ہونا چاہیے اسی وقت وہ اپنے ہر قسم کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے۔ نہ تو تو، نہ میں میں، نہ کوئی جھگڑا، نہ اظہارِ انانیت۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب ؐ نے بڑی جانفشانیوں سے جو امت تیار کی تھی، اس سے اسی قسم کے رویہ کی توقع کی جا سکتی تھی۔ جس امت کے سر پر خود خداوند عالم نے خیر الامم کا تاج سجایا، اس کی یہی شان ہونی چاہیے تھی۔ جس امت کی تعریف میں قرآن کے صفحات جگمگا رہے ہیں، اس سے اس کے بغیر کسی چیز کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ ابن خلدون نے بھی اس رائے کی بایں الفاظ تائید کی:

لَمَّا قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كَانَ اَمْرُ السَّقِيْفَةِ كَمَا قَدَّمْنَاهُ، اَجْمَعَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ عَلٰى بَيْعَةِ اَبِىْ بَكْرٍ وَ لَمْ يُخَالِفْ اِلَّا سَعْدٌ اِنْ صَحَّ خِلَافُهٗ فَلَمْ يُلْتَفَتْ اِلَيْهِ لِشُذُوْذِهٖ۔

(ابن خلدون ص ۸۵۶ ج ۲) (دار الکتاب اللبنانی)

یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول کریم ﷺ نے جب رحلت فرمائی اور سقیفہ کا واقعہ ہوا، جیسے

ہم نے پہلے بیان کیا ہے تو تمام مہاجرین اور تمام انصار نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اتفاق کیا اور سعد کے بغیر کسی نے مخالفت نہیں کی بشرطیکہ سعد کا اختلاف صحیح سند سے ثابت ہو جائے۔

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یہی روایت مخصوص سند کے ذریعہ سے نقل کی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے انصار کی تعریف کے بعد حضرت سعد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَقَدْ عَلِمْتَ يَا سَعْدُ! اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: وَ اَنْتَ قَاعِدٌ، قُرَيْشٌ وُلَاةُ هٰذَا الْاَمْرِ فَبَرُّ النَّاسِ تَبَعٌ لِبَرِّهِمْ وَ فَاجِرُهُمْ تَبَعٌ لِفَاجِرِهِمْ فَقَالَ لَهُ سَعْدٌ: صَدَقْتَ نَحْنُ الْوُزَرَاءُ وَ اَنْتُمُ الْاُمَرَاءُ

(مسند امام احمد ج ۱ ص ۵ بیروت)

یہ بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ ان کا ترجمہ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ طبقات ابن سعد میں جو روایت ہے، اس میں بھی ان امور کا تذکرہ تک نہیں جو ہشام اور ابو مخنف کی مہربانی سے اس روایت کا حصہ بن گئے ہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) نے، نیز جو مہاجرین وہاں جمع ہو گئے تھے، ان سب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت کر لی۔ پھر آپ مسجد نبوی میں واپس آئے۔ جن لوگوں نے سقیفہ میں بیعت نہیں کی تھی، انہوں نے یہاں حاضر خدمت ہو کر بیعت کا شرف حاصل کیا۔ اس طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضور سرورِ عالم ﷺ کے جانشین اور امت مسلمہ کے سربراہ چن لیے گئے۔ اس طرح سیاست کے میدان میں جن انقلاب آفرین تعلیمات کا ذکر حضور ﷺ نے بار بار فرمایا تھا، آج وہ لباسِ مجاز میں دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

یہاں یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ کیا سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے بیعت کی یا نہیں؟ اگر بیعت کی تو برضا و رغبت یا جبر و اکراہ سے؟ اسی وقت کی یا کچھ عرصہ گزرنے کے بعد؟ ان

Marfat.com

استفسارات کا جواب سننے کے لیے ہر شخص بے چین ہے۔

اگر ایک لمحہ کے لیے ہم ہر قسم کی روایات سے صرفِ نظر کر لیں، محض سیرت مرتضوی کی روشنی میں ان سوالات کا جواب تلاش کریں، تو ہم بڑی آسانی سے اس فیصلہ پر پہنچ جائیں گے کہ آپ نے بیعت کی، اپنی خوشی سے کی اور اسی وقت کی۔ آپ کی للہیت، دین کے لیے آپ کا خلوص، امت مسلمہ کے لیے آپ کا جذبۂ خیر اندیشی، آپ کی بے عدیل شجاعت، مزید برآں آپ کی ہمہ صفت موصوف شخصیت، ان تمام خرافات کے ابطال کے لیے کافی ہے، لیکن ہم ان روایات سے کلیۃً صرفِ نظر بھی نہیں کر سکتے۔ روایات کے اس ڈھیر سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہر قول کو روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ جو بات کھری ثابت ہو اسے قبول کر لیا جائے اور جو پایۂ اعتبار سے ساقط ہو اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے پہلے ناظرین کرام کی خدمت میں وہ روایت پیش کرتا ہوں جس کو شیعہ مصنفین نے بڑی شد و مد سے اپنی کتب میں بیان کیا ہے اور ہر ایک نے اسے مزید رنگین بنانے کے لیے پوری سعی کی ہے۔ بخدا! جی نہیں چاہتا کہ ایسے خرافات ذکر کر کے اپنا وقت بھی ضائع کروں اور قارئین کرام کے اوقات عزیز کو بھی غارت کروں، لیکن محبت کا نقاب اوڑھ کر ناموس اہل بیت کو پامال کرنے والوں نے جو اودھم مچا رکھا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ حقیقت حال خواہ وہ انتہائی تلخ اور کربناک ہو، قارئین کو اس سے باخبر رکھا جائے۔

ناسخ التواریخ کے حصہ تاریخ الخلفاء کی جلد اول صفحہ ۸۳ سے یہ حکایت شروع ہوتی ہے جو کئی صفحات تک پھیلتی چلی گئی ہے۔

"دوسرے روز مسجد نبوی صحابہ کرام سے کھچا کھچ بھری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر حضرت ابوبکر قنفذ کو بھیجتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاضر دربار کریں۔ وہ جاتا ہے، پیغام پہنچاتا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے جھڑک دیتے ہیں، وہ واپس آ جاتا ہے۔ اسے دوبارہ سختی سے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لے آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر اسے دھتکار دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک جتھہ آپ کو پکڑنے کے

Marfat.com

لیے روانہ کرتے ہیں، وہ بھی ناکام لوٹتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بے قابو ہو کر خود جاتے ہیں اور خاتونِ جنت کے دروازے پر کھڑے ہو کر با آوازِ بلند کہتے ہیں:

یا علی بیرون شود با خلیفہ رسولِ خدا بیعت کن و گرنہ ایں خانہ را بآتش پاک بسوزم فاطمہ برخاست

وَ قَالَتْ يَا عُمَرُ! مَالَنَا وَلَكَ وَ قَالَ افْتَحِي الْبَابَ وَ اِلَّا اَحْرَقْنَا عَلَيْكُمْ بَيْتَكُمْ فَقَالَتْ يَا عُمَرُ اَمَا تَتَّقِي اللّٰهَ تَدْخُلُ عَلٰى بَيْتِيْ؟

''اے علی! باہر آؤ اور خلیفہ رسول خدا کی بیعت کرو۔ ورنہ اس گھر کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔ حضرت سیدہ اٹھیں۔ فرمایا: اے عمر! ہمارا تیرا کیا واسطہ ہے؟ آپ نے کہا: دروازہ کھولو، ورنہ تمہارے گھر کو تم پر جلا کر راکھ کر دوں گا۔ سیدہ نے فرمایا: اے عمر! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے ہو۔ میرے گھر میں داخل ہوتے ہو؟''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دروازہ نہیں کھولتے، تو حکم دیا کہ آگ اور لکڑیاں لائی جائیں۔ آپ نے دروازہ کو آگ لگا دی۔ جب کچھ حصہ جل گیا، تو پاؤں کی ٹھوکر مار کر اسے گرا دیا گیا اور گھر میں گھس آئے۔

حضرت سیدہ نے فریاد کرنا شروع کی اور کہا: يَا اَبَتَاهُ! يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! پسر خطاب نے سیدہ کے پہلو پر تلوار سے ٹھوکر لگائی۔ آپ نے دوبارہ فریاد کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے بازو مبارک پر درے سے تازیانہ مارا۔

حیرت ہے کہ شیر خدا یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور چپ رہے، ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اتنی توہین اور ضربِ شدید کو دیکھ رہے ہیں اور ذوالفقارِ حیدری کو جنبش تک نہیں دیتے۔ انسان اپنے اوپر تو سختیاں بھی برداشت کر لیتا ہے، لیکن اپنی اہلیہ کے بارے میں ناممکن ہے، خصوصاً جبکہ وہ حضور ﷺ کی لختِ جگر سیدۃ النساء ہو۔

''حضرت سیدہ پھر التجاء کرتی ہیں۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آتش غضب بھڑک اٹھتی ہے اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گریبان سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیتے ہیں۔ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلتا ہے، وہ آپ کی امداد کے لیے چند آدمی بھیج دیتے ہیں۔ آتے ہی یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لیتے ہیں، پھر ان کو دبوچ لیتے ہیں، پھر آپ کے گلے میں رسی ڈال لیتے ہیں اور آپ کو کشاں کشاں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے جاتے ہیں۔ حضرت سیدہ مدافعت کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ قنفذ آپ پر حملہ کرتا ہے اور تازیانہ کی ایک ایسی ضرب بازو پر لگاتا ہے کہ اس کا سیاہ داغ وفات کے بعد بھی بازو مبارک پر باقی رہتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اس وقت آپ بصد حسرت کہتے ہیں کہ اگر میری تلوار میرے ہاتھ سے نہ گر پڑتی تو تم مجھے یوں کھینچ کر نہ لا سکتے۔ خدا اس قوم پر لعنت کرے، جنہوں نے میری بیعت کی پھر میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ) (خلاصہ منقول از ناسخ التواریخ تاریخ الخلفاء کتاب فروشی اسلامیہ ص ۸۴، ۸۳ ج ۱)

خطرہ کے وقت تو بزدلوں کے ہاتھ کانپتے ہیں اور ان کی تلواریں گر پڑتی ہیں۔ سیدنا علی تو شیر خدا ہیں، جن کی ضربِ حیدری سے خیبر کی سنگین دیواریں پاش پاش ہو گئیں، جن کی گرج سے بڑے بڑے بہادروں کے دل پھٹ جایا کرتے تھے۔ احد اور حنین کے مشکل اوقات میں ان کے ہاتھ سے تلوار نہ گری۔ خندق کے دن عمرو بن عبدود کا مقابلہ کرتے ہوئے آپ کے ہاتھ سے تلوار نہ گری۔ آپ کی تلوار نے مرحب کے دو ٹکڑے کر دیے۔ آج اس اللہ اور رسول کے شیر پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ گویا دوسرے لفظوں میں آپ کو بزدلی کا طعنہ دیا جا رہا ہے۔ ایسی باتیں گھڑتے وقت اور آپ کی ذاتِ والا صفات کی طرف منسوب کرتے وقت کچھ تو خدا کا خوف کرنا چاہیے۔ اسی پر بس نہیں۔ تین جانثار ابوغفاری، مقداد، سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کی زبان سے ایسے جملے کہلواتے ہیں جنہیں سن کر بچے بھی ہنسی ضبط نہ کر سکیں۔ یوں اس دوستی کے رنگ میں اسلام دشمنی کا حق ادا کیا جا رہا ہے اور ان سب نفوسِ قدسیہ کی عظمت کو داغدار کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ لکھتے ہیں:

Marfat.com

اس وقت ابوذر نے کہا:

لَیتَ السُّیُوفَ قَدْ عَادَتْ بِاَیْدِینَا ثَانِیَۃً۔

''اے کاش! دوبارہ تلواریں ہمارے ہاتھوں میں لوٹ آئیں''۔

مقداد نے کہا:

لَوْ شَآءَ دَعَا عَلَیْہِ رَبَّہٗ عَزَّ وَجَلَّ۔

اگر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ چاہتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے بددعا مانگتے۔

سلمان نے کہا:

مَوْلَایَ اَعْلَمُ بِمَا هُوَ فِیْہِ۔

میرا آقا جن مشکلات میں مبتلا ہے، وہ خود ہی ان کو بہتر سمجھتا ہے۔

یہ کردار تو بنی اسرائیل کے حیلہ سازوں کے کردار سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ یہ تین بزرگ جو بقول ان کے ایمان پر ثابت قدم رہے، ان کی قوتِ ایمانی کا تو یہ حال ہے، باقی رہے دوسرے صحابہ تو ان کو بیک جنبش قلم مرتد قرار دے کر خارج از اسلام کر دیا گیا۔

از ابی جعفر حدیث کنند **قَالَ كَانَ النَّاسُ اَهْلَ رِدَّةٍ بَعْدَ النَّبِیِّ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم اِلَّا ثَلَاثَۃً۔**

''حضرت امام باقر سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ان تین حضرات کے علاوہ باقی سب لوگ مرتد ہو گئے''۔

اسی پر دل کی حسرت پوری نہیں ہوئی بلکہ مزید رقم طراز ہیں:

''رات کی تاریکی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ کو گدھے پر سوار کیا اور حسنین کریمین کی انگلیاں اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہر انصاری کے گھر لے جاتے ہیں۔ ان سب سے بیعت کرنے کی درخواست کرتے ہیں، لیکن کہیں کامیابی نہیں ہوتی۔ مایوس ہو کر خانہ نشین ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ آپ کو زبردستی گھر سے نکال کر جبراً بیعت کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔ (**سبحان اللہ هذا بهتان عظیم**) (منقول از ناسخ التواریخ)

معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ محققین بھی ان ہرزہ سرائیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ نہج البلاغۃ کے شارح علامہ میثم بن علی بن میثم بحرانی لکھتے ہیں:

وَ اعْلَمْ اَنَّهٗ قَدِ اخْتَلَفَ النَّاقِلُوْنَ لِكَيْفِيَّةِ حَالِهٖ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللّٰہ تعالی علیه وسلّم۔ فَرَوَی الْمُحَدِّثُوْنَ مِنَ الشِّيْعَةِ وَ غَيْرِهِمْ اَخْبَارًا كَثِيْرَةً بِمَا خَالَفَ بَعْضُهَا بَعْضًا بِحَسْبِ اِخْتِلَافِ الْاَهْوَاءِ۔

جان لو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حالت کے بارے میں نقل کرنے والوں کے اقوال میں بڑا اختلاف ہے۔ شیعہ محدثین اور غیر شیعہ محدثین نے متضاد روایات بکثرت نقل کی ہیں، جن سے ان کی ذاتی خواہشات جھلک رہی ہیں۔

علامہ مذکور نے جہاں یہ واقعہ ذکر کیا ہے وہاں ان خرافات کو بیان نہیں کیا۔ صرف یہ کہا ہے کہ:

وَ بَايَعَ مَعَهُمْ عَلٰی اِكْرَاهًا۔ (شرح نہج البلاغۃ، ابن میثمص 26ج2)

یعنی جب بنو ہاشم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی، لیکن مجبوراً۔

اور دوسرا قول یہ منقول ہے:

اِنَّ عَلِيًّا اِعْتَصَمَ بَيْتَ فَاطِمَةَ وَ عِلْمُوا اَنَّهٗ مُفْرَدٌ فَتَرَكُوْهُ۔ (ص۲۶، ج۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ کے گھر میں پناہ لے لی۔ صحابہ کو معلوم ہوا کہ وہ تنہا ہیں تو انہوں نے آپ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

فروع کافی میں صرف اتنا ہے

جَاءُوْا بِاَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ مُكْرَهًا فَبَايَعَ۔ (کتاب الروضہ ص ۸۵ ج ۲)

امیر المؤمنین کو جبراً پکڑ کر لے آئے تو آپ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔

بہرحال میثم اور علامہ کلینی کی تصریحات سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ آپ نے صدیق

اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت فرمائی۔ ان کا یہ اضافہ کہ حالت مجبوری میں آپ نے بیعت کی۔ کم از کم ہر اس شخص کے لیے نا قابل تسلیم ہے جو حضرت اسد اللہ الغالب کی جرأت، بسالت اور آئین جوانمردی کی حقیقت کو سمجھتا بھی ہے اور صدقِ دل سے اسے تسلیم بھی کرتا ہے۔ ان خود ساختہ روایات کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ جب تمام لوگ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر متفق ہو گئے تو ابوسفیان بن حرب کو یارائے صبر نہ رہا اور اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو طعن و تشنیع سے بھڑکانا چاہا۔ کہنے لگا:

فِيمَ اَبُوْبَكْرٍ مِنْ اَمْرِكُمْ اَيْنَ الْمُسْتَضْعِفَانِ، اَيْنَ الْاَذِلَّانِ يَعْنِيْ عَلِيًّا وَ الْعَبَّاسَ؟ مَا بَالُ هٰذَا الْاَمْرِ فِيْ اَقَلِّ حَيٍّ مِنْ قُرَيْشٍ؟

"یعنی ابوبکر کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ تمہارا سربراہ اور امیر بنے؟ وہ دونوں کمزور کہاں ہیں، وہ دونوں ذلیل کہاں ہیں (یعنی علی اور عباس)؟ کیا وجہ ہے قریش میں جو سب سے چھوٹا قبیلہ ہے اس کا ایک فرد تمہارا حاکم بن جائے؟"۔

پھر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان پر آیا اور آکر کہنے لگا کہ ہاتھ آگے بڑھائیے، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔

وَاللّٰهِ اِنْ شِئْتَ لَاَمْلَاَنَّهَا عَلٰى اَبِيْ فَصِيْلٍ يَعْنِيْ اَبَا بَكْرٍ خَيْلًا وَّ رَجْلًا۔

بخدا! اگر آپ حکم دیں تو میں ابوبکر سے مقابلہ کرنے کے لیے اس میدان کو شہسواروں اور پا پیادہ سپاہیوں سے بھر دوں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ باتیں سن کر اسے جھڑکتے ہوئے کہا:

یا ابا سفیان! ہرگز تو بے غرضِ جنبش نہ کنی، و جزبہ ضرر اسلام کوشش نہ فرمائی۔ من ہرگز بکلمات تو مغرور نشوم و ہرگز فریب تو در من نگیرد۔

"اے ابوسفیان تو بغیر غرض کے حرکت نہیں کرتا۔ تیرا مقصد صرف اسلام کو ضرر پہنچانا ہے۔ میں تیری باتوں سے ہرگز مغرور نہیں ہوں گا اور تو مجھے اپنے دام فریب میں پھنسا نہیں سکتا"۔

Marfat.com

آپ کا ابوسفیان کی اس پیشکش کو مسترد کر دینا اور اس کی اس حرکت کو اسلام کی دشمنی پر محمول کرنا، اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ آپ نے صدقِ دل سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت فرمائی تھی۔ (ناسخ التواریخ، تاریخ الخلفاء ج ا ص ۳۰، ۳۱ کتاب فروشی)

سید امیر علی جو مشہور قانون دان، مسلمہ مؤرخ اور بنگال ہائی کورٹ کے سب سے پہلے مسلمان جج تھے، اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں رقم طراز ہیں:

With his usual magnonimity and devotion to the faith, scrupulously to aveid the least diseord among the disciples of the master, Ali at once gave in his adhesion to Abu Bakr. Three times was he set aside, and on every occassion he accepted the choice of the electors without demur. He himself had never stood forth as a candidate for the suffrages of the electors, and whatever might have been the feeling of his partisams, he had never refrained from giving to the first two caliphs his help and advice in the governance of the common wealth; and they on their side had always deferred to his counsel and his exposition of the Master's Teachings.

(The Spirit Of Islam By Ameer Ali P. No. 293 (Printed: London)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی اولوالعزمی اور دین سے بے پناہ وابستگی اور اپنے آقا کے ماننے والوں کو ہر قسم کے انتشار سے بچانے کے لیے، فوراً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ آپ کو تین بار نظر انداز کیا گیا اور آپ نے ہر بار کسی اعراض کے بغیر رائے دہندگان کے انتخاب کو صدقِ دل سے قبول کر لیا۔ آپ نے اپنے آپ کو کبھی بھی خلافت کے لیے امیدوار کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ آپ کے احباب کے

Marfat.com

جذبات کچھ بھی ہوں، آپ نے اسلامی مملکت کے کاروبار حکمرانی کو چلانے میں پہلے دو خلیفوں کی ہر طرح امداد بھی کی اور انہیں بہترین مشوروں سے بھی نوازا۔ خلفاء نے بھی ہمیشہ آپ کے مشورے کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا اور احادیث نبوی ﷺ کی جو تشریح آپ نے کی، اس کو تسلیم کیا۔ (سپرٹ آف اسلام ص ۲۹۳، مصنفہ سید امیر علی)

قارئین کرام کو یہ علم تو ہوگا کہ سید موصوف شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی اس وضاحت کے بعد ہر قسم کے شکوک وشبہات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان روایات کی لغویت آشکارا ہو جاتی ہے، جن میں رحمت عالم ﷺ کے صحابہ کرام کی عظمت کو داغدار کرنے کے لیے دانستہ یا نادانستہ ناپاک کوششیں کی گئی ہیں۔

کتب اہل سنت میں جو روایات ثقہ اسناد سے مروی ہیں، میں اس مقالہ کا اختتام ان کے ذکر پر کرتا ہوں۔ ان کو پڑھ کر دل بے ساختہ تسلیم کرتا ہے کہ یہی حق ہے اور یہی بات سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شانِ رفیع کے شایان ہے۔

عَنْ حَبِيْبِ بْنِ اَبِیْ ثَابِتٍ قَالَ كَانَ عَلِيٌّ فِیْ بَيْتِهٖ اِذْ اُتِیَ فَقِيْلَ لَهٗ قَدْ جَلَسَ اَبُوْبَكْرٍ لِلْبَيْعَةِ فَخَرَجَ فِیْ قَمِيْصٍ مَا عَلَيْهِ اِزَارٌ وَّلَا رِدَاءٌ عَجَلًا كَرَاهِيَةَ اَنْ يُّبْطِئَ عَنْهَا حَتّٰى بَايَعَ ثُمَّ جَلَسَ اِلَيْهِ وَبَعَثَ اِلٰى ثَوْبِهٖ فَاَتَاهُ فَتَجَلَّلَهٗ وَلَزِمَ مَجْلِسَهٗ۔ (طبری ص ۲۰۱ ج ۲)

یعنی حبیب بن ابی ثابت سے مروی ہے کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ ایک آدمی آیا۔ اس نے عرض کی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیعت لینے کے لیے مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ اس وقت آپ نے صرف لمبی قمیض زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ جلدی اٹھ کھڑے ہوئے، مبادا بیعت کرنے میں تاخیر ہو جائے، آکر بیعت کی اور وہیں بیٹھ گئے۔ کسی آدمی کو کپڑے لانے کے لیے بھیجا، وہ گھر سے کپڑے لے آیا۔ آپ نے انہیں پہن لیا اور اسی مجلس میں تشریف فرما ہو گئے۔

اس سے بھی واضح وہ روایت ہے جو حافظ ابوبکر البیہقی نے اپنے جلیل القدر اساتذہ

حدیث کے واسطہ سے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کی ہے:

وَصَعِدَ اَبُوْبَكْرٍنِ الْمِنبَرَ فَنظَرَ فِیْ وُجُوْهِ الْقَوْمِ فَلَمْ یَرَ الزُّبَیْرَ. قَالَ دَعَا بِالزُّبَیْرِ فَجَاءَ. فَقَالَ: ابْنَ عَمَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم وَ حَوَارِیِّهِ، اَرَدْتَّ اَنْ تَشُقَّ عَصَا الْمُسْلِمِیْنَ. فَقَالَ: لَا تَثْرِیْبَ یَا خَلِیْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فَقَامَ فَبَایَعَهٗ، ثُمَّ نَظَرَ فِیْ وُجُوْهِ الْقَوْمِ فَلَمْ یَرَ عَلِیًّا فَدَعَا بِعَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ فَجَاءَ. فَقَالَ: ابْنَ عَمِّ رَسُوْلِ اللّٰه صلی اللّٰه تعالٰی علیه وسلم وَخَتْنَهٗ عَلٰی ابْنَتِهٖ اَرَدْتَّ اَنْ تَشُقَّ عَصَا الْمُسْلِمِیْنَ قَالَ لَا تَثْرِیْبَ یَا خَلِیْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ بَایَعَهٗ وَهٰذَا حَقٌّ. فَاِنَّ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ لَمْ یُفَارِقِ الصِّدِّیْقَ فِیْ وَقْتٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ وَلَمْ یَنْقَطِعْ فِیْ صَلٰوةٍ مِّنَ الصَّلٰوَاتِ خَلْفَهٗ وَ خَرَجَ مَعَهٗ اِلٰی ذِی الْقِصَّهِ لَمَّا خَرَجَ الصِّدِّیْقُ شَاهِرًا سَیْفَهٗ یُرِیْدُ قِتَالَ اَهْلِ الرِّدَّةِ.

(البدایہ والنہایہ ص ۲۴۹، ج ۵)

حضرت ابوبکر منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حاضرین میں اکابرِ قوم کا جائزہ لیا۔ حضرت زبیر نظر نہ آئے، انہیں بلانے کے لیے آدمی بھیجا، جب وہ آئے تو فرمایا: اے اللہ کے رسول کی پھوپھی کے فرزند! اور اے اللہ کے رسول کے حواری! کیا تم مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہو؟ آپ نے عرض کی: اے خلیفۂ رسول اللہ! ناراض نہ ہوں۔ آپ اٹھے اور بیعت کر لی۔ حاضرین پر دوبارہ نظر دوڑائی۔ سیدنا علی دکھائی نہ دیے۔ آپ کی خدمت میں بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ آپ فوراً تشریف لائے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کے فرزند! اور اے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے داماد! کیا آپ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں؟ آپ نے بھی جواب میں کہا کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول کے خلیفہ! اس تاخیر پر آپ ناراض نہ ہوں۔ اٹھے اور آپ نے بھی بیعت کر لی۔ یہی حق ہے کیونکہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ایک لمحہ کے لیے بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کسی وقت جدا نہیں ہوئے۔ ساری نمازیں آپ کی اقتدا میں ادا کرتے رہے

Marfat.com

اور جب مرتدین کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لہراتے ہوئے نکلے تو علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے اور ذی القصہ کے مقام تک ساتھ رہے"۔

علامہ ابن کثیر نے اس مفہوم کی کئی اور روایات بھی یہاں نقل کی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی سے چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور ہوا و ہوس کی چیرہ دستیوں سے اپنی حفاظت میں رکھے۔

آمین ثم آمین بجاہ حبیبہ محمد النبی الامین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

Marfat.com

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

اور

اہل بیت اطہار

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کے محبوب، رحمت و محبت کے رسول، اخوت و مروت کے داعی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے جزیرۂ عرب کا آتش کدہ گلزار خلیل بن گیا۔ جہاں حسد و نفرت کے انگارے دہک رہے تھے وہاں الفت وایثار کے پھول کھل اٹھے۔ جہاں فتنہ وفساد کی آندھیاں چل رہی تھیں وہاں انس و پیار کی بادِ نسیم اٹھکیلیاں کرنے لگی۔ خود بینی و خود پرستی کی جگہ ایثار و خلوص کا سکہ رواں ہو گیا۔ جہاں قدم قدم پر فسق و فجور کے عفریت زاد ڈھیر لگے تھے وہاں عفت و پاکبازی کے چمن آباد ہو گئے۔ جہاں خدا فراموشی کی ظلمتیں چھا رہی تھیں وہاں ذکر الٰہی کی قندیلیں فروزاں ہو گئیں۔

یہ انقلاب، بابرکت انقلاب، ہمہ گیر انقلاب، کیوں اور کیسے رو پذیر ہوا؟ اس لیے کہ اس انقلاب کا داعی حسن و جمال کا مرقع زیبا تھا۔ وہ انسانیت کے مقامِ رفیع سے کماحقہ' آگاہ تھا۔ انسانوں کے فکر و عمل میں جو المناک بگاڑ رونما ہوا تھا اس سے اسے ازحد دکھ اور رنج تھا۔ ان خرابیوں کو دیکھ کر اس کے دل میں حقارت یا انتقام کے جذبات نہیں بلکہ ہمدردی اور خیر اندیشی کے تعمیری جذبات اُمڈ آئے تھے۔

اپنے حسن دلنواز سے، اپنے کمالاتِ روح پرور سے، اپنی خوئے عفو و کرم سے، اپنی سیرتِ طیبہ کی تابانیوں سے اس نے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے والوں کے دلوں کو ہر قسم کے رذائل سے پاک کر دیا اور انہیں محبت کے بادۂ گلفام سے سرشار کر دیا۔ یہ محبت وہ نہ تھی جس کی علامت آہ سرد و رنگ زرد بتائی گئی ہے۔ یہ وہ محبت تھی جس میں خلوص و ایثار کی چمک تھی، جس کے حوصلے خیبر شکن، جس کی ہمت، باطل افگن اور جس کے عزم کی تپش سے فولاد بھی پگھل جاتا تھا۔ اسی محبت نے ان کو بھائی بھائی بنا دیا تھا۔ اسی محبت نے ان کے دلوں میں ہمدردی کا وہ لطیف اور توانا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ اگر ایک کے پاؤں میں کانٹا چبھتا

Marfat.com

تھا تو دوسرے کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ اگر ایک کو کوئی گزند پہنچتی تو دوسرا تڑپ اٹھتا تھا۔ اسی الفت و موانست کی کیفیت کو قرآنِ حکیم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (آل عمران۔ ۱۰۳)

"پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور اس کی مہربانی سے تم بھائی بھائی بن گئے"۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درویشوں کے پاس یہی ساز و سامان تھا۔

ان کے دامن میں ایک ایسی دولت تھی جس کی ہر ملک کے انسانی معاشرہ کو ضرورت تھی اور یہ قدسی صفت انسان جہاں گئے بڑی دریا دلی سے اس دولت کو لٹاتے گئے۔

ان کی اس محبت کا مرکز ذاتِ حبیب کبریا علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثناء تھی۔ یہ اس کے حسن و کمال کے دیوانے تھے۔ انہیں ان گلیوں سے پیار تھا جو ان کے محبوب کے خرامِ ناز سے مشرف تھیں۔ انہیں ان در و دیوار سے عقیدت تھی جہاں ان کا دلربا اقامت گزیں تھا۔ وہ پانی جو اس کے جسم اطہر کو چھو جاتا تھا، فرطِ شوق سے وہ اسے اپنے چہروں پر اور اپنے سینوں پر مل لیا کرتے تھے۔ اسی کے باعث ان کے چہرے رشکِ آفتاب اور ان کے سینے مطلع انوار تھے۔

آج کے پر آشوب اور پر خطر دور میں، جب کہ ہم ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گئے ہیں، وقت کا اہم تقاضا ہے کہ اسی درسِ محبت کی تلقین کی جائے، دل کے آئینہ پر بیگانگی اور نفرت کا جو غبار جم گیا ہے اسے صاف کیا جائے، ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے میں ہم نے کمال کر دکھایا، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اب تو باز آ جائیں، وہ امڈتے ہوئے طوفان اگر ہمیں ان کی گھن گرج بھی سنائی نہیں دے رہی جو ہمیں بہالے جانے کے لیے بجلی کی سی سرعت اور رعد کی سی تندی سے بڑھتے آ رہے ہیں، کیا ہم بینائی اور سماعت دونوں سے تو محروم نہیں ہو گئے؟

یہ تندی، یہ تلخی، یہ بدگمانی اور غلط فہمی اسلام کے بدخواہوں اور ہمارے دشمنوں کی تلبیس و تزویر کا نتیجہ ہے۔ ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی انہی کی فراہم کردہ عینک سے کرتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ نورانی عہد بھی گدلایا ہوا نظر آتا ہے جب آفتابِ محمدی جلوہ بار تھا۔ اس کے

نور سے بلندیاں اور پستیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ جب چہرے بھی روشن تھے اور نور حق سے دل بھی منور۔ جو لوگ اس زہر آلود پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر حیاتِ انسانی کے اس تابناک روزِ سعید کو دیکھتے ہیں، انہیں مطلع غبار آلود ہی نظر آتا ہے اور ہادئ برحق ﷺ کے آغوشِ تربیت میں پروان چڑھنے والے قدسی صفات لوگوں کا کردار بھی گھناؤنا دکھائی دینے لگتا ہے (نعوذ باللہ) ہمیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اغیار کے ساتھ نیکی اور مروت تو بڑی دور کی بات ہے ان کا برتاؤ تو اپنوں کے ساتھ بلکہ اپنے نبی کے خاندان کے ساتھ بھی غیر منصفانہ ہی نہیں سنگدلانہ تھا۔

تعجب ہے کہ ہم قرآن کریم کو علیم و خبیر خدا کا کلام یقین کرتے ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس قرآن میں ہم بار بار پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو ظاہر و باطن کو، حال و مستقبل کو جاننے والا ہے، وہ فرماتا ہے کہ میرے محبوب کی یہ امت، خیر الامم ہے۔ مہاجرین وانصار کے لیے اجر عظیم اور فردوس بریں کی نوید جانفزا ہے، ان کے سروں پر لقد رضی اللہ عن المومنین کا تاجِ زرنگار سجایا جا رہا ہے، لیکن ہماری سادگی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دشمنوں، انہی دشمنوں جن کی صلیب کو ہلال نے سرنگوں کر دیا تھا، جن کے آتش کدوں کو اسلام کے ابر رحمت نے ٹھنڈا کر دیا تھا، کے پروپیگنڈے کو درست ماننے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ سارے ارشاداتِ ربانی اور آیاتِ قرانی اور بھی ہمارے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے دشمن کا پروپیگنڈا حق اور سچ ہے تو پھر کلامِ الٰہی کی صدہا آیات غلط اور جھوٹی ہو جائیں گی۔ (العیاذ باللہ)

اور لطف یہ ہے کہ جس نے اسلام کی جتنی زیادہ خدمت کی، اعتراضات کی بوچھاڑ زیادہ اسی پر ہوئی۔ اسلام کی سطوت کا پرچم جس نے زیادہ اونچا لہرایا، اسی کو اس معاندانہ افترا بازی کا زیادہ ہدف بننا پڑا۔ خلفائے راشدین نے اپنے اپنے مبارک زمانہ میں اسلام کی جو خدمات جلیلہ انجام دیں ان کی نظیر نہیں ملتی، لیکن ستم یہ کہ وہی سب سے زیادہ موردِ الزام ٹھہرے اور انہیں پر من گھڑت جھوٹے الزامات تراشے گئے۔

Marfat.com

اس طریقہ کار سے دشمن دو فائدے حاصل کرنا چاہتا تھا: ایک یہ کہ خود مسلمانوں میں اختلاف وانتشار کا دروازہ کھل جائے اور وہ چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں بٹ کر کمزور ہو جائیں۔ دوسرا یہ کہ دنیا بھر کے جو پیاسے اپنی تشنہ لبی کا علاج کرنے کے لیے غول در غول اس چشمۂ شیریں کی طرف امڈے چلے جا رہے تھے، وہ رک جائیں۔ جب انہیں یہ سنایا جائے گا کہ اس نبی کے اولین شاگردوں کا یہ حال ہے تو وہ اس سے دور رہنے میں ہی اپنی عافیت خیال کریں گے۔

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اولین شاگرد، اولین مرید اور اولین فیض یافتہ صحابہ کرام آپس میں کس طرح شیر وشکر تھے؟ ان کی محبت ومودت کے رشتے کتنے مضبوط تھے؟ یہ موضوع بڑا شیریں، سرور انگیز اور روح افزا ہے۔

اس صحبت میں میں فقط ''فاروقِ اعظم اور اہل بیت'' کے موضوع پر اظہارِ خیال کروں گا۔ اس ضمن میں میں یہ عرض کروں گا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفۂ ثانی، تمام اہل ایمان کے امیر، فاتح ایران وروم، بانی مساجد ومعابد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا جن کے نام کی ہیبت سے سارا کفر لرزہ براندام تھا، جن کے سایہ سے ابلیس ترساں ولرزاں تھا، ایسی جلیل المرتبت ہستی کے دل میں اپنے ہادیٔ برحق، مرشد کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے خانوادۂ طاہرہ کی عظمت ومحبت کا کیا عالم تھا؟ دوسری طرف ائمۂ اہل بیت اسلام کے اس فرزند جلیل کو کس احترام وتعظیم کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے؟

میں اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کروں گا:

۱۔ عہد رسالت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟

۲۔ اپنے عہد خلافت میں ان کی تعظیم وتوقیر کس طرح کیا کرتے تھے؟ ان حضرات کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؟

۳۔ فاروقِ اعظم کی شہادت کے بعد ائمہ اہل بیت آپ کے بارے میں کن خیالات کا

Marfat.com

اظہار فرمایا کرتے تھے؟

عہد رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اگر آپ یہ اندازہ لگانا چاہیں کہ کسی کے دل میں آپ کے لیے محبت، احترام اور خیر سگالی کے جذبات کی نوعیت کیا ہے تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ یہ ملاحظہ کریں کہ وہ آپ کی عزت، آپ کی ناموری اور برتری کا کہاں تک خواہاں ہے؟ اور اس کے لیے کہاں تک سچے دل سے کوشاں ہے؟ یہی وہ معیار ہے جس سے کسی کے دل میں اپنی قدر و منزلت اور خلوص و محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عہد رسالت میں بے شمار ایسے واقعات رو پذیر ہوئے، جن سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بے پناہ محبت تھی اور آپ ان کو انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ کی عزت و برتری کے صدقِ دل سے خواہاں تھے اور اس کے لیے پورے خلوص سے کوشاں رہتے تھے، لیکن میں یہاں اس عہد کے صرف چند واقعات ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا جن کے مطالعہ سے ہر منصف مزاج صحیح فیصلہ پر پہنچ سکے گا۔

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ چاروں سراپا نور اور پیکر یمن و سعادت تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے قلبی انس اور دلی محبت تھی، لیکن ان سب میں خاتونِ جنت، بتول زہراء سیدۃ النساء حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو مقام تھا وہ بے مثل اور بے نظیر تھا۔ راز دانِ عالم کن فکان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آپ سے حد درجہ کی الفت و محبت تھی۔ ان کی سیمائے سعادت پر جو انوار و تجلیات برستے تھے، ان کی شان ہی نرالی تھی۔ علم لدنی اور معرفت الٰہی کے جو چشمے آپ کی ذاتِ اطہر سے نکل کر ایک دنیا کو سیراب کرنے والے تھے، ان کی بدولت نگاہِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ کا خاص مقام تھا۔ جب بھی کاشانۂ نبوت میں شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتیں تو اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکراتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہتے اور فرطِ مسرت سے اٹھ کر ان کا استقبال کرتے۔

Marfat.com

حضور کریم ﷺ سے کسی قسم کی نسبت بھی باعث سعادت دارین ہے، پھر جس کو حضور ﷺ کی اس لخت جگر اور نورِ نظر کا رشتہ مل جائے، اس کی عظمت شان اور رفعت مرتبت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ اور اس سعادت کے حصول کے لیے کئی حضرات نے درخواست کی لیکن جواب ملا کہ یہ رشتہ حسب وحی الٰہی طے پائے گا۔

ایک روز حضرت ابوبکر صدیق، حضرت فاروقِ اعظم اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم اکٹھے بیٹھے تھے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے دونوں حضرات سے کہا کہ چلو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں اور انہیں کہیں کہ وہ حضور ﷺ سے یہ رشتہ طلب کریں۔ اگر غربت اور افلاس کے باعث وہ یہ رشتہ طلب کرنے سے ہچکچا رہے ہوں تو ہمارے مال ان کے لیے حاضر ہیں۔ ہم ہر طرح ان کی مالی اعانت کریں گے۔ صاحب کشف الغمہ کے الفاظ یہ ہیں: فَاِنْ مَنَعَهُ قِلَّةُ ذَاتِ الْيَدِ وَاسَيْنَاهُ وَاَسْعَفْنَاهُ۔

حضرت سعد نے کہا: اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ بہتر کاموں کی توفیق بخشتا ہے۔ اٹھو، اللہ تعالیٰ کی برکت ویمن پر توکل کرتے ہوئے علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں۔

حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں کہ تینوں حضرات آپ کی تلاش میں مسجد سے نکلے۔ گھر سے دریافت کیا، آپ وہاں پر موجود نہ تھے۔ آپ اپنے اونٹ کے ذریعے پانی نکال کر ایک انصاری کا باغ سیراب کرنے گئے ہوئے تھے۔ سب اس باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو آتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیسے تشریف آوری ہوئی؟ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خیر و خوبی کی کوئی ایسی خصلت نہیں جس میں آپ کو سبقت اور فضیلت حاصل نہ ہو۔ حضور ﷺ کے ساتھ رشتہ میں، صحبت میں اور قبولِ اسلام میں جو آپ کا مقام ہے وہ بھی کسی پر مخفی نہیں۔ سردارانِ قریش نے حضور ﷺ سے حضرت فاطمہ کا رشتہ طلب کیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ آپ اس سعادت کے حصول کے لیے کیوں عرض نہیں کرتے؟ مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولِ کریم ﷺ اس رشتہ کو آپ کے لیے روکے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ فرمایا: اے ابو بکر! آپ نے میرے پرسکون جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا اور ایک خوابیدہ تمنا کو بیدار کر دیا۔ میں تہہ دل سے اس سعادت کے حصول کا متمنی ہوں، لیکن مفلسی اور تنگ دستی کے باعث اس خواہش کے اظہار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لَا تَقُلْ هٰذَا يَا اَبَا الْحَسَنِ فَاِنَّ الدُّنْيَا وَ مَافِيْهَا عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم كَهَبَاءٍ مَنْثُوْرٍ۔

اے ابو الحسن! ایسا مت کہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کے نزدیک دنیا و مافیہا کی قدر و منزلت ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔

چنانچہ ان حضرات کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے سیدنا علی بارگاہِ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئے۔ ان کی عرضداشت شرفِ قبولیت سے مشرف ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں: میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں جلدی سے باہر آیا تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو منتظر پایا۔ انہوں نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے جب یہ خوشخبری انہیں سنائی تو ان کو بے انداز فرحت اور مسرت نصیب ہوئی اور ہم اکٹھے مسجد میں گئے۔

فَفَرِحَا بِذٰلِكَ فَرَحًا شَدِيْدًا وَ رَجَعَا مَعِيَ اِلَى الْمَسْجِدِ۔

میں نے یہ واقعہ کشف الغمہ جلد اول صفحہ ۴۷۸، ۴۸۳، ۴۸۴ سے نقل کیا ہے اور مصنف کی عبارت کے لفظی ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔

بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ یہ واقعہ ناسخ التواریخ جلد سوم جز اول کے صفحات ۳۷، ۳۸، ۴۶ پر مرقوم ہے۔

اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد آپ کے دل میں اس کے سوا اور کیا تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، اسی طرح فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ قلبی آرزو تھی کہ یہ سعادت حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نصیب ہو۔ اس کے لیے ان حضرات نے ہی آپ کو مشورہ دیا، آپ کی حوصلہ افزائی کی اور مالی اعانت کی پیشکش کی اور جب یہ سعادت آپ کو

Marfat.com

حاصل ہوئی تو اپنی انتہائی خوشی اور بے پایاں روحانی فرحت اور شدید مسرت کا اظہار کیا۔ کیا ایسی سعادت کے حصول کا مشورہ اپنے دشمن اور بدخواہ کو دیا جاتا ہے یا اسے جو جان سے بھی عزیز تر ہو؟ ایسی لازوال سعادت کے حصول پر دوستوں کو خوشی ہوتی ہے یا دشمنوں اور بد خواہوں کو؟ آپ خود ہی فیصلہ فرمادیں!

ایک اور واقعہ سماعت فرمائیے:

غزوۂ خندق کے موقع پر عرب کا بہادر شہسوار اور نامور جنگجو عمر بن عبدود دعوتِ مبارزت دے رہا ہے۔ سیدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے میدان میں اترتے ہیں۔ دونوں بہادر تھے۔ دونوں کی جنگی مہارت ضرب المثل تھی۔ جب آمنے سامنے ہوئے تو عمرو بن عبدود نے کہا: میں تیرے جیسے کریم النفس کو قتل کرنا پسند نہیں کرتا، نیز تیرا باپ میرا جگری دوست تھا۔ شیر خدا نے جواب دیا: لیکن میں تجھے قتل کرنا پسند کرتا ہوں، وہ اپنے گھوڑے سے اتر آیا۔ دونوں بہادر ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہے۔ اتنی گرد اڑی کہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اچانک شمشیر اسد اللہی بجلی کی سرعت سے چمکی اور اس پر گری۔ اس کے خود، اس کی زرہ کو کاٹتی ہوئی، اس کے جسم میں پیر گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر آگرا۔ آپ نے اس کا سر کاٹا اور حضور ﷺ کے قدموں پر لاکر ڈال دیا۔ لشکر اسلام نے شیر خدا کی اس کامیابی پر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس کامیابی پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو کمال مسرت ہوئی، فرطِ مسرت سے دونوں اٹھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کو آکر چوم لیا۔

فَقَامَ اَبُوْبَکْرٍ وَّ عُمَرُ فَقَبَّلَا رَاْسَ عَلِیٍّ عَلَیْهِ السَّلَامُ

(کشف الغمہ جلد اول ص ۲۴۳، ۲۶۵)

اظہارِ مسرت میں یہ وارفتگی دوست کے لیے ہوتی ہے یا اس کے لیے جس کے لیے دل میں کدورت اور حسد وعناد کے جذبات پرورش پا رہے ہوں؟

اگر آپ عہدِ رسالت کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو صدہا ایسے واقعات ملیں گے

جن سے ان حضرات کی باہمی محبت، خلوص، ایثار اور خیر اندیشی کے تابندہ جذبات کا علم ہوگا۔

عہد فاروقی

آیئے! اب اس عہد ہمایوں کی طرف چلیں، جب اسلامی عظمت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ جب مملکت اسلامیہ میں داخلی طور پر مکمل امن وسکون تھا اور ہر صبح مختلف جنگی محاذوں سے نئی فتح وکامرانی کا مژدہ لے کر طلوع ہوتی تھی۔ جب اسلام کا جامع نظامِ حیات پوری آب وتاب سے نافذ تھا اور اپنے فیوض وبرکات سے اسلامی قلمرو کے ہر ہر گوشہ کو سیراب کر رہا تھا۔ یعنی جب امت مسلمہ کی زمام قیادت امیر المومنین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دست مبارک میں تھی۔ آیئے! دیکھیں اپنی شہرت وعروج کے اس درویش صفت امیر المومنین کے دل میں خانوادۂ نبوت کی کتنی قدر ومنزلت تھی۔ آپ کس طرح ان حضرات کا احترام اور عزت کیا کرتے تھے۔ کس طرح خلوص وشوق سے ان کی ہر طرح کی خدمت بجالایا کرتے تھے۔ اس کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ملاحظہ کریں کہ ان ایام میں اہل بیت کرام کے آپ سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ ان واقعات کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اس مختصر مقالہ میں اس کا ذکر ممکن نہیں۔ چیدہ چیدہ واقعات کی نشاندہی پر قناعت کرنا ہو گی۔ ان کے مطالعہ سے ہی بفضلہٖ تعالیٰ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

حضرت سیدنا علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے۔ جب بھی کوئی سیاسی، جنگی یا فقہی پیچیدہ مسئلہ پیش آتا آپ فوراً مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کرتے، ساری صورتِ حال اس مجلس کے سامنے رکھ دی جاتی، ہر شخص اپنی صوابدید کے مطابق بڑی آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اسی فیصلہ کے مطابق عمل کرتے جو باہمی بحث وتمحیص سے طے پاتا۔ ان تمام مجالس میں سیدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ بھی شرکت فرماتے۔ بڑے خلوص اور شوق سے بحث میں حصہ لیتے اور اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اکثر آپ کی رائے کو ترجیح دیتے۔ (ص ۳۶۰،۳۶۱)

Marfat.com

پہلا واقعہ میں ناسخ التواریخ کی تاریخ الخلفاء جلد دوم مطبوعہ تہران سے نقل کر رہا ہوں۔

''پے در پے شکستیں کھانے کے بعد یزدجرد شہنشاہِ ایران نے اپنی عظیم سلطنت کو بچانے کے لیے آخری بار سر دھڑ کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا۔ ایران کا تجربہ کار، گرگِ باراں دیدہ سپہ سالار فیروزان جس کی جنگی مہارت اور شجاعت کی دھاک سارے ایران میں بیٹھی ہوئی تھی، نہاوند میں مقیم تھا۔ یزدجرد نے اپنی مملکت کے باقی ماندہ تمام صوبوں میں یہ احکام بھیجے کہ عربوں کو ہمیشہ کے لیے کچل کر رکھ دینے کے لیے ہر علاقے کے بہادر جنگجو فیروزان کے پرچم تلے نہاوند میں جمع ہوں۔ حکم سنتے ہی ایران کے دور دراز علاقوں سے ٹڈی دل لشکر ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس، نہاوند پہنچنا شروع ہو گئے۔ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر جرار جمع ہو گیا۔ اس کے علاوہ جنگی ہاتھیوں کی ایک کثیر تعداد بھی وہاں پہنچ گئی۔ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے زور و شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ فیروزان کی امداد کے لیے ایرانی فوج کے دوسرے مشہور سالار سروشان بن اسفندیار، سفار بن خرزاد، جہانید بن فیروز بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے قسمیں اٹھائیں کہ جب تک عرب غازیوں کو تہ تیغ نہ کر دیں گے اور ان کے دین کو پامال اور برباد نہ کر دیں گے، اس وقت تک وہ میدانِ جنگ سے منہ نہیں موڑیں گے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو جب ان کی تیاریوں کی اطلاع ملی تو فوراً مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا۔ سب اراکین تشریف فرما ہوئے۔ اس نازک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گفتگو شروع ہوئی۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ حضرت طلحہ، زبیر، عثمان اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ بعض نے یہ رائے دی کہ امیر المومنین خود تشریف لے جائیں اور اپنے لشکر کی قیادت کریں۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جن الفاظ سے اپنی رائے کا اظہار کیا، ناسخ التواریخ کے حوالے سے بعینہٖ نقل کر رہا ہوں۔

اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ لَمْ یَکُنْ نَصْرُہٗ وَ لَا خِذْلَانُہٗ بِکَثْرَۃٍ وَ لَا بِقِلَّۃٍ۔ وَ ھُوَ دِیْنُ اللّٰہِ الَّذِیْ اَظْھَرَہٗ۔ وَ جُنْدُہُ الَّذِیْ اَعَدَّہٗ وَ اَمَدَّہٗ حَتّٰی بَلَغَ مَا بَلَغَ وَ طَلَعَ حَیْثُ طَلَعَ۔

Marfat.com

وَ نَحْنُ عَلٰی مَوْعُوْدٍ مِّنَ اللّٰهِ. وَاللّٰهُ مُنْجِزٌ وَعْدِهٖ، وَنَاصِرُ جُنْدِهٖ. وَالْعَرَبُ الْيَوْمَ وَ اِنْ كَانُوْا قَلِيْلًا، فَهُمْ كَثِيْرُوْنَ بِالْاِسْلَامِ وَ عَزِيْزُوْنَ بِالْاِجْتِمَاعِ. فَكُنْ قُطْبًا وَّ اسْتَدِرِ الرَّحٰى بِالْعَرَبِ وَاَصْلِهِمْ دُوْنَكَ نَارَ الْحَرْبِ اِلٰى اٰخِرِهٖ.

ترجمہ: اس امر یعنی اسلام کی فتح وشکست کا دارومدار کثرت وقلت پر نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کو اس نے غالب کر دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا لشکر ہے جس کو اس نے تیار کیا ہے اور اس کی امداد فرمائی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ترقی وکامیابی کی اس منزل تک پہنچا ہے اور ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور اپنے لشکر کی نصرت فرمائے گا۔ اہل عرب آج اگرچہ بلحاظِ تعداد تھوڑے ہیں لیکن وہ اسلام کی برکت سے بہت زیادہ ہیں اور اپنے اتفاق واتحاد کے باعث یہ طاقتور اور غالب ہیں۔ (اے امیر المومنین!) آپ قطب بن جائیے اور عربی لشکر کی چکی کو چلائیے۔ یہیں سے کفار کو جنگ کی آگ میں جھونکتے رہیے۔

اس کے بعد آپ نے اپنی اس حکیمانہ رائے کی حکمت بیان فرمائی۔

اس اندازِ تکلم اور اسلوبِ بیان میں خلوص ومحبت کا جو نور جگمگا رہا ہے اسے ہر چشم بینا دیکھ رہی ہے۔

جو لوگ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے تعلقات کو کشیدہ، مخاصمانہ بلکہ معاندانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس عبارت کے خط کشیدہ جملوں کو پھر غور سے پڑھیں۔ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دین کو اللہ تعالیٰ کا دین، آپ کے لشکر کو اللہ تعالیٰ کا لشکر کہہ رہے ہیں۔ نیز بڑی وضاحت سے اعلان فرما رہے ہیں کہ یہ وہ لشکر ہے جس کی مدد اور نصرت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہوا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قطب فرما رہے ہیں جس کے اردگرد چکی گھومتی ہے۔ اگر وہ ذرا بھی اپنی جگہ سے سرک جائے، سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

یہی عبارت نہج البلاغۃ ص ۲۸۳ جلد اول مطبوعہ مصر میں موجود ہے۔

(۲) جب ایران کے تقریباً سارے علاقے فتح ہو گئے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے خراسان پر لشکر کشی کی اجازت طلب کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا، کیونکہ مسافت بہت طویل تھی، راستہ میں لق و دق صحرا، گھنے جنگل اور دشوار گزار پہاڑ تھے۔ آپ مسلمان مجاہدین کو اس تکلیف سے بچانا چاہتے تھے، لیکن جب حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے خراسان کی اہمیت بتائی اور اس کو فتح کرنے کا مشورہ دیا تو آپ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خراسان پر حملہ کرنے کی اجازت دی۔ (ناسخ التواریخ، تاریخ الخلفاء جلد ۳ ص ۳۵)

(۳) اسی طرح شام و فلسطین میں پے در پے شکستیں کھانے کے بعد رومی سپہ سالاروں نے بھی ایک مقام پر اپنا لشکر جرار جمع کیا تاکہ مسلمانوں سے فیصلہ کن لڑائی لڑیں۔ اس کی اطلاع جب امیر المؤمنین کو ملی تو آپ نے اپنی مجلس شوریٰ کا پھر ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ سب اراکین مجلس شریک ہوئے۔ خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ آپ نے خود میدانِ جنگ میں جانے کا عزم کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کی تائید نہ کی۔ چنانچہ آپ نے ان کے مشورہ پر ہی عمل کیا۔ اس موقع پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان افروز ارشادات آپ کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا:

قَدْ تَوَكَّلَ اللّٰهُ لِاَهْلِ هٰذَا الدِّيْنِ بِاِعْزَازِ الْحوذَةِ وَ سَتْرَ الْعَوْرَةِ۔ وَالَّذِیْ نَصرهُمْ وَ هُمْ قَلِيْلٌ لَّا يَنْتَصِرُوْنَ وَ مَنَعَهُمْ وَهُمْ قَلِيْلٌ لَّا يَمْتَنِعُوْنَ حَیٌّ لَّا يَمُوْتُ

(نہج البلاغۃ ص ۲۷۲، ۲۷۱ جلد اول)

ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت اور ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کا خود ذمہ لیا ہے۔ وہ ذات جس نے اس وقت ان کی نگہبانی کی، جب وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اور ان میں مقابلہ کی سکت نہ تھی اور جس نے اس وقت ان کی نگہبانی کی جب وہ قلیل تھے اور اپنا تحفظ خود کرنے سے قاصر تھے۔ وہ خدا مر نہیں گیا زندہ ہے، وہ اب بھی ان

Marfat.com

کی مدد فرمائے گا اور ان کی حفاظت کرے گا۔

بہت سے واقعات میں سے صرف چند واقعات کے ذکر پر اکتفا کر رہا ہوں ان کے مطالعہ سے ہی چند امور بالکل واضح ہو گئے ہوں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے۔ ہر نازک مرحلہ پر اس کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے، بڑے خلوص اور جرأت سے اپنا مشورہ پیش کرتے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دین کو اللہ تعالیٰ کا دین، آپ کے لشکر کو اللہ تعالیٰ کا لشکر یقین کرتے تھے اور صاف صاف اعلان کرتے تھے: یہ وہ لشکر ہے جس کی نصرت کا وعدہ خداوند ذوالجلال نے کیا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔ نیز یہ بھی پتہ چل گیا کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ آپ کے مشوروں کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان پر عمل کرتے۔

آپ صرف مجلس حربیہ (وار کونسل) کے ممبر ہی نہ تھے بلکہ مجلس قانون ساز میں بھی آپ برابر شریک ہوتے تھے اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ آپ کے فقہی اجتہادات اور شرعی آراء کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، جو مغربی محاذ کے کمانڈر انچیف تھے، کو اطلاع ملی کہ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی بعض مسلمان بھی شراب کی طرف راغب ہونے لگے ہیں۔ آپ نے امیر المومنین کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پوچھا کہ ایسے لوگوں کو کیا سزا دینی چاہیے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ مجلس قانون ساز کے اعضا کو طلب کیا گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے اور آپ کے مشورہ کے مطابق شرابی کے لیے اسی درے کی سزا تجویز ہوئی جس پر تمام صحابہ نے اجماع کیا۔ آپ نے یہ حد مقرر کرنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی:

اِنَّ السَّکْرَانَ اِذَا سَکِرَ هَذٰی۔ وَ اِذَا هَذٰی افْتَرٰی۔ وَاِذَا افْتَرٰی فَعَلَيْهِ ثَمَانُوْنَ

''یعنی جو نشے میں مدہوش ہوتا ہے وہ ہذیان بکتا ہے اور جو ہذیان بکتا ہے وہ افترا بازی کرتا ہے اور جو افترا بازی کرے اس کی سزا اسی درے ہے۔ اس لیے شراب خور کی سزا بھی

Marfat.com

اسی درے ہوگی"۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہی حکم حضرت ابو عبیدہ کی طرف لکھ بھیجا اور آج تک امت کا اسی پر عمل ہے۔

حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اصابت رائے، اظہارِ رائے میں جرأت، نیز بے پایاں خلوص اور محبت کے باعث حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو آپ پر اس قدر اعتماد اور وثوق تھا کہ مملکت اسلامیہ کے تمام اہم معاملات میں آپ سے ضرور صلاح و مشورہ کیا کرتے۔ آپ اکثر یہ دعا مانگا کرتے:

اَللّٰهُمَّ لَا تُبْقِنِیْ لِمُعْضِلَةٍ لَیْسَ لَهَا عَلِیٌّ رضی اللہ عنہ.

(ناسخ التواریخ، تاریخ الخلفاء، جلد ۲، صفحہ ۶۸، تہران)

"الٰہی! مجھے اس وقت زندہ نہ رکھنا کہ جب کوئی مشکل در پیش آئے اور اس کو حل کرنے کے لیے علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ میرے پاس موجود نہ ہوں"۔

یہ ساری باتیں باہمی محبت، باہمی اعتماد اور پیار کی ہیں۔ ان روشن حقائق کو جب انسان دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ **فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا** (آل عمران۔ ۱۰۲)

ان واقعات سے کوئی کم فہم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ معاملات کو سمجھنے سے قاصر تھے یا مبہماتِ امور کو حل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ وہ ہستی جن کی پیش کردہ تجاویز (حرمت شراب، امہات المومنین کا پردہ کرنا وغیرہ) کی تائید میں آیاتِ قرآنی کا نزول ہوا۔ جن کی آراء کو فرمانِ خداوندی نے حکم اور قانون کا درجہ دیا، خود حضور سرورِ دو عالم ﷺ جن سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، جن کے حسن تدبر اور سیاسی بصیرت کی بدولت اسلامی مملکت فردوسِ بریں کا نقشہ پیش کرتی تھی، ایسی ہستی کے بارے میں ایسی غلط فہمی کا وہی شکار ہو سکتا ہے جو عقل و دانش سے بے بہرہ ہو۔ جس کی اپنی چشم خرد کور ہو۔

حکومت سے متعلقہ امور کے علاوہ بھی آپ خاندانِ نبوت کا ہر طرح ادب و احترام

Marfat.com

کرتے۔ چنانچہ جب بیت المال سے وظائف اور مشاہرات متعین کرنے کا وقت آیا تو بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ کیونکہ آپ امیر المؤمنین اور خلیفۃ الرسول ہیں، اس لیے ان دفاتر میں آپ کا اور آپ کے اہل خاندان کے نام سرفہرست ہونے چاہئیں۔ آپ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ فرمایا: سب سے پہلے قبیلہ بنی ہاشم کے افراد کے نام لکھے جائیں گے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا خاندان ذی احتشام ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ، ان کے بعد حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے اسمائے گرامی لکھے گئے، پھر دوسرے ہاشمیوں کے نام درج ہوئے۔ وظائف اور تنخواہوں میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی۔ سب سے زیادہ تنخواہیں اصحابِ بدر کے لیے مقرر کی گئیں۔ حضرات حسنین کریمین اگرچہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے، لیکن قرابت نبوی کے باعث ان کے وظائف اہل بدر کے برابر رکھے گئے۔

اگر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں خاندانِ نبوت کا حد درجہ احترام نہ ہوتا تو آپ اپنا نام سرفہرست لکھواتے اور حضرات حسنین کے لیے بدریوں کے برابر وظیفہ مقرر نہ کرتے، کیونکہ وہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ کوئی شخص آپ پر اعتراض بھی نہیں کرسکتا تھا، لیکن آپ کے دل میں اپنے آقا اور مرشد کریم ﷺ اور حضور ﷺ کے خاندان کی جو محبت تھی، جو جذبۂ نیاز تھا، اس کے پیش نظر آپ نے جو کچھ کیا یہ عین صواب تھا۔

ایک اور ایمان پرور اور بصیرت افروز واقعہ سماعت فرمائیے! حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں خاندانِ نبوت کی جو قدر و منزلت اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی جو عزت اور محبت موجود تھی، اس کو ثابت کرنے کے لیے اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آپ کے عہد مبارک میں ایران اسلامی قلمرو میں داخل ہوا۔ یزدجرد شہنشاہِ ایران کی شہزادی آپ کے دربار میں پیش کی گئی۔ اگرچہ آپ کے اپنے بچے موجود تھے جو صورت و سیرت میں، اخلاق و محامد میں اپنی مثال آپ تھے۔ اگر آپ چاہتے تو دختر یزدجرد کو اپنے کسی

Marfat.com

بیٹے کو دے دیتے، لیکن آپ کی نگاہِ انتخاب صرف سیدنا امام حسین علیہ السلام پر پڑی اور حضرت مائی شہر بانو کا عقد آپ کے ساتھ کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو میں اصول کافی کے حوالہ سے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

عَنْ اَبِیْ جَعْفَر۔ عَلَیْهِ السَّلَامُ: لَمَّا اَقْدَمَتْ بِنْتُ یَزْدَ جَرْدَ عَلٰی عُمَر اَشْرَفَ لَهَا عَذَارِی الْمَدِیْنَةِ وَاَشْرَقَ الْمَسْجِدُ بِضَوْءِ هَا۔ لَمَّا دَخَلَتْهُ وَ لَمَّا نَظَرَ اِلَیْهَا عُمَرُ غَطَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ افیروج باذ هرمز وَ قَالَ عُمَرُ: اَتَشْتِمُنِیْ هٰذِهٖ؟ وَ هَمَّ بِهَا۔ وَ قَالَ لَهٗ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْهِ السَّلَامُ لَیْسَ ذٰلِکَ خَیْرٌ لَّهَا رَجُلًا مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاَحْبَسَهَا بِفَیْئِهٖ وَ خَیَّرَهَا وَ جَاءَ تْ حَتّٰی وَضَعَتْ یَدَهَا عَلٰی رَاْسِ الْحُسَیْنِ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَ فَقَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَا اسْمُکِ؟ فَقَالَتْ جهانشاه، قَالَ: بَلْ شهر بانویه ثُمَّ قَالَ لِلْحُسَیْنِ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ لَیَلِدَنَّ لَکَ مِنْهَا خَیْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ فَوَلَدَتْ عَلِیَّ بْنَ الْحُسَیْنِ۔

(اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۴۹۱، المکتبہ الاسلامیہ)

''حضرت امام باقر فرماتے ہیں کہ جب یزدجرد کی بیٹی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو مدینہ طیبہ کی عورتیں اسے دیکھنے کے لیے جھرمٹ کر آئیں۔ مسجد اس کی روشنی سے چمکنے لگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا یہ مجھے برا بھلا کہہ رہی ہے، اور اس کو مارنے کا ارادہ ہے۔ (یہ اصولِ کافی کے راوی کے الفاظ ہیں جو حقیقت سے بعید ہیں)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسا نہیں آپ اسے اختیار دیجئے۔ کہ مسلمانوں میں کسی آدمی کو چن لے اور پھر اسے مالِ غنیمت میں سے اس کا حصہ قرار دیجئے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے اجازت دی، اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر پر رکھ دیا۔ حضرت امیر المومنین نے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا جہاں شاہ۔ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ شہر بانو۔ پھر آپ نے حضرت امام حسین رضی

Marfat.com

اللہ عنہ سے کہا: تیرا اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمام اہل زمین سے بہتر ہوگا۔ چنانچہ حضرت شہر بانو کے بطن سے حضرت زین العابدین کی ولادت باسعادت ہوئی''۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام حسینی سادات حضرت شہر بانو رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے ہیں۔ مائی صاحبہ کا مشرف با سلام ہونا، خاندانِ نبوت کا فرد بننا اور حسینی سادات کی والدہ ماجدہ بننے کا فخر حاصل کرنا، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی بے شمار برکات اور ان گنت احسانات میں سے ایک ہے۔ اس کے لیے ساری امت آپ کی ممنون ہے۔ سادات کرام کو اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسے قوی کہا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کا مہر بیت المال سے ادا کیا گیا۔ (جلاء العیون ص ۴۹۷ مطبوعہ ایران)

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد

ساڑھے دس سال مسند خلافت پر متمکن رہنے کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مجوسی کے ہاتھ سے جامِ شہادت نوش کیا۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس کا شدید صدمہ ہوا۔ آپ کو غسل دے کر کفنایا گیا۔ اس وقت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ اس روح فرسا منظر کو دیکھ کر آپ کی زبانِ اقدس سے جو کلمات نکلے انہیں علماء اہل سنت نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے، لیکن آپ محض طوسی کی تلخیص الشافی میں مذکور روایت ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ جَعْفَرَ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ لَمَّا غُسِلَ عُمَرُ وَ کُفِنَ دَخَلَ عَلِیٌّ عَلَیْهِ السَّلَامُ فَقَالَ صلی اللہ علیہ وسلم، مَا عَلَی الْاَرْضِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَلْقَی اللّٰهَ بِصَحِیْفَةِ هٰذَا الْمُسَجّٰی بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ۔

(تلخیص الشافی ص ۴۲۸ مطبوعہ نجف اشرف)

ترجمہ: ''یعنی حضرت امام جعفر صادق نے اپنے والد بزرگوار سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غسل دے کر کفن

Marfat.com

پہنایا گیا تو علی علیہ السلام تشریف لائے۔ فرمایا: ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، یہ شخص جو تمہارے سامنے کفن میں لپٹا ہوا ہے مجھے روئے زمین پر اس سے زیادہ کوئی اور چیز محبوب نہیں کہ میں اس جیسا صحیفۂ عمل لے کر اللہ تعالیٰ کی ملاقات کروں''۔

حقیقت یہ ہے کہ شانِ فاروقی کو پہچاننے کے لیے نگاہِ مرتضوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر کس و ناکس میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس مقامِ رفیع کا اندازہ کر سکے، جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو سرفراز فرمایا تھا۔

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں اکثر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ذکر خیر فرمایا کرتے اور آپ کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر دیتے۔ آپ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور حضور علیہ السلام کی ثناء کے بعد فرمایا:

ثُمَّ اسْتَخْلَفَ النَّاسُ اَبَا بَكْرٍ ثُمَّ اسْتَخْلَفَ اَبُوْبَكْرٍ عُمَرَ وَ اَحْسَنَا السِّيْرَةَ وَعَدَّلَا فِى الْاُمَّةِ۔ (ناسخ التواریخ جز دوم جلد سوم ص ۱۱۶)

''پھر حضور علیہ السلام کی رحلت کے بعد لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے تجویز کیا۔ ان دونوں حضرات کا کردار نہایت عمدہ تھا۔ دونوں نے امت میں عدل و انصاف قائم کیا''۔

اسی جزو کے صفحہ ۲۲۲ پر حضرت امیر المومنین کا ایک مکتوب گرامی ہے جس میں آپ نے ہر اس کو مخاطب فرمایا ہے جو اس خط کو پڑھے۔ اس میں ابتدائی پند و نصائح کے بعد حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام عرض کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں:

ثُمَّ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ بَعْدِهِ اسْتَخْلَفُوْا اَمِيْرَيْنِ مِنْهُمْ، صَالِحَيْنِ، اَحْيَيَا السِّيْرَةَ وَ لَمْ يَعْدُوا السُّنَّةَ۔ (ناسخ التواریخ، ج ۳، جز ۲، ص ۲۲۲)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں نے اپنے میں سے دو ایسے امیروں کو اپنا خلیفہ منتخب کیا، جو صالح اور نیک کردار تھے، ان دونوں نے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ رکھا اور سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرمو تجاوز نہ کیا''۔

Marfat.com

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں:

وَ تَوَلَّی عُمَرُ الْاَمْرَ۔ فَکَانَ مَرْضِیَّ السِّیْرَةِ مَیْمُوْنَ النَّقِیْبَةِ۔

''یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر تشریف فرما ہوئے۔ آپ کا کردار بڑا پسندیدہ تھا اور آپ کا بخت بڑا مبارک تھا''۔

(ناسخ التواریخ، جلد ۳، جز سوم، ص ۲۲۳)

نہج البلاغۃ میں آپ نے بڑی فصاحت اور صراحت سے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان فرمائے ہیں۔ آپ کے عدل و انصاف، تقویٰ اور اتباع سنت کی بڑی تعریف کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لِلّٰهِ بِلَادُ فُلَانٍ فَقَدْ قَوَّمَ الْاَوْدَ وَ دَاوَی الْعُمَدَ۔ خَلَّفَ الْفِتْنَةَ وَ اَقَامَ السُّنَّةَ ذَهَبَ نَقِیَّ الثَّوْبِ قَلِیْلَ الْعَیْبِ، اَصَابَ خَیْرَهَا۔ وَ سَبَقَ شَرَّهَا۔ اَدّٰی اِلَی اللّٰهِ طَاعَةَ وَّ اتَّقَاهُ بِحَقِّهٖ۔ (نہج البلاغۃ جلد اول ص ۴۸۵ مطبوعہ مصر)

''یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شہروں کو اللہ تعالیٰ برکت دے۔ آپ نے کجی کو درست کیا، بیماری کا علاج کیا، فتنہ و فساد کو پس پشت ڈالا، سنت نبوی ﷺ کو قائم کیا۔ وہ یہاں سے پاک دامن رخصت ہوئے ان کے عیب قلیل تھے۔ انہوں نے خیر کو پالیا اور شر و فساد سے سبقت لے گئے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و تقویٰ کا حق ادا کر دیا''۔

عبارت مذکورہ میں ''فلاں'' کا لفظ مذکور ہے۔ نہج البلاغۃ کے شارحین نے وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید اپنی شہرۂ آفاق شرح میں لکھتے ہیں:

فَفُلَانٌ الْمُکْنٰی عَنْهُ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ وَ قَدْ وَجَدْتُ النُّسْخَةَ الَّتِیْ بِخَطِّ الرَّضِیِّ اَبِی الْحَسَنِ جَامِعِ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ وَ تَحْتَ فُلَانٍ ''عُمَرُ''

(شرح نہج البلاغۃ ج ۱۲ ص ۳ دار احیاء الکتب)

''یعنی فلاں سے مراد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ کہتے ہیں: میں نے وہ نسخہ دیکھا

Marfat.com

ہے جو علامہ رضی جامع نہج البلاغۃ نے اپنے ہاتھ سے لکھا، اس میں فلاں کے لفظ کے نیچے ''عمر'' رضی اللہ عنہ لکھا ہوا ہے''۔

ان کے علاوہ علامہ علی نقی فیض الاسلام نے اپنی شرح نہج البلاغۃ میں اس جگہ لکھا ہے:

''خدا شہر ہائے فلاں (عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب) را برکت دہد و نگاہ دارد''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ فلاں یعنی عمر بن خطاب کے شہروں کو برکت دے اور ان کی نگہبانی فرمائے''۔ (شرح نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۷۱۲ تہران ایران)

ایک اور شارح نہج البلاغۃ ملا صالح قزوینی لکھتے ہیں:

''کہ مراد عمر (رضی اللہ عنہ) است کہ بعد از او امر خلافت از انتظام بیفتاد''۔

(ج ۳ ص ۲۶ تہران)

(کہ فلاں سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ آپ کے بعد خلافت کا نظم ونسق درہم برہم ہو گیا)۔

کمال الدین میثم بحرانی نے بھی اس شرح میں لکھا ہے:

وَالْمَنْقُوْلُ اَنَّ الْمُرَادَ بِفُلَانٍ عُمَرُ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اپنے عہد خلافت میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ آپ نے بطورِ توریہ یا تقیہ اس طرح کہا، ہرگز قرین قیاس نہیں اور اگر یہ فرض کر لیا جائے تو بارگاہِ مرتضوی میں اس سے بڑھ کر کوئی گستاخی متصور نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خط کے جواب میں حضرت صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کو ان پاکیزہ اور دل افروز کلمات سے خراجِ تحسین پیش فرمایا:

وَ کَانَ اَفْضَلَهُمْ فِی الْاِسْلَامِ کَمَا زَعَمْتَ وَاَنْصَحَهُمْ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهِ الْخَلِیْفَةُ الصِّدِّیْقُ وَ خَلِیْفَةُ الْخَلِیْفَةِ الْفَارُوْقُ۔ وَ لَعَمْرِیْ اِنَّ مَکَانَهُمَا فِیْ

الْإِسْلَامِ لَعَظِيمٌ وَ إِنَّ الْمُصَابَ بِهِمَا لَجَرْحٌ فِي الْإِسْلَامِ شَدِيدٌ. يَرْحَمُهُمَا اللّٰهُ وَجَزَاهُمَا بِأَحْسَنِ مَا عَمِلَا۔ (شرح نہج البلاغۃ ابن میثم البحرانی)

"آپ کا یہ خیال درست ہے کہ اسلام میں سب سے افضل اللہ اور اس کے رسول کے سب سے زیادہ مخلص حضرت صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما تھے۔ مجھے اپنی جانِ عزیز کی قسم! اسلام میں ان دونوں کا مرتبہ بڑا عظیم تھا۔ ان کی وفاتِ حسرت آیات سے اسلام کو گہرا زخم لگا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحمت فرمائے اور جو نیک اعمال انہوں نے کیے ہیں اس کی انہیں جزا دے"۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بعد بھی ائمہ اہل بیت حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی تعریف فرماتے رہے۔ اب یہاں صرف ایک واقعہ بطورِ مثال پیش خدمت ہے:

ایک دفعہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی خدمت اقدس میں عراق کے چند آدمی حاضر ہوئے اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں کچھ ناشائستہ گفتگو کی۔ جب وہ لوگ اپنے خبث باطن کو ظاہر کر چکے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم ان مہاجرین اولین میں سے ہو جن کی شان میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ أَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحشر)

"جنہیں (جبراً) نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے اور جائیدادوں سے یہ (نیک بخت) تلاش کرتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضا اور (ہر وقت) مدد کرتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی یہی راستباز لوگ ہیں"۔

انہوں نے جواب دیا: ہم اس گروہ سے نہیں ہیں۔

پھر آپ نے دریافت فرمایا: کیا تم ان میں سے ہو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر)

Marfat.com

''اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں مہاجرین (کی آمد) سے پہلے۔ محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں۔ اور نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی خلش اس چیز کے بارے میں جو مہاجرین کو دے دی جائے۔ اور ترجیح دیتے ہیں (انہیں) اپنے آپ پر اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو''۔

ان لوگوں نے کہا: ہم اس گروہ سے بھی نہیں۔

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں گروہوں میں سے نہ ہونے کا تم نے خود اعتراف کر لیا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم مسلمانوں کے تیسرے گروہ میں سے نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الحشر۔۱۰)

ترجمہ: ''وہ لوگ جو ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے، جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اہل ایمان کے لیے ہمارے دلوں میں بغض مت ڈال''۔

پھر آپ نے بڑے غضب ناک لہجے میں فرمایا:

اُخْرُجُوْا عَنِّیْ فَعَلَ اللّٰهُ بِکُمْ۔ (کشف الغمہ جلد دوم صفحہ نمبر ۲۶۷)

''میرے پاس سے نکل جاؤ، خدا تمہیں ہلاک کرے''۔

اللہ تعالیٰ جب کسی کو فرزند عطا کرتا ہے تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس کے لیے بہترین نام تجویز کرتا ہے۔ عمل کی ہزار کوتاہیوں کے باوجود ہم آج بھی دین کے کسی باغی، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کے کسی دشمن کا نام رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ ابولہب، ابوجہل، فرعون یا شمر کے نام کلیۃً متروک ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے لیے کسی مقبول بارگاہ الٰہی کا نام ہی پسند کرتے ہیں۔

Marfat.com

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور آپ کی اولادِ امجاد جو حسن انتخاب میں اپنا جواب نہیں رکھتی، یقیناً انہوں نے بھی اپنی اولاد کے لیے انہی کے نام تجویز کیے ہوں گے جو انہیں از حد دلربا اور پسند تھے۔ اب ذرا ائمہ اہل بیت کی اولادِ امجاد کے ناموں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ انہیں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے نام سے کتنی عقیدت و محبت تھی اور ان کے دلوں میں آپ کی کتنی قدر و منزلت تھی:

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے کا نام عمر تھا۔

(کشف الغمہ ج ۱ ص ۵۹۰ ایران)

سیدنا امام حسن علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کا نام عمر رکھا۔

(کشف الغمہ ج ۲ ص ۱۵۳)

سیدنا امام زین العابدین نے بھی اپنے لختِ جگر کے لیے عمر کا نام تجویز فرمایا۔

(کشف الغمہ ج ۲ ص ۲۸۴)

حضرت امام موسیٰ کاظم رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے ایک نورِ نظر کا نام بھی عمر تھا۔

(ج ۳ ص ۹)

اگر خوفِ طوالت نہ ہوتا تو تاریخ انسانی کے اس زریں اور درخشاں عہد کے صد ہا روح پرور اور دل افروز واقعات بیان کرتا، لیکن اب اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر کسی کے دل کی آنکھ اندھی ہو چکی ہے یا اس نے تعصب کی پٹی خوب کس کر باندھ رکھی ہے تو اس کی قسمت، ورنہ جس کے دل میں حق کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے کی کچھ صلاحیت موجود ہے، بفضلہٖ تعالیٰ اب اس پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو چکی ہو گی کہ خلفائے راشدین خصوصاً حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اہل بیت نبوت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم باہم شیر و شکر تھے۔ سب ایک دوسرے پر صدقِ دل سے فریفتہ تھے۔ شمع اسلام پر سب پروانہ وار نثار تھے۔ ان سب نفوسِ قدسیہ کی مشترکہ کوششوں سے اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ اور عزت نصیب

Marfat.com

ہوئی۔ باہمی کشیدگی اور دشمنی کے قصے سب جھوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سچا ہے جس میں کوئی مومن شک نہیں کرسکتا۔

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (آل عمران۔ ۱۰۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی برکت سے ان کے دلوں کو محبت اور پیار سے جوڑ دیا تھا اور اس کی مہربانی سے وہ بھائی بھائی بن گئے تھے۔

اسلام

اور

تصوف

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سب سے پہلے ہم تصوف، اس کی حقیقت، اس کی غرض و غایت اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کا تذکرہ کریں گے۔ بعد ازاں اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے جو اعتراضات اس سلسلۂ فقر و درویشی پر بڑی شد و مد سے کیے گئے ہیں اور اب بھی کیے جارہے ہیں، ان کا بھی علمی اور تحقیقی تجزیہ کیا جائے گا، تاکہ نوجوانوں کے اذہان وقلوب میں جو قلق اور اضطراب پایا جاتا ہے، ایک طرف اس کا بھی ازالہ ہو جائے اور ساتھ ہی ایک اٹل حقیقت اپنی دلفریبیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ بے نقاب ہو جائے۔

سب سے پہلے ہم لفظ صوفی پر بحث کریں گے کہ اس کا ماخذ اشتقاق کیا ہے اور اس فن سے وابستہ لوگ اس کو کس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں؟

ابوریحان البیرونی (۹۷۳ تا ۱۰۴۸ھ) کا نام محتاج تعارف نہیں۔ یہ بیک وقت ریاضی، طب، فلک، تقاویم اور تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی سال ہندوستان میں بسر کیے۔ سنسکرت میں مہارت حاصل کی اور یہاں کے تمدن اور مذہبی افکار و اعمال کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ وہ کہتے ہیں:

''صوفی'' کا ماخذ ''سوف'' ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے۔ سوف کا معنی ''حکمت'' ہے اسی لیے حکیم اور دانشور کو فیلسوف کہتے ہیں۔ فیلا کا معنی محب اور سوف کا معنی حکمت، یعنی دانش و حکمت سے محبت کرنے والا۔ سوف کے لفظ کو جب عربی میں ڈھالا گیا تو تحریف کے بعد صوفی ہو گیا، کیونکہ یونان میں حکماء کا ایک ایسا گروہ تھا جن کا نظریہ تھا کہ وجودِ حقیقی صرف علت اولیٰ کے لیے ہے، کیونکہ وہی ماسوٰی سے مستغنی ہے۔ باقی سب اس کے محتاج ہیں۔ اسی لیے وجودِ حقیقی صرف وہی علت اولیٰ ہوگی باقی اشیاء کا وجود حقیقی نہیں بلکہ خیالی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں میں بھی بعض حضرات کا عقیدہ بظاہر ان سے قریب ہے، اسی مناسبت سے

Marfat.com

انہیں بھی صوفی کہا گیا۔‘‘(1)

لیکن البیرونی کی یہ رائے قابل اعتنا نہیں، کیونکہ یونانی کتب کے عربی تراجم کا سلسلہ تیسری صدی ہجری کے نصف کے لگ بھگ شروع ہوا اور اہل عرب کے ہاں صوفی کا لفظ اس سے بہت پہلے مستعمل ہوتا تھا۔ جو صاحب سب سے پہلے صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے وہ ابوالہاشم الکوفی تھے، جن کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی تھی یعنی ترجمہ کے دور سے تقریباً ایک سو سال پہلے۔ اس سے البیرونی کی رائے میں کوئی وزن نہیں رہتا۔ البیرونی اپنے اس رویہ پر اس لیے مصر ہیں کہ اگر اس کے علاوہ صوفی کا کوئی اور مادۂ اشتقاق مانا جائے، تو اس میں حکمت و معرفت کی نسبت مفقود ہو جائے گی اور یہ لفظ سطحی قسم کا ہو جائے گا۔ البیرونی نے صوفی کے لفظ کی تقدیس کو تو برقرار رکھا، لیکن انہیں یہ خیال نہ آیا کہ اس طرح وہ اسلامی تصوف کو یونانی علوم کا ریزہ چین ثابت کر رہے ہیں اور اس کی انفرادیت کو ختم کر رہے ہیں جو واقعہ کے بھی خلاف ہے اور تصوف کے مقام سے بھی بہت فروتر۔ اس لیے البیرونی کے اس قول کو تمام مسلم محققین نے رد کر دیا۔ البتہ یورپ کے مستشرقین میں سے کئی لوگ انہیں اپنے ہمنوا مل گئے، لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے جس سے قارئین واقف ہیں۔

بعض کے نزدیک صوف، صفا سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ لوگ ظاہر اور باطن دونوں کی صفائی اور پاکیزگی کا از حد اہتمام فرماتے تھے، اس لیے ان کو صوفی کہا جانے لگا، لیکن صرف کے قواعد اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر صفا کی طرف نسبت کو ملحوظ رکھنا ہوتا تو انہیں صوفی کے بجائے صفوی کہا جاتا۔ اشتقاق لغوی کے قواعد کو نظرانداز کرنا درست نہیں۔

بعض علماء نے صف کو صوفی کا ماخذ قرار دیا ہے، کیونکہ جہاد اصغر ہو یا جہاد اکبر، یہ لوگ ہمیشہ صف اول میں ظاہری اور باطنی دشمنوں کے سامنے سینہ سپر ہوتے ہیں، لیکن قواعد اشتقاق اس قول کی بھی تغلیط کرتے ہیں۔ صف کی نسبت سے انہیں صفی کہلانا چاہیے تھا نہ کہ صوفی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصحاب صفہ کی نسبت سے انہیں صوفی کہا جاتا ہے،

Marfat.com

کیونکہ وہ حضرات دنیا کے علائق سے اپنے آپ کو آزاد کر کے دن رات ذکر الٰہی اور اطاعت رسالت پناہی میں سرگرم رہتے تھے اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کرنے والے لوگوں نے بھی دنیا کی لذتوں، آسائشوں اور دلچسپیوں کو طلاق دے دی ہے اور صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے شب و روز سرگرداں رہتے ہیں اس لیے انہیں اصحاب صفہ سے خصوصی نسبت ہے، اسی وجہ سے انہیں صوفی کہا گیا۔ بظاہر تو یہ وجہ بڑی معقول معلوم ہوتی ہے، لیکن قواعد اشتقاق اس کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ اگر انہیں صفہ سے نسبت ہوتی تو صفی کہا جاتا۔

بعض محققین نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ یہ لوگ صوف کا لباس پہنتے تھے، اس سے صوفی کا لفظ بنا ہے۔ قواعد کے لحاظ سے تو یہ نسبت درست ہے، لیکن ضروری نہیں کہ ہر صوفی صوف کا لباس پہنے۔ بڑے بڑے جلیل القدر اصفیاء ایسے گزرے ہیں جو صوف کا لباس نہیں پہنتے تھے۔

امام قشیری مختلف آراء نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"وَلَا يَشْهَدُ لِهٰذَا الْاِسْمِ اشْتِقَاقٌ مِّنْ جِهَةِ الْعَرَبِيَّةِ وَ لَا قِيَاسٌ وَّالظَّاهِرُ اَنَّهٗ لَقَبٌ"۔

"یعنی صوفی کے لفظ کا ماخذ اشتقاق عربیت کے لحاظ سے اور قواعد صرف کی رو سے معلوم نہیں ہوتا۔ سیدھی صاف بات یہ ہے کہ یہ اس فن کا لقب ہے"۔

علامہ ابن خلدون نے بھی قشیری کی اس رائے کو پسند کیا۔

صوفی کے لفظ کی لغوی تحقیق کے بعد اب ہم اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ تصوف کا مفہوم کیا ہے؟ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں علم التصوف کے باب میں اس کی توضیح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اَصْلُ التَّصَوُّفِ الْعُكُوْفُ عَلَى الْعِبَادَةِ وَالْاِنْقِطَاعُ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى، وَالْاِعْرَاضُ عَنْ زُخْرُفِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتِهَا وَ الزُّهْدُ فِيْمَا يَقْبَلُ اِلَيْهِ الْجُمْهُوْرُ مِنْ

Marfat.com

لَذَّةٍ وَّ مَالٍ وَّ جَاهٍ .... وَ كَانَ ذٰلِكَ عَامًا فِی الصَّحَابَةِ وَالسَّلَفِ۔

(تاریخ ابن خلدون ج ا ص ۸۶۳ دار الکتاب)

''تصوف کا معنی ہے عبادت پر ہمیشہ پابندی کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا، دنیا کی زیب و زینت کی طرف سے روگردانی کرنا، لذت، مال اور جاہ جس کی طرف عام لوگ متوجہ ہیں اس سے کنارہ کش ہونا۔ یہ طریقہ صحابہ کرام اور سلف صالحین میں عام مروج تھا''۔

اکثر حضرات تصوف کی تعریف میں اخلاقی پہلو کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور یہ نظریہ حلقۂ صوفیاء میں بھی مقبول ہے۔ اس نظریہ کے مطابق جن حضرات نے تصوف کی تعریف کی ہے ان میں سے چند نمونے پیش خدمت ہیں:

ابو بکر الکتانی (متوفی ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

''اَلتَّصَوُّفُ، خُلُقٌ وَمَنْ زَادَ عَلَيْكَ فِی الْخُلُقِ فَقَدْ زَادَ عَلَيْكَ فِی الصَّفَاءِ''۔ (تذکرۃ الاولیاء ص ۲۸۷ مطبع مجتبائی لاہور)۔

''یعنی تصوف، خلق کا نام ہے۔ جو خلق میں تجھ سے برتر ہوگا، وہ صفائی میں بھی تجھ سے بڑھا ہوا ہوگا''۔

ابو محمد الجریری (متوفی ۳۱۱ھ) سے کسی نے تصوف کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا:

''اَلْخُرُوْجُ مِنْ كُلِّ خُلُقٍ رَدِیٍّ وَالدُّخُوْلُ فِیْ كُلِّ خُلُقٍ سَنِیٍّ''۔

(تلبیس ابلیس ص ۱۵۸ تقدیم و تاخیر دار القلم)

''ہر رذیل عادت سے باہر نکلنا اور ہر اعلیٰ اور عمدہ خلق میں داخل ہونا تصوف ہے''۔

ابو الحسین النوری تصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لَيْسَ التَّصَوُّفُ رَسْمًا وَّ عِلْمًا وَّ لٰكِنَّهٗ خُلُقٌ''۔ (تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۴)

''تصوف نہ رسم ہے نہ علم، بلکہ یہ خلق کا نام ہے''۔

دوسرے مقام پر انہیں کا ارشاد ہے:

Marfat.com

''التَّصَوُّفُ، الْحُرِيَّةُ وَالْكَرَمُ وَ تَرْكُ التَّكَلُّفِ وَالسَّخَاءُ.

(تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۴)

''تصوف، حریت، کرم، بے تکلفی اور سخاوت کا دوسرا نام ہے''۔

اگرچہ اخلاقی نقطہ نظر سے تصوف کی یہ تعریف شرق و غرب میں مشہور بھی ہے اور مقبول بھی، لیکن اسے تصوف کی صحیح تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سے لوگ جو مکارمِ اخلاق میں اپنی نظیر نہیں رکھتے انہیں صوفی نہیں کہا جاتا۔ یہ بات مسلم ہے کہ تصوف کی بنیاد اخلاق کریمہ پر ہے اور صوفی کے لیے ناگریز ہے کہ وہ مکارم اخلاق سے متصف ہو، لیکن اسے تصوف کا حقیقی مفہوم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تصوف کی تعریف میں دوسرا نقطہ یہ ہے کہ اس کا معنی زہد ہے۔ یعنی دنیا اور دنیا کی زیب و زینت اور لذات سے کلیۃً کنارہ کشی۔ یہ بجا کہ صوفی کا دل دنیا سے بیزار ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ زہد و تقشف اور چیز ہے۔ بعض لوگوں نے عبادت گزار کو صوفی کہا ہے، لیکن ان کا یہ قول بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔ ایک شخص عبادت میں سرگرم ہوتا ہے، لیکن پھر بھی اسے صوفی نہیں کہا جاتا۔

ابن سینا نے اپنی کتاب ''الارشادات'' ص ۱۴۰ مطبوعہ اسلامیہ ٹیم لاہور میں بڑی وضاحت سے زاہد، عابد اور صوفی میں جو فرق ہے، اسے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''جو شخص دنیا اور اس کی لذتوں سے منہ موڑے اسے زاہد کہتے ہیں۔ جو شخص ہر لمحہ عبادت میں مصروف رہے اسے عابد کہتے ہیں اور:

وَالْمُنْصَرِفُ بِفِكْرِهِ إِلَى الْقُدْسِ الْجَبَرُوْتِ مُسْتَدِيْمًا لِشُرُوْقِ نُوْرِ الْحَقِّ فِيْ سِرِّهٖ، يَخُصُّ بِاسْمِ الْعَارِفِ.

یعنی جو شخص ہمیشہ اپنے فکر کو قدوس جبروت کی طرف متوجہ رکھتا ہے اور ہر لحظہ اپنے باطن میں نور حق کی تابانی کا آرزومند ہوتا ہے، اسے عارف کہتے ہیں اور ابن سینا کے نزدیک عارف ہی صوفی کہلانے کا مستحق ہے۔

Marfat.com

زاہد اور عابد، زہد و عبادت کو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ انہیں دوزخ سے نجات ملے اور نعیم جنت کی سرمدی مسرتیں انہیں نصیب ہوں۔ صوفی بھی دنیا کی زینتوں اور لذتوں سے دامن کش رہتا ہے اور ہمہ وقت مصروف عبادت رہتا ہے، لیکن اس کے پیش نظر کوئی خوف یا طمع نہیں ہوتا، وہ فقط اس لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے کہ وہ اس کا محبوب و مطلوب ہے اور ہر قسم کی عبادت و نیاز مندی کا مستحق ہے۔ حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک روز انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا:

اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتُ اَعْبُدُکَ خَوْفًا مِنْ نَارِکَ فَالْقِنِیْ فِیْھَا۔

اے اللہ! اگر میں تیری عبادت آتش دوزخ کے خوف سے کرتی ہوں تو مجھے اس میں جھونک دے۔

وَ اِنْ کُنْتُ اَعْبُدُکَ طَمْعًا فِیْ جَنَّتِکَ فَاحْرِمْنِیْھَا۔

اور اگر میں جنت کے لالچ کے لیے تیری جناب میں سر بسجود رہتی ہوں تو مجھے اس جنت سے محروم کر دے۔

وَ اِنْ کُنْتُ اَعْبُدُکَ لِوَجْھِکَ الْکَرِیْمِ فَلَا تَحْرِمْنِیْ مِنْ رُؤْیَتِہٖ

(تذکرۃ الاولیاء ص ۴۹)

اور اگر میں صرف تیری ذات کے لیے تیری عبادت کرتی ہوں تو اے میرے محبوب! مجھے اپنے شرف دیدار سے محروم نہ رکھیو۔

معلوم ہوا کہ تصوف نہ صرف اخلاق حسنہ کا نام ہے، نہ صرف دنیا کی لذتوں اور مسرتوں سے کنارہ کشی کا نام ہے اور نہ صرف شب و روز مصروف عبادت رہنے کا نام ہے۔ اگرچہ وہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے، لیکن وہ ان کے ماسوا اور چیز ہے۔

اس لیے ابھی ہمیں تصوف کی ایسی تعریف کی ضرورت ہے جس سے اس کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو جائے۔

Marfat.com

ابوسعید الخراز (متوفی ۲۶۸ھ) سے "صوفی" کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا:

مَنْ صَفّٰی رَبُّهٗ قَلْبَهٗ فامْتَلَأَ قَلْبُه نورًا وَ مَنْ دَخَلَ فِیْ عَیْنِ اللَّذَّةِ بِذِکْرِ اللّٰهِ۔

"یعنی جس کے دل کو اس کا رب پاک صاف کر دے اور اس کا دل نورِ الٰہی سے لبریز ہو جائے اور جو شخص ذکرِ الٰہی شروع کرتے ہی لذت و سرور میں کھو جائے"۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ۲۳۸)

حضرت جنید بغدادی، تصوف کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

التَّصَوُّفُ هُوَ اَنْ یُمِیْتَکَ الْحَقُّ عَنْکَ وَ یُحْیِیَکَ بِه۔

"یعنی تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے تیری ذات سے فنا کر دے اور اپنی ذات کے ساتھ تجھے زندہ کر دے"۔ (تذکرۃ اولالیاء ص ۲۲۶)

ابوبکر الکتانی کی تعریف ایجاز اور جامعیت کا شاہکار ہے، وہ فرماتے ہیں:

التَّصَوُّفُ: صَفَاءٌ وَ مُشَاهَدَةٌ۔ (تذکرۃ الاولیاء ص ۲۸۷)

یعنی تصوف صفاء یعنی تزکیہ اور مشاہدہ کا نام ہے۔

ان دو میں سے پہلی بات (صفاء) سبب ہے اور دوسری بات (مشاہدہ) غایت اور مدعا ہے۔ یہ تعریف بڑی جامع ہے اس میں سالک کی منزل کا بھی ذکر ہے اور اس راستہ کا بھی، جو سالک کو اس منزل تک لے جاتا ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس حقیقت کو ذرا تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

اَلطَّرِیْقُ تَقْدِیْمُ الْمُجَاهَدَةِ وَ مَحْوِ الصِّفَاتِ الْمَذْمُوْمَةِ وَ قَطْعِ الْعَلَائِقِ کُلِّهَا وَالْاِقْبَالُ بِکُنْهِ الْهِمَّةِ عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی مَهْمَا حَصَلَ ذٰلِکَ کَانَ اللّٰهُ الْمُتَوَلِّیَ لِقَلْبِ عَبْدِهٖ الْمُتَکَفِّلَ لَهٗ بِتَنْوِیْرِهٖ بِاَنْوَارِ الْعِلْمِ۔(1)

1۔ احیاء العلوم جلد 3، صفحہ 16، مطبوعہ مصر

Marfat.com

''اس منزل کا راستہ یہ ہے کہ پہلے مجاہدہ کرے، صفاتِ مذمومہ کو مٹائے، تمام تعلقات کو توڑ ڈالے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جب یہ سعادت حاصل ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل کا متولی بن جاتا ہے۔ اور علم کے انوار سے اس کو منور کرنے کا ذمہ دار بن جاتا ہے''۔

یہ ہے تصوف کا وہ مفہوم جس کو اولیاء اللہ اپنا مقصد حیات بناتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی صفا اور تزکیہ کے کٹھن مرحلوں کو صدقِ دل سے طے کرنے کے لیے وقف رہتی ہے تا کہ آخر کار وہ مشاہدہ کی منزل میں خیمہ زن ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ اس طرح وہ انسانیت کے اس مقامِ رفیع کو پالیتے ہیں جہاں ''نفخت فیه من روحی'' کا سرنہاں عیاں ہوتا ہے اور وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کی مسند جلیل پر متمکن ہوتے ہیں۔

اس تصوف پر، جس کے لغوی معنی اور اصطلاحی مفہوم کی تشریح آپ پہلے پڑھ چکے ہیں گزشتہ زمانوں میں بھی اور آج بھی، اپنوں نے بھی اور بیگانوں نے بھی، بدنیتی سے یا غلط فہمی کے باعث، بڑی بے رحمی سے طعن و تشنیع کے تیروں کا مینہ برسایا ہے اور آج اس تحریک میں مزید شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ عدل و تحقیق کا دامن بھی بسا اوقات ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس حالیہ شدت کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جو لوگ تصوف کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو باعث رسوائی اسلاف ہیں یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آثار کو دیکھ کر ابلیسی قوتیں ہراساں ہیں اور وہ مسلمانوں کو اس چشمۂ حیات سے بدظن اور متنفر کرنے کا قبل از وقت پروگرام بنا رہی ہیں، تا کہ مسلمان اس بیداری سے پوری طرح سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ وجہ کوئی بھی ہو، ہمیں اس حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان اعتراضات کا جائزہ لینا چاہیے۔ انہوں نے اگر کسی واقعی خامی کی نشاندہی کی ہے تو اس کے ازالہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اگر انہوں نے غلط اعتراضات کیے ہیں تو ان کا مسکت جواب دینا چاہیے۔

ایک بات میں ابتداء میں ہی صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس سے انکار نہیں

Marfat.com

کہ صوفیا کی صفوں میں ایسے لوگ بھی درآئے ہیں جو بظاہر عابد و زاہد نظر آتے ہیں، لیکن دراصل اپنے زہد و عبادت کو حصول مال و جاہ کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، لیکن مجھے یہ تو بتائیے انسانی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے، جہاں یہ کالی بھیڑیں موجود نہیں۔ علماء، اطباء، قضاۃ، تجار، صنعت کار، سب جگہ پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے طبقہ کے لیے ننگ و عار کا باعث ہیں، لیکن اگر ان کے وجود سے صحیح اور راستباز لوگوں کی افادیت کم نہیں ہوئی تو جعلی صوفیوں کے ہتھکنڈوں سے صوفیائے کرام کی عظمت پر حرف نہیں آسکتا۔ ہم جن صوفیاء کے بارے میں کلام کریں گے وہ وہ لوگ ہیں جو صحیح معنی میں اس لقب کے اہل ہیں۔

پہلا اعتراض

تصوف پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے کہ اس کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ نہیں، بلکہ یہ ایک اجنبی چیز ہے جسے اسلام میں زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے، لیکن جب ان معترضین سے اس اجنبی مصدر اور منبع کے بارے میں استفسار کیا جاتا ہے تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں اور انسان تصویر حیرت بن کر رہ جاتا ہے کہ تصوف کے کس معترض کی بات کو وقیع اور وزنی سمجھا جائے اور کسے لایعنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے؟ ان معترضین کا باہمی اختلاف اور کسی ایک منبع پر متحد نہ ہونا ہی ان کے اس قول کے بطلان کے لیے کافی ہے، لیکن پھر بھی ہم تمام اقوال کا ایک ایک کر کے ذکر کرتے ہیں اور اس کا علمی تجزیہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خود ہی حق و باطل میں امتیاز کر لیں گے۔

معترضین کا ایک طبقہ جس میں مستشرقین کے چند علماء بھی شامل ہیں، یہ کہتا ہے کہ تصوف کا ماخذ ہندوؤں کے وید ہیں اور بڑے وثوق سے دعویٰ کرتے ہیں کہ تصوف میں چلہ کشی، ریاضت وغیرہ کے سارے طریقے ہندو جوگیوں اور سادھوؤں سے مستعار لیے گئے ہیں۔ اس طبقہ کے سرخیل ہارٹن (Horton) بلوشیٹ (Blochet) اور ماسی نیون (Massignon) ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں اور بڑے محقق اور

مدقق شمار ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ان صاحبان کو اس بے مقصد تکلف کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا انہیں معلوم نہیں کہ مسلمان صوفیاء کے ہادی ورہبر نبی کریم ﷺ نے غارِ حرا میں چلہ کشی کی تھی اور ذکر الٰہی پر مداومت کے متعدد احکام قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ میں بصراحت موجود ہیں اور یہ سب اس وقت ان کو میسر تھا جبکہ ہندوؤں کی تہذیب وتمدن کے بارے میں جزیرۂ عرب کے باشندوں کو سطحی قسم کی معلومات بھی میسر نہ تھیں۔ اس لیے صوفیائے کرام کی ریاضتوں اور چلہ کشیوں کو ہندو جوگیوں کی طرف منسوب کرنا لغویت کی انتہا ہے۔ مزید برآں دونوں ریاضتوں کے مقاصد میں بعد المشرقین ہے۔

دوسرا طبقہ ان معترضین کا ہے جو مسلمانوں کے زہد وتبتل کو بدھ مت سے ماخوذ سمجھتے تھے۔ گولڈ زیر Goldzcher اور اولیری O'Leary کے پایہ کے مستشرق بھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ صوفیاء کا دنیا سے قطع تعلق درحقیقت گوتم بدھ کی تقلید ہے۔ جس طرح اس نے تخت وتاج کو ترک کر کے فقر وفاقہ کی زندگی اختیار کر لی تھی اسی طرح مسلمان صوفیاء نے بھی اپنے گھروں کے راحت وآرام کو ترک کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں آکر بسیرا کیا، لیکن اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے ان حضرات نے یہ غور کرنے کی زحمت بھی برداشت نہیں کی کہ گوتم بدھ خدا کے وجود کا منکر ہے۔ وہ نفس انسانی کو ہی سب کچھ خیال کرتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی وحدانیت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور یہ ریاضتیں مقصود بالذات نہیں بلکہ بارگاہِ الٰہی میں شرف باریابی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام کا تصوف دراصل فارسی تصوف کا آئینہ دار ہے۔ عرب ہر لحاظ سے فارس سے فروتر تھے۔ انہوں نے ان سے ہی کچھ لیا ہے۔ فارسیوں کو دینے کے لیے ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ اگر یہ لوگ اسلام سے پہلے کی بات کہہ رہے ہیں تو ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن ہم اس زمانہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ہماری بحث اس تصوف سے ہے جو آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے کے بعد رونما ہوا۔ جب قرآنِ کریم کے

Marfat.com

فیضان سے عرب مسلمانوں کی جھولیاں علم وحکمت کے جواہرات سے بھر گئیں تو وہ اپنے گھروں سے نکل کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچے اور بڑی دریا دلی اور فیاضی سے انہوں نے ان جواہرات کو لٹایا۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم یہ کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا کہ اہل فارس نے عرب مسلمانوں کو دینی، تہذیبی اور علمی اعتبار سے متاثر کیا، بلکہ یہ وہ عرب تھے جنہوں نے اپنے ظاہری فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اہل ایران کے عقائد، نظریات وافکار اور تہذیب وتمدن کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ جب اسلام کی برکت سے اہل فارس آتش پرستی کو چھوڑ کر خداوند احد ویکتا کے پرستار بن گئے، باقی اور کیا چیز تھی جس کے لیے مسلمان صوفی ان کے شکست خوردہ افکار سے دریوزہ گری کرتے؟ پروفیسر براؤن کا یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت ہے کہ ایرانی افکار نے عربوں کو متاثر کیا اور اسی سے ان کا تصوف ماخوذ ہوا۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال اگر کہیں کچھ مشابہت پائی بھی جاتی ہے تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ اسلامی تصوف اہل فارس کے نظریات سے ماخوذ اور مستعار ہے۔ اسلام کا تصوف صرف اسلام سے ماخوذ ہے اور وہ ہر اعتبار سے بالکل الگ اور جداگانہ چیز ہے۔

معترضین کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اسلام کے تصوف پر نصرانی تصوف کا بہت بڑا اور گہرا اثر ہے۔ اس دعویٰ کی تائید کے لیے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عربوں اور عیسائیوں میں عہد قدیم سے باہمی روابط تھے۔ عرب ایک غیر متمدن اور جاہل قوم تھے، جبکہ عیسائی دنیا علم وحکمت کے نور سے جگمگا رہی تھی۔ اس لیے لازمی طور پر مسلمان صوفیوں نے عیسائی راہبوں سے تصوف سیکھا اور اس کو اپنایا۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلام کی آمد سے پہلے کے بارے میں آپ کا یہ نظریہ درست ہے، لیکن ہم اس زمانہ کی بات کررہے ہیں، جبکہ عرب کے ظلمت کدہ کو وحی الٰہی کے نور تاباں نے رشک صد طور بنا دیا تھا اور ان ابجد ناشناسوں کو نہاں خانۂ تقدیر کے اسرار ورموز سے آشنا کردیا تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے خود اپنے ماننے والوں کو دنیا کی لذتوں میں کھو جانے سے سختی سے روکا تھا۔ قرآن کریم کی

صدہا آیات ہیں جو مسلمانوں کو زہد و تقویٰ کی تلقین کرتی ہیں اور دنیا کی بے ثباتی کا نقش لوح قلب پر ثبت کرتی ہیں۔ سورۃ الحدید کی ایک آیت ملاحظہ ہو:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (الحدید)

''تم خوب جان لو! کہ دنیوی زندگی، محض لہو ولعب، زینت اور ایک دوسرے پر اترانے اور مال و اولاد میں زیادتی پر فخر کرنے کا نام ہے۔ جیسے مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی بہت بہتر چیز ہے۔ اور نہیں ہے دنیا، مگر دھوکے کا سامان''۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی سماعت فرمائیے:

اِنِّیْ مِمَّا اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِیْ مَا يُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتِهَا۔ (بخاری و مسلم) (بخاری شریف ج ۲ ص ۵۳۲ دار الیمامہ)

''اپنے بعد میں تم سے جس چیز کے بارے میں ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ دنیا کی زینت اور کامیابی کے دروازے تم پر کھول دیے جائیں گے''۔

خود سوچیے کہ جس قوم کے پاس ان کی کتاب مقدس میں زہد و پرہیزگاری کے اتنے مؤثر مواعظ موجود ہوں، انہیں ان پریشان حال راہبوں کی تقلید کی کیا ضرورت ہے جو خود بے یقینی کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ اسی طرح عبادت الٰہی کی تلقین و ترغیب میں قرآن کریم کی بے شمار آیات موجود ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی اور واعظ کی ایک مومن کو کیوں ضرورت محسوس ہوگی؟ ارشاد ربانی ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ

Marfat.com

وَالۡاٰصَالِ وَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡغٰفِلِيۡنَ ﴿۲۰۵﴾ (الاعراف)

''اپنے رب کو یاد کیا کر، اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام اور غافلوں میں سے مت ہو جانا''۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِيۡرًا ﴿۴۱﴾ وَّسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ﴿۴۲﴾

''اے ایمان والو! تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہا کرو''۔ (احزاب)

قرآنِ کریم کی دوسری سورت کی یہ دل افروز اور روح افزا آیت بھی پڑھ لیجئے:

فَاذۡكُرُوۡنِىۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِىۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾ (بقرہ)

''تم مجھے یاد کیا کرو۔ میں تمہیں یاد کیا کروں گا۔ میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو''۔

جب ذکر الٰہی کے لیے ایسی آیات موجود ہوں تو ان کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا کسی غیر کی طرف متوجہ ہونا کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

مستشرقین جن کے غول کے غول اسلامی تصوف کو غیر اسلامی ثابت کرنے کے جنون میں جگہ جگہ ٹامک ٹویاں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان میں چند ایسی شخصیتیں بھی ہیں جنہوں نے پہلے تو اپنے پیشرووں کی تقلید کرتے ہوئے اسلامی تصوف کو غیر اسلامی افکار کا نتیجہ کہا، لیکن مزید تحقیق کے بعد جب حقیقت ان کے سامنے واشگاف ہوگئی تو انہوں نے بڑی جرأت سے اپنے سابق افکار و نظریات سے رجوع کیا۔ یہی نکلسن جو پہلے تصوف کو عیسائیت کا عطیہ کہتے رہے بعد میں انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھک میں تصوف کے عنوان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ آج تک اسلامی تصوف کے آغاز اور نشو ونما کے بارے میں غلط اندازے لگائے گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ تصوف اسلام میں باہر سے آیا، قطعاً قابل تسلیم نہیں، بلکہ روز اول سے ہی مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ تھا جو تلاوتِ قرآن اور مطالعۂ حدیث میں مشغول رہتا تھا اور ان کے تمام افکار و نظریات کا منبع

Marfat.com

قرآن وسنت کے بغیر کچھ بھی نہیں تھا۔

اکابر صوفیاء نے اپنی مستند کتاب میں اس بات کو واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ صوفی کے لیے کتاب وسنت کے ارشادات پر عمل پیرا ہونا کامیابی کے لیے شرط اول ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہر قسم کے شک وشبہ کے بطلان کے لیے کافی ہے۔ فرماتے ہیں:

این راہ کسے یابد کہ کتاب بر دست راست گرفتہ باشد وسنت مصطفیٰ ﷺ بر دست چپ ودر روشنائی این دو شمع میرود تا نہ در مغاک شبہت افتد نہ در ظلمت بدعت۔

(تذکرۃ الاولیاء شیخ عطار، ص ۲۱۴)

ترجمہ: یہ راہ تو وہی شخص پا سکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآنِ پاک ہو اور بائیں ہاتھ میں سنت مصطفیٰ ﷺ اور ان دونوں شمعوں کی روشنی میں وہ قدم بڑھاتا جائے تاکہ نہ شبہات کے گڑھوں میں گرے اور نہ بدعت کے اندھیروں میں پھنسے۔

شیخ ابو بکر طمستانی فرماتے ہیں:

الطَّرِیْقُ وَاضِحٌ وَالْکِتَابُ وَالسُّنَّۃُ قَائِمٌ بَیْنَ اَظْھُرِنَا۔

(طبقات الصوفیاء ص ۳۵۳۔ دار الکتب العلمیہ)

(راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب وسنت ہمارے سامنے موجود ہے)

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی ایک خط میں لکھتے ہیں:

اے برادر! در تفاوتِ فقراء اگر امروز خواہی کہ دریابی بجانب شریعت او نگاہ کن کہ شریعت معیار ست عیار فقیر بر شریعت روشن میگردد۔ (تاریخ مشائخ چشت ص ۴۱۳، دلی)

ترجمہ: اے بھائی! اگر تم فقراء کے مراتب کا پتہ آج لگانا چاہو تو ان کے اتباع شریعت پر نظر کرو۔ شریعت معیار ہے۔ اس کسوٹی پر عیار فقیر کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

صوفیائے کرام نے خود بھی کتاب وسنت پر عمل کیا اور اپنے حلقۂ عقیدت میں داخل ہونے والوں کو بھی کتاب وسنت کی پیروی کی تاکید فرمائی۔ مندرجہ بالا تصریحات کے علاوہ آپ قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف، فوائد الفواد وغیرہ کا

Marfat.com

مطالعہ کریں۔ آپ کو ان کے ہر ہر صفحہ پر کتاب وسنت پر عمل کرنے کی تلقین ملے گی۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص تصوف کو شریعت کے خلاف کہتا ہے تو اس کی اپنی مرضی۔

دوسرا اعتراض

معترضین یہ بھی کہتے ہیں کہ تصوف جاہلوں اور ناخواندہ لوگوں کا مسلک ہے۔ جو لوگ زیورِ علم سے آراستہ ہیں اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، وہ تصوف کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جو الزام لگانے والے کی کم نظری اور لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ اکابر صوفیاء اپنے اپنے زمانہ میں علم وفضل میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے ہمعصر علماء وفضلاء پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے، بلکہ تصوف کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے وہ علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت غوث الاعظم، حضرت خواجہ معین الحق والدین اجمیری، حضرت شہاب الدین سہروردی، غوث العالمین شیخ الاسلام حضرت بہاء الحق والدین زکریا ملتانی، حضرت بہاء الدین نقشبند، حضرت مجدد الف ثانی وامثالہم قدس اللہ اسرارہم، نہ صرف اقلیم درویشی کے شہنشاہ تھے بلکہ کشورِ علم وفضل کے تاجدار بھی تھے۔ کون ہے جو ان حضرات اور ان کے جلیل القدر خلفاء پر جہالت کی تہمت لگا سکے؟ ان کی تصانیف آج بھی اہل علم وتحقیق سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر فرمایا کرتے تھے کہ جاہل کبھی مسخر شیطان ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ حقیقت اور سراب میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ وہ دل کی بیماریوں کی صحیح تشخیص اور مناسب علاج نہیں کر سکتا۔

حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

”پیر آں چناں باید کہ در احکام شریعت وطریقت وحقیقت عالم باشد وچوں ایں چنیں باشد او خود ہیچ نامشروع نفرمائید“۔ (فوائد الفوائد، مترجم، ص ۳۲۷ ازادیہ)

ترجمہ: پیر ایسا ہونا چاہیے جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کا علم رکھتا ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو وہ کسی ناجائز کے لیے نہ کہے گا۔

Marfat.com

حضرت محبوبِ الٰہی کا یہ احوال بھی تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو خلافت عطا نہیں فرماتے تھے جو عالم نہ ہو۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی کا قول ہے:

اِجْتَنِبْ صُحْبَةَ ثَلَاثَةِ اَصْنَافٍ مِنَ النَّاسِ، اَلْعُلَمَآءِ الْغَافِلِیْنَ وَالْفُقَرَاءِ الْمُدَاهِنِیْنَ وَالْمُتَصَوِّفَةِ الْجَاهِلِیْنَ۔ (کشف المحجوب ص ۷ ادارۃ المعارف لاہور)

"تین قسم کے آدمیوں کی صحبت سے اجتناب کیا کرو۔ ایسے عالموں سے جو غافل ہوں، ایسے فقیروں سے جو دھوکے باز ہوں اور ایسے صوفیوں سے جو جاہل ہوں"۔

علامہ ابن جوزی، جو صوفیاء پر تنقید کرنے میں مشہور عالم ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ:

"وَ مَا كَانَ الْمُتَقَدِّمُوْنَ فِی التَّصَوُّفِ اِلَّا رُؤُوْسًا فِی الْقُرْاٰنِ وَالْفِقْهِ وَالْحَدِیْثِ وَالتَّفْسِیْرِ"۔ (تلبیس ابلیس ص ۲۱۲ دار القلم بیروت)

ترجمہ: یعنی صوفیاء متقدمین علوم قرآن، فقہ، حدیث اور تفسیر میں امام ہوا کرتے تھے۔

تیسرا اعتراض

صوفیاء نے عیسائی راہبوں کی طرح دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی تھیں، ان سے وہ لطف اندوز ہونے سے دست کش ہو گئے تھے، حالانکہ حدیث پاک میں موجود ہے کہ "لَا رَهْبَانِیَّةَ فِی الْاِسْلَامِ"۔ اسلام میں رہبانیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

(کشف الخفاء، جلد ۲، ص ۳۷۷، دار الکتب العلمیہ بیروت)

بے شک صوفیائے کرام ابتداء میں ہر قسم کے علائق سے دست کش ہو کر خلوت گزیں ہو جاتے ہیں اور اچھے کھانے، اچھے پہننے، رات کو آرام کرنے وغیرہ راحتوں کو ترک کر دیتے ہیں، لیکن یہ ان کا مقصد حیات نہیں ہوتا، بلکہ وقتی طور پر وہ تزکیۂ قلب اور تربیت نفس کے لیے ان مجاہدات کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جب وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نور عشق سے ان کے سینے منور ہو جاتے ہیں، مذموم عادات سے ان کی طبیعت

Marfat.com

پوری طرح متنفر ہو جاتی ہے اور محاسن اخلاق ان کی فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں، تو پھر ستیزہ گاہ حیات میں اسلام کا پرچم تھامے ہوئے وہ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ان کے تربیت یافتہ نفوس کے راستہ میں آلام و مصائب کی کوئی چٹان حائل نہیں ہو سکتی۔ ابلیس کی کوئی فسوں کاری ان کو متاثر نہیں کر سکتی، بلکہ وہ عزم و ثبات کا پیکر بن کر تسلیم و رضا کے پرخار راستہ پر خراماں خراماں گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ شخص جو اپنی زندگی اسلام کی سربلندی کے لیے وقف کرنا چاہتا ہو اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس پیغامِ حق کو پہنچانے کے لیے میدان میں نکلنا چاہتا ہو، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے وہ تزکیۂ قلب اور تربیت نفس کے کٹھن مرحلہ کو کامیابی سے طے کرے۔ اگر اس میں ذرا بھی خامی باقی ہو گی تو اس کی ادنیٰ سی لغزش اسلام کے وقار کو سخت نقصان پہنچانے کا باعث بنے گی۔

آج جب ہم تبلیغ اسلام کے لیے تحصیل علم کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور ریاضت و مجاہدہ کو غیر ضروری بلکہ خلافِ اسلام چیز قرار دیتے ہیں تو ہماری تبلیغ کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ نہ کلام میں اثر ہے نہ وعظ و نصیحت کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور ہماری اخلاقی کمزوریاں قدم قدم پر عیاں ہوتی ہیں اور اسلام کی تضحیک کا باعث بنتی ہیں۔ آپ یوں سمجھئے کہ کفار کے ساتھ گھمسان کی لڑائی شروع ہے۔ آپ سپاہی بھرتی کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں بھرتی کرنے کے بعد فوراً میدانِ جنگ کی طرف روانہ کریں گے یا پہلے میدانِ جنگ سے بہت دور ایک چھاؤنی میں بھیجیں گے جہاں وہ فوجی نظم و ضبط کے علاوہ اسلحہ کے استعمال کے ڈھنگ سیکھیں گے اور جب وہ تربیت کے اس مرحلہ کو مکمل کر لیں گے تب وہ اس قابل ہوں گے کہ انہیں میدانِ جنگ میں کسی محاذ پر متعین کیا جائے؟ اگر آپ عجلت سے سپاہیوں کو فوراً جنگ میں جھونک دیں گے تو وہ دشمن کے بجائے اپنے دوستوں کو نقصان پہنچائیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ وہ خود ہی اپنی گولی کا نشانہ بن جائیں۔

عیسائیوں کے نزدیک رہبانیت مقصد حیات ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے میں ہی سلامتی اور نجات سمجھتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے ہاں اس قسم

Marfat.com

کا قطعاً کوئی تصور نہیں۔ صوفیائے کرام کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے دنیا کو ترک کرنے کی تلقین نہیں کی، بلکہ دنیا کے بے اعتدالانہ استعمال اور اس کی محبت میں کھو جانے سے منع کیا ہے۔ انہوں نے شادیاں کیں۔ ان کے اہل وعیال تھے۔ ان کے ذاتی مکانات اور مزروعہ اراضی تھیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں ان پر رہبانیت کا الزام کیوں درست ہو سکتا ہے؟ اور یہ قرآنِ کریم کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی ان الفاظ میں ثناگستری فرماتا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور: ۳۷) یعنی یہ وہ مردانِ پاکباز ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے انہیں نہ تجارت غافل کر سکتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔

حضرت محبوب الٰہی کا ارشاد بھی سماعت فرمایئے:

''ترک دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند مثلاً لنگوٹہ بہ بندو بیشند ترک دنیا آں است کہ لباس بپوشد، طعام بخورد و آنچہ می رسد، دوا بدارد و بجمیع او میل نکند و خاطر را متعلق چیزے ندارد''۔ (فوائد الفوائد ص ۱۴۷ از اویہ)

ترجمہ: ''ترک دنیا کا یہ معنی نہیں کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو برہنہ کرے اور لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جائے، بلکہ ہمارے نزدیک ترکِ دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے، کھانا بھی کھائے اور حلال کی جو چیز دستیاب ہو اسے استعمال بھی کرے لیکن دولت کو جمع کرنے کی طرف راغب نہ ہو اور دل میں اس کو جگہ نہ دے''۔

یہ اعتراض بڑے زور و شور سے تصوف اور صوفیاء پر کیا جاتا ہے اور اس زمانہ میں تو اس اعتراض نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اور جو شخص چند سطریں لکھنے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے وہ اہل حق پر یہ اعتراض کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ آیئے پہلے معترضین کی بات سنیں اور اس کے بعد حقیقت کی کسوٹی پر اسے پرکھیں۔

معترضین حضرات کہتے ہیں کہ تصوف ایک افیون ہے اور صوفیاء نے ملت کے قوائے عمل کو مضمحل بلکہ مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کو اس بات پر اصرار ہے کہ ملت کو چاہیے کہ تصوف

Marfat.com

کی بنائی ہوئی ان روپہلی اور سنہری زنجیروں سے اپنے آپ کو رہا کرائیں اور تصوف کی پیدا کردہ خواب آلودہ فضا سے نکل کر حقائق کی تلخیوں سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔

بات یہی ہے، لیکن معترضین نے اسے نئے نئے جاذب قلب ونظر اسالیب میں بیان کر کے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔

ہم بڑی ذمہ داری اور وثوق کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان بزرگوں نے ملت کے عروق مردہ میں ہمیشہ نئی روح پھونکی ہے۔ ان کے فیض نگاہ سے حوصلوں میں بلندی، عزائم میں پختگی، ولولوں میں جولانی، اور قوتِ عمل میں برق آسا سرعت اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ آپ ذرا تعصب کی پٹی اتار دیجئے اور تبلیغ اسلام کی تحریک کے جواں مرد، علمبرداروں کے نقوش پا کو دیکھتے ہوئے ان میدانوں تک پہنچنے کی کوشش کیجئے، جہاں حق نے باطل پر ابدی فتح حاصل کی۔ برصغیر پاک و ہند پر ذرا سرسری نظر ڈالیے۔ سنجر کا ایک درویش، تبلیغ اسلام کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے وطن کو چھوڑتا ہے۔ اپنے اقارب واحباب کو الوداع کہتا ہے۔ اپنی منقولہ اور غیر منقولہ املاک سے دست کش ہوتا ہے اور تنہا بت کدۂ ہند کا رخ کرتا ہے۔ یہاں بھی کئی ایسے گوشے تھے جہاں اسلام نے اپنے قدم جما لیے تھے، لیکن اس کے حوصلہ کی بلندی اور اس کے عزم کی پختگی اور اس کے جوش کی جولانی اسے راجپوتانہ کے اس علاقہ میں لے جاتی ہے جہاں کفر کی کالی رات چھائی ہوئی ہے۔ ایک آمر مطلق راجہ وہاں کا حکمران ہے۔ اس ظالم راجہ کی اس ریاست کے کسی دور افتادہ گوشہ کو اپنا مسکن نہیں بناتا، بلکہ اس کی راج دھانی میں جا کر اپنا مصلّیٰ بچھا دیتا ہے۔ ساری آبادی بت پرست ہے اور اپنے ان مشرکانہ عقائد میں حد درجہ غلو رکھتی ہے۔ وہ اپنے ان معبودوں کے خلاف کوئی بات سننا گوارا تک نہیں کر سکتی۔ جگہ جگہ مندر موجود ہیں۔ بڑے بڑے برہمن ان لوگوں کے عقائد ونظریات کی حفاظت کے لیے ہر قسم کے علوم وفنون سے مسلح ہیں۔ مسند حکومت پر پرتھوی راج جیسا جابر، ظالم اور متعصب ہندو راجہ براجمان ہے۔ اس ناسازگار ماحول میں جو شخص حق کی دعوت دیتا ہے اور ہر قسم کے

Marfat.com

خطرات کے لیے سینہ سپر ہوتا ہے اور پھر اسلام کے پرچم کو یوں لہراتا ہے کہ اسے صدیوں کے انقلابات بھی سرنگوں نہیں کر سکتے، وہ شخص کون ہے؟ وہ ایک صوفی ہے۔ تصوف کے رنگ میں اس کا ظاہر اور باطن، اس کا ذہن، اس کا دل، اس کی سوچ اور اس کا نطق، سب رنگے ہوئے ہیں۔ کیا ایسے شخص کے بارے میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیمات، قوائے عمل کو مفلوج کر دینے والی ہیں، وہ رزمگاہ حیات سے فرار کا راستہ بتاتا ہے؟ اگر آپ میں یہ جرأت ہے تو آپ کہیے اور کہتے رہیے، لیکن آپ کے یوں غل مچانے سے حقیقت مسخ نہیں ہو سکتی۔ اسی کی خانقاہ کے فیض یافتہ صوفی ہندوستان کے شرق و غرب میں پھیل جاتے ہیں اور کفر و شرک کا اندھیرا جو صدیوں سے یہاں خیمہ زن تھا اس کو اپنے نعرۂ قلندرانہ سے نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کاش! اس قسم کے نفوسِ قدسیہ ملت کو ہمیشہ نصیب ہوتے۔

شاید معترضین کے علم میں نہ ہو کہ جب چنگیزی طوفان نے دنیائے اسلام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا، ہزاروں آباد شہر ویران کر دیے گئے تھے، لاکھوں بے گناہوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا، عروس البلاد بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی، عقل و دانش کے پرستار اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے، معلوم ہے آپ کو کہ کس نے ان سرکش طوفانوں کا رخ موڑا تھا؟ کس نے اسلام کے دشمنوں کو اسلام کی شمع کا پروانہ بنا دیا تھا؟ وہ یہی صوفیاء کے گروہ کا ایک فرد تھا جس کی ایک نظر نے ساری فضا کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک خراسانی بزرگ جو سلسلہ عالیہ قادریہ سے نسبت رکھتے تھے۔ اشارۂ غیبی کے تحت ہلاکو خان کے بیٹے تگودار خان کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے تشریف لائے۔ وہ شکار سے واپس آ رہا تھا، اپنے محل کے دروازے پر ایک درویش کو دیکھ کر اس نے ازراہِ تمسخر پوچھا: اے درویش! تمہاری ڈاڑھی کے بال اچھے ہیں یا میرے کتے کی دم؟ اس بیہودہ سوال پر آپ قطعاً برہم نہ ہوئے۔ بڑے تحمل سے فرمایا: اگر میں اپنی جاں نثاری اور وفاداری سے اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کر لوں تو میری ڈاڑھی کے بال اچھے ہیں ورنہ آپ کے کتے کی دم اچھی ہے، جو آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے اور آپ کے لیے شکار کی خدمت انجام دیتا ہے۔ تگودار خان اس غیر

Marfat.com

متوقع جواب سے بہت متاثر ہوا اور آپ کو مہمان کی حیثیت سے اپنے پاس ٹھہرایا اور آپ کی کوشش سے اس نے در پردہ اسلام قبول کر لیا، لیکن اپنی قوم کی مخالفت کے خوف سے اس کا اظہار نہ کیا۔ پھر انہیں یہ کہہ کر رخصت کیا کہ سر دست آپ تشریف لے جائیں، میں اپنی قوم کو ذہنی طور پر اسلام قبول کرنے پر آمادہ کروں گا۔ چنانچہ آپ وطن واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ وہ تگودار خان کے پاس جائے اور اسے اپنا وعدہ یاد دلائے۔ کچھ عرصہ بعد وہ تگودار خان کے پاس پہنچے۔ اس کو اپنا تعارف کرایا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ اس نے کہا کہ دوسرے تمام سردار اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں، لیکن فلاں سردار ابھی اسلام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر وہ راہِ راست پر آ جائے تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ آپ نے اسے بلا بھیجا اور تبلیغ کی۔ اس نے کہا: میری ساری عمر میدانِ جنگ میں گزری ہے۔ میں علمی دلائل کو نہیں سمجھ سکتا۔ میرا ایک ہی مطالبہ ہے کہ یہ درویش میرے پہلوان سے مقابلہ کرے اور اگر اسے پچھاڑ دے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ تگودار خان نے آپ کا نحیف و لاغر جسم دیکھ کر اس مطالبہ کو مسترد کرنا چاہا، لیکن آپ نے اس کا چیلنج منظور کر لیا۔ مقابلہ کے لیے تاریخ اور جگہ کا تعین ہو گیا۔ مقررہ دن بے شمار مخلوقات یہ عجیب وغریب دنگل دیکھنے کے لیے جمع ہو گئی۔ ایک طرف نحیف و کمزور پیر فرتوت اور دوسری طرف ایک پیل تن گرانڈیل نوجوان۔ تگودار خان نے بڑی کوشش کی کہ یہ مقابلہ نہ ہو، لیکن وہ درویش مقابلہ کرنے کے لیے مصر تھا۔ جب دونوں پہلوان اکھاڑے میں نکلے تو آپ نے اس زور سے اپنے حریف کو طمانچہ مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ غش کھا کر زمین پر آ گرا۔ وہ سردار حسب وعدہ میدان میں نکل آیا۔ آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ تگودار خان نے بھی اپنے ایمان کا اظہار کر کے اپنا نام احمد رکھا۔

ہلاکو خان کا ایک چچازاد بھائی تھا جس کا نام برکہ تھا۔ اسے بھی حضرت شیخ شمس الدین باخوری نے مشرف باسلام کیا۔ اس طرح ان پاک نہاد صوفیاء کی جرأت ایمانی اور دل آویز

Marfat.com

اسلوب تبلیغ کے طفیل پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے۔ فتح قسطنطنیہ اسلامی فتوحات کی تاریخ کا ایک لافانی واقعہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بائیس سالہ سلطان محمد کو کس نے اس کٹھن مہم کو سر کرنے کے لیے برانگیختہ کیا۔ وہ ایک صوفی تھے (حضرت عاق شمس الدین) جو سلطان محمد کے مرشد طریقت تھے۔ انہیں کی ترغیب اور بشارت سے سلطان نے یہ بے نظیر کارنامہ انجام دیا۔

جن صوفیاء کی مساعی جمیلہ کے صدقے دنیا میں اسلام پھیلا، قلعے اور شہر فتح ہوئے، قوموں اور ملکوں کے مقدر سنور گئے، ان کے بارے میں اسی ملت کے افراد اگر یہ کہیں کہ تصوف ایک افیون ہے، یہ غور وفکر کی قوتوں کو شل کر دیتی ہے، قوائے عمل کو اپاج بنا دیتی ہے تو اس زیادتی پر کس سے شکوہ کیا جائے؟

آیئے! بیگانوں سے پوچھئے کہ وہ صوفیاء کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یورپ کے مستشرق جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کر سکا، بلکہ بقول پروفیسر ہٹی (HITTI) اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں مذہبی اسلام نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ہالینڈ کے ایک فاضل لوکے کار دنے دبے انداز میں اس بات پر استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ گو اسلام کا سیاسی زوال تو بار ہا ہوا، لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا''۔ (تاریخ مشائخ چشت ص ۹)

پروفیسر مذکور نے ایک مشہور مستشرق ایچ اے آر گب (GIBB) کی ایک تقریر کا بھی حوالہ دیا ہے، جو انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کی مجلس کے سامنے کی تھی۔ گب نے کہا:

''تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا، لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آ جاتا تھا اور اس کو اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا

Marfat.com

مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

اسلام کے مخالف اور بدخواہ تو اس طوفانی قوت کا اندازہ کر کے لرزہ بر اندام ہیں جو تصوف کے چشمۂ شیریں سے ملت کو حاصل ہوتی ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ اس احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور شکوک وشبہات کے خس وخاشاک سے اس چشمۂ صافی کو گدلا کرنے کے درپے ہیں۔

تحریک پاکستان میں صوفیائے کرام نے جو شاندار کردار انجام دیا ہے، یہ تو کل کی بات ہے۔ اس کا کون انکار کر سکتا ہے؟

عصر حاضر مادیت گزیدہ ہے۔ ہر شخص مادی ثروت، مادی لذتوں اور مسرتوں اور مادی جاہ ومنصب کے حصول کے لیے دیوانہ وار مصروفِ عمل ہے۔ اس دور میں اسے اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کہ پاکیزہ اخلاقی قدریں کس طرح پامال ہو رہی ہیں؟ روحانیت کا رخ زیبا کیوں کر مسخ ہو رہا ہے؟ اور دل کی دنیا طمع وحرص اور حسد وبغض کی آلائشوں سے کس قدر متعفن ہو رہی ہے؟ اگر یہ دیوانگی ہمیں کسی اچھے انجام سے دوچار کر دیتی تو ہم قطعاً اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرتے، لیکن ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم بڑی سرعت سے زوال وانحطاط کے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور یہ ایسا گڑھا ہے جس میں جو قوم گری ہے، پھر اسے ابھرنا نصیب نہیں ہوا۔ ملت کے بہی خواہوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی جملہ علمی، روحانی اور عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی ملت کو اس گڑھے میں گرنے سے بچائیں۔ اس کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ان پاکیزہ فطرت ہستیوں کی زندگی کا مرقع زیبا پیش کریں جہاں للّٰہیت، خلوص، قناعت، استغناء، عالی حوصلگی، جرأت، سخاوت اور ہر انسان سے بے پناہ ہمدردی کے انوار قلب ونظر کو روشنی بخش رہے ہوں اور یہ ساری خوبیاں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ صوفیائے کرام کے سوانح حیات میں ہی دستیاب ہو سکتی ہیں۔

اسی فرض کی ادائیگی کے احساس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ اپنے نوجوانوں کی خدمت میں

اس یگانہ روزگار درویش، اس فقید المثال مرد حق، سراپا نور و ضیاء مرشد و ہادی کی سیرت طیبہ کے چند دلنواز پہلو پیش کر کے ان وارفتگان حسن غیر کو یہ کہہ کر جھنجھوڑ سکوں: (1)

اے تماشا گاہ عالم روئے تو!
تو کجا بہر تماشا مے روی

اس کے علاوہ میرے اس اقدام کا محرک ایک اور جذبہ بھی ہے جو میرے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یہ کہ جو حضرات اس مسلک درویشی سے منسلک ہیں، انہیں ایک سچے اور سچے درویش سے متعارف کراؤں، تاکہ انہیں پتہ چلے کہ اس کی اخلاقی بلندیوں، اس کی روحانی رفعتوں، اس کے کردار کی پختگی اور اس کے حوصلوں کی جولانیوں کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ جب وہ مرید ہوتا ہے تو کس حیرت انگیز لگن، استقامت اور اولوالعزمی سے سلوک کے مدارج طے کرتا ہے اور جب وہ مسند ارشاد کو زینت بخشتا ہے تو کس دل سوزی اور یکسوئی سے بادیۂ ضلالت میں سرگرداں رہنے والوں کی دستگیری کر کے انہیں واصل بحق کرتا ہے؟ اس کی پاک زندگی کے دونوں حصے عمل پیہم اور سعی مسلسل سے عبارت ہوتے ہیں۔ سستی اور کاہلی اس کے قریب تک نہیں پھٹکتی۔ اس کا ظاہر اور باطن محبت الٰہی کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے اور اس کے قول اور عمل میں تضاد کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ تاکہ اکابر اولیائے کرام کے سجادہ نشین حضرات اپنے اسلاف کرام کے اسوۂ حسنہ سے کسب فیض کر کے اسی جواں ہمتی، بالغ نظری کا ثبوت دیں اور اپنی تمام توانائیاں اسلام کو سربلند کرنے کے لیے وقف کر دیں۔

آخر میں ایک ادنیٰ گزارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کسی ولی کامل کے سجادہ نشین کی ذمہ داریاں بڑی اہم اور متنوع قسم کی ہوتی ہیں۔ عقیدت مندوں کی اپنے شیخ کے جانشین سے بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے نجی اور اجتماعی، مقامی اور ملکی، دینی اور سیاسی، جملہ معاملات میں اس سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں۔ اس لیے صاحب سجادہ کے

1۔ آپ کا یہ مقالہ ماہنامہ ضیائے حرم کے شمس العارفین نمبر سے لیا گیا ہے۔ یہ جملے حضرت خواجہ شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہیں۔

Marfat.com

لیے ضروری ہے کہ علم وفضل میں بھی بلند پایہ مقام رکھتا ہو اور اخلاق و کردار میں بھی مثالی حیثیت کا مالک ہو۔ اس لیے حضرات سے درخواست ہے کہ اپنی صوری یا معنوی اولاد میں سے جس فرزند کو وہ اپنی جانشینی کے لیے منتخب فرمادیں، اس کی تعلیمی اور اخلاقی تربیت کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمادیں۔ وہ قدیم اور جدید علوم کا ماہر ہو۔ مشہور عالم یونیورسٹیوں کا وہ فاضل ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا اخلاق اور کردار اتنا بلند ہو کہ کوئی بدخواہ بھی انگشت نمائی نہ کر سکے۔ ایسے ہونہار سپوت ہی اس پرفتن دور میں فقر و درویشی کی شمع کو روشن رکھ سکتے ہیں۔

علامہ اقبال نے سچ فرمایا ہے:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

(کلیات اقبال اردو ص ۴۲۲، بال جبریل ص ۱۳۰، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

مخالفین اس سلسلہ کو باوجود بڑی کوشش کے نہ نقصان پہنچا سکے اور نہ آئندہ پہنچا سکیں گے۔ ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے جاہل اور کمزور کردار کے مالک متصوفین نے پہنچایا ہے۔

Marfat.com

اسلام میں تصوف کا مقام

جنوری 1979ء میں پاک پتن شریف میں

شیخ العالم حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

کے عرس مبارک پر مدیر اعلیٰ ماہنامہ "ضیائے حرم"

حضرت پیر محمد کرم شاہ ایم اے (الازہر)

نے مشائخ عظام اور علمائے کرام کے عظیم الشان

اجتماع میں جو بصیرت افروز تقریر فرمائی وہ

قارئین کی ضیافت طبع کے لیے

حاضر خدمت ہے

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اگلے روز حضرت قبلہ دیوان صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ کا حکم نامہ ملا، جس میں تحریر تھا کہ حضرت شیخ الشیوخ، فرید الحق والدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک کے موقع پر جمعیۃ المشائخ کی طرف سے مجالس تصوف کا انعقاد عمل میں آرہا ہے، نیز اس ذرۂ ناچیز کو بھی ''اسلام میں تصوف کا مقام'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کا فرمان تھا۔

اس گرامی نامہ کے مطالعہ سے مجھے دوگنا مسرت ہوئی۔ ایک اس لیے کہ اس مردِ خود آگاہ اور خدا آگاہ قدس سرہٗ کے آستانہ عالیہ پر لاکھوں فرزندانِ اسلام حاضری دیتے ہیں۔ ان میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اہل نظر بھی، اہل خبر بھی، دیوانگانِ عشق بھی اور اقلیم عقل وخرد کے تاجور بھی، حاکم بھی اور رعایا بھی، خاص بھی اور عام بھی۔ پاکستان کے ہر صوبہ، ہر صوبہ کے ہر ضلع کے رہنے والے اپنے دلوں میں ارمانوں اور تمناؤں کی ایک حسین دنیا سمیٹے ہوئے حاضر ہوتے ہیں، لیکن جب وہ واپس جاتے ہیں تو کیا لے جاتے ہیں؟ یہ سوال ہر دل میں کھٹکتا ہے۔ صاحب آستانہ کی باطنی توجہ اور روحانی فیضان میں تو کلام نہیں، لیکن ظاہری طور پر ان کی صحیح رہنمائی کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔ جس دلربا ہستی کی کشش انہیں کشاں کشاں یہاں لے آتی ہے، اس کے کردار اور سیرت کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں ترستی ہی رہ جاتی ہیں۔ ملک کے اطراف واکناف سے آنے والوں کی تشنگی کا درماں کرنے کے بارے میں کچھ کیا جاتا ہے اور نہ سوچا جاتا ہے۔ یہ حالت آستانہ عالیہ کے ہر ذی ہوش عقیدت مند کے لیے بڑے کرب اور قلق کا باعث تھی۔

حضرت قبلہ سجادہ نشین مدظلہٗ العالی کی نگاہِ دوررس نے اس کسک کو محسوس کیا اور امسال اپنی نگرانی میں مجالس تصوف کے انعقاد کا اہتمام فرمایا۔ امید ہے اس اقدام سے یہ کمی بہت حد تک پوری ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس پروگرام کا آغاز کم از کم میرے لیے بڑا دل

Marfat.com

خوش کن ہے۔

دوسری خوشی مجھے یہ ہوئی کہ ان بابرکت مجالس میں اس درویش بے نوا کو بھی یاد فرمایا گیا۔ یہ امر میرے لیے صد فخر و مباہات کا باعث ہے۔

خوشیوں کے اس ہجوم میں ایک خلش مجھے مضطرب کر رہی ہے کہ جو اہم وارفع موضوع مجھے دیا گیا ہے، شاید اس کا حق میں ادا نہ کر سکوں۔ اس کی وجہ اپنی کم بضاعتی بھی ہے اور وقت کی تنگی بھی۔ مجھے ۲ دسمبر دس گیارہ بجے کے قریب یہ والا نامہ موصول ہوا ہے، قلت وقت کے پیش نظر میں اس موضوع سے انصاف نہیں کر سکا۔ بہر حال توفیق الہی سے جو کچھ ہو سکا، پیش خدمت ہے۔

آج تصوف پر ہر طرف سے یورش ہو رہی ہے۔ الزام تراشی میں ایسی جدت طرازیاں اور ندرت آفرینیاں برتی جا رہی ہیں کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ بیگانے تو عرصۂ دراز سے تیر افگنی میں مشغول تھے۔ انہیں ایسا کرنے کا حق بھی تھا۔ تصوف نے ان کے ظلمت کدوں کے اندھیروں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ اندھیروں کی مخلوق تھے۔ اس چکا چوند نے ان کی دنیا تاریک کر دی۔ ان کی بزم عیش ونشاط الٹ دی گئی۔ ان کے ہوا و ہوس کے صنم کدے ویران ہو گئے۔ ان کی عمرانی، معاشی اور معاشرتی قدریں، جو انہیں بے حد عزیز تھیں، اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھیں۔ تصوف اور اس کے حاملین کے ہاتھوں، جنہیں اتنے چرکے لگے ہوں، ان کی برہمی اور ناراضی بے جا نہیں۔ اپنی آتش انتقام کو بجھانے کے لیے اگر انہوں نے کذب و افتراء کا سہارا لیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں اور نہ ہمیں ان کا شکوہ کرنا زیب دیتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اب اپنے بھی تیشہ اور کدال لیے اس حصار محکم کو منہدم کرنے کے درپے ہیں، جن کو کئی صدیاں اس قلعہ نے حوادثات دہر کی بے رحم یلغاروں سے بچایا۔ وہ لوگ بھی اس چشمہ شیریں کو بند کرنے میں کوشاں ہیں، جس کے آب زلال نے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے گلستانوں کو شاداب کیا اور پر بہار رکھا۔ جس قوم کی تاریخ تصوف کے تخلیقی اور تعمیری کارناموں سے درخشاں ہے، وہی قوم

اب اس سے نالاں ہے۔

یہ صورتِ حال قابل برداشت نہیں۔ وہ لوگ جو تصوف کی افادیت کے قائل ہیں، جو اس کے دوررس اثرات کا علم رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ آگے آئیں، ذہنی انتشار کی پیدا کردہ ہولناک تاریکیوں میں اپنی تحقیق کے چراغ روشن کریں، تاکہ سالک راہ حقیقت بھٹک نہ جائے اور دامانِ خضر اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

سب سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تصوف ہے کیا؟ اس مقصد کے لیے میں فقط ان اولیاء و عارفین کے ارشادات پر اکتفا کروں گا، جو کشورِ تصوف کے تاجدار ہیں، جو بحرِ حقیقت کے ماہر غواص ہیں، جن کا قول، قول فیصل ہے، جن کی بات قطعی اور آخری ہے۔ جب تصوف کی صحیح تعریف آپ کے ذہن نشین ہو جائے گی تو پھر منزل کی طرف آگے بڑھنا آسان ہو جائے گا۔

حضرت معروف کرخی (م ۲۰۰ـ۸۱۶ء) تصوف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حقائق کو گرفت میں لانا، حقائق پر گفتگو کرنا اور خلائق کے پاس جو کچھ ہے، اس سے نا امید ہونا تصوف ہے"۔ (تذکرہ الاولیاء ص ۱۷۱)

حضرت ذوالنون مصری (م ۲۴۵ھ، ۸۵۹ء) سے پوچھا گیا کہ صوفی کون لوگ ہیں؟ فرمایا:

"وہ لوگ صوفی ہیں، جنہوں نے تمام کائنات میں سے صرف اللہ تعالیٰ کو پسند کیا"۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ۸۸ مجتبائی لاہور)

حضرت سہل بن عبداللہ تستری (م ۲۸۳ھ، ۸۹۶ء) کا ارشاد ہے:

"صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے خالی اور تفکر سے پر ہو اور قربِ خدا عز و جل میں بشر سے منقطع ہو۔ اس کی آنکھوں میں خاک اور سونا برابر ہو"۔ (تذکرۃ الاولیاء ص ۱۶۶)

حضرت جنید بغدادی (۲۹۷ھ ۹۱۰ء) کا ارشادِ گرامی ہے:

"صوفی وہ ہے، جس کا دل دنیا سے متنفر اور فرمانِ الٰہی کو ماننے والا ہو۔ اس میں تسلیم

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح، اندوہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح، فقر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح، صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح، شوق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح اور اخلاق سید الانبیاء والمرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کی طرح ہو"۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ۲۲۶)

ان تصریحات کے الفاظ میں تفاوت ضرور ہے، لیکن مدعا اور مقصد سب کا ایک ہے۔

حضرت شیخ کامل شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "عوارف المعارف" میں "صوفی کون ہے؟" کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالواحد سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک صوفی کون ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ میرے نزدیک صوفی وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل کے بقدر پیہم سنت رسول اللہ ﷺ پر قائم ہیں اور اپنے دلوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہیں اور اپنے نفوس کی شرارتوں سے بچنے کے لیے اپنے پیشوا اور سردار کا دامن پکڑے ہوئے ہیں"۔

(عوارف المعارف ص ۷۴ دار الکتاب العربی)

جب صوفیائے کاملین کے نزدیک تصوف اور صوفی کی یہ تعریف ہے تو اب میں ان مدعیانِ علم و دانش سے پوچھتا ہوں جو تصوف کو غیر اسلامی نظریات کا مجموعہ، عجمی افکار و تصورات کا مظہر کہتے ہوئے نہیں جھجکتے کہ کیا پوری یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، اس کے ہر حکم کی تعمیل، اس کی رضا کے حصول کے لیے سارے عالم سے روٹھنا اور اس کے حبیب مکرم، نور مجسم ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ نہیں؟ اور وہ شخص جو ان احوال سے بہرہ ور ہو، جو ہر ناشائستہ حرکت سے گریزاں اور تمام محامد و محاسن کا پیکر رعنا ہو، کیا وہ اسلامی تعلیمات کا حسین و جمیل نمونہ نہیں؟ کیا ایسے پاک نہاد کی نکھری ہوئی شخصیت اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل نہیں؟ اگر آپ ان تعلیمات کو غیر اسلامی گردانتے ہیں اور ایسے نفوس قدسیہ کو عجمی تصورات و افکار کا نمائندہ کہنے پر بضد ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ اسلام کو اس کی عظمتوں اور رفعتوں سے محروم کرنے کی ناکام کوشش کر

Marfat.com

رہے ہیں۔ آپ اپنی ملت کو ان نادرۂ روزگار اور فخر دہور واعصار ہستیوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں جو اسلام کی آبرو اور انسانیت کے لیے وجہ شرف ہیں۔

معترضین میں سے کوئی اسلامی تصوف کو مسیحی رہبانیت کا عکس قرار دیتا ہے، کوئی افلاطونیت کے فلسفہ کو اس کا ماخذ قرار دیتا ہے، کوئی اس کا رشتہ بدھ مت اور ہندو مت سے جوڑتا ہے، کوئی مانویت اور ایرانی فلسفہ کو اس کا سرچشمہ ثابت کرنے کے درپے ہے۔ تصوف سے بیر رکھنے والے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ ان میں خود بھی وحدتِ فکر مفقود ہے۔ البتہ ایک بات میں سب متحد ہیں کہ تصوف کی پاکیزہ تعلیمات کا تعلق اسلام سے نہیں۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ میں ان تمام غیر اسلامی مصادر ومراجع کا تجزیہ کروں، جن کو مستشرقین اور ہمارے ہاں محققین کہلانے والے تصوف کا ماخذ ثابت کرتے ہیں اور بتاؤں کہ تصوف ان تمام سے الگ، ان تمام تصورات سے جدا، ایک مستقل نظریہ ہے۔ جس کا سرچشمہ صرف قرآنِ حکیم اور سنت رسول کریم ﷺ ہے، لیکن وقت کی کمی اس کی اجازت نہیں دیتی۔

امید ہے حاضرین کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ صوفیائے کاملین کے نزدیک تصوف اور صوفی کا کیا مفہوم ہے اور ان کی تصریحات کے سامنے کسی نولڈیکی دان کریمر اور نکلسن کے اقوال کی کوئی اہمیت نہیں۔

مسلمانوں میں بھی بعض مدعیان علم وتحقیق ایسے ہیں جو تصوف کو عجمی تصورات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور تصوف پر تنقید کرتے ہوئے بڑے شد ومد سے یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی پستی اور معاشی بدحالی کی وجہ صوفیانہ نظریات ہیں۔ تصوف اپنے ماننے والوں کو رہبانیت کی زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔ کشمکش حیات سے الگ تھلگ رکھتا ہے۔ تصوف کے زیر اثر عملی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور انسان کارگاہِ حیات میں اپنا فرض ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اپنے اس قول کی تائید کے لیے وہ صوفیائے کرام کی چلہ کشی، ریاضات وعبادات اور خانقاہوں میں عزلت گزینی کو پیش کرتے ہیں، لیکن اگر بنظر

Marfat.com

غائر دیکھا جائے تو حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بے شک شیخ کامل، مرید سے چلہ کشی کراتا ہے۔ جہاں وہ علائق دنیا سے الگ رہتا ہے، ذکر وفکر میں چند روز گزارتا ہے، لیکن جب مبتدی ریاضات وعبادات اور چلہ کشیوں سے اپنے کردار اور سیرت کو اسلام کے حسین سانچے میں ڈھال لیتا ہے اور احکامِ الٰہیہ کی تعمیل اس کے لیے فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور اس کے اخلاق میں پختگی آجاتی ہے، اس وقت وہ شمشیر برہنہ بن کر میدانِ عمل میں قدم رکھتا ہے اور وہ کارنامے انجام دیتا ہے جن کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے، جیسے فوج میں رنگروٹ کو بھرتی کیا جاتا ہے، اسے کچھ عرصہ کے لیے چھاؤنی میں رکھ کر اس کی عسکری تربیت کی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے بچاؤ کے ساتھ دشمن پر مؤثر دھاوا بول سکے، اسے اسلحہ کو استعمال کرنے کی پوری پوری مشق کرائی جاتی ہے۔

اگر کوئی ملک، دشمن سے برسرپیکار ہو اور جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں، اس وقت بھی جن لوگوں کو فوج کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے، انہیں فوراً محاذِ جنگ پر نہیں بھیج دیا جاتا، بلکہ انہیں تربیت کے لیے لامحالہ چھاؤنی میں رکھا جاتا ہے۔ جب وہ ہتھیار چلانے کی مشق کر لیتے ہیں، لڑائی کرنے کے طریقے سیکھ لیتے ہیں، تب انہیں دشمن کا سر کچلنے کے لیے روانہ کیا جاتا ہے۔ اگر انہیں ٹریننگ کے بغیر میدانِ جنگ میں بھیج دیا جائے تو وہ دشمن کا نقصان کرنے کے بجائے اپنے لشکر کے لیے وبالِ جان بن جائیں گے۔

پہلے اکثر علماء، تکمیل علوم کے بعد تلاشِ مرشد میں شہر بہ شہر سرگرداں رہا کرتے اور جب کوئی مردِ کامل نظر آتا تو اس کے دست حق پرست پر بیعت کرتے اور اس کی خانقاہ میں رہ کر روحانی تربیت حاصل کرتے اور جب ان میں دینی پختگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر مرشد کامل انہیں لوگوں کی رشد وہدایت کے لیے کسی علاقے میں متعین فرماتا۔ اس طرح اس کا روحانی فیض، ہزاروں، لاکھوں کی بگڑی بنا دیتا۔ اس لیے چلہ کشی اور ریاضت، رہبانیت نہیں، جس طرح ہمارے بعض احباب کو غلط فہمی ہوئی ہے، بلکہ رزمگاہِ حق وباطل میں اپنا صحیح کردار انجام دینے کے لیے یہ تربیت کے لمحے ہیں، جو اس کی زندگی کو کامیاب بنانے کے

Marfat.com

لیے از بس مفید ہیں۔

آپ اولیائے کاملین کی سیرت کا مطالعہ کیجئے، ان کی کتاب زیست کا ہر ورق جہاد اور مجاہدے کے روح پرور کارناموں سے تابندہ ہے۔ ہم ہندوستان کی تاریخ پر ہی نظر ڈالتے ہیں۔ بے شک حضرت خواجہ غریب نواز معین الحق والدین نے تحصیل علم کے بعد کافی سال اپنے مرشد کامل حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی خانقاہ میں گزارے۔ یہ مدت بے شک خلوت اور عزلت کی تھی۔ اس عرصہ میں ان کی تمام تر توجہ اصلاحِ باطن اور تزکیہ قلب پر مرکوز رہی، لیکن جب سلوک کی یہ منزلیں طے کر کے مسند ارشاد پر فائز ہوئے تو آپ کے عزم محکم، ہمت بلند نے کفر و باطل کے جو قلعے سر کیے، شرک کے جن صنم کدوں کو پیوند خاک کیا، دنیا کا کوئی بڑا فاتح اور جرنیل بھی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ اس دور میں جب ہر طرف آمریت اور ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ یکتا و تنہا، لق و دق صحراؤں کو عبور کرتے ہوئے راجپوتانہ کی مرکزی ریاست اجمیر میں آ کر ڈیرا لگانا، کسی راہب کا کام نہ تھا، بلکہ اس مرد خدا کا کام تھا جو خطرات کی آندھیوں میں اپنا چراغ روشن رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جو مہلک گردابوں اور تند طوفانوں سے اپنا سینہ سلامتی سے نکال کر لے جا سکتا تھا۔ جو مشکلات کا ہر چیلنج قبول کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھا۔ جس کے نزدیک راہِ حق میں جان دینا حیاتِ جاوید تھی۔ جس کے دل کی دنیا میں کسی رائے تیورا کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ صرف اپنے خدا سے ڈرتا تھا اور صرف اس کے حکم کے سامنے اس کی گردن جھک سکتی تھی۔

جس جرأت، بہادری اور ہمت سے حضرت خواجہ غریب نواز نے تبلیغ اسلام کا کام کیا اور لاکھوں برگشتہ قسمت لوگوں کی تقدیر کو سنوار دیا، کیا یہ رہبانیت ہے؟ کیا یہ کشمکش حیات سے گریز اور فرار ہے؟ یہ سلسلہ آپ کے خانوادہ میں درجہ بدرجہ چلتا آیا۔ حضرت فرید الحق والدین گنج شکر رضی اللہ عنہ نے اپنے شیخ کی خانقاہ میں مراتب سلوک طے کیے۔ جب ریاضات و عبادات سے آپ کی تربیت مکمل ہوگئی تو اپنے شیخ طریقت کی اجازت سے آپ نے اس مبارک بستی میں اقامت اختیار کی اور زندگی کے بقیہ چند سالوں میں جو نورانی اور

Marfat.com

ایمان پرور انقلاب برپا کیا، جہالت و بربریت کے دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو علم و معرفت کی جو روشنی عطا فرمائی، اس کی عظمت اور اہمیت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ جن جنگلی قبائلی لوگوں کو آپ نے نورِ اسلام سے مشرف فرمایا، صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی اولادیں اس سبق کو یاد کیے ہوئے ہیں۔ اور اگر حضرت باوا صاحب اور دیگر صوفیائے کرام کی مساعیٔ جمیلہ سے یہ خطہ نورِ اسلام سے منور نہ ہوتا تو پاکستان کا تصور تک بھی کسی ذہن میں نمودار نہ ہوتا۔

اب بھی اس درگاہِ عالی کے فیوضات کا یہ عالم ہے کہ لوگ روتے روتے آتے ہیں اور ہنستے ہوئے واپس جاتے ہیں۔ شکستہ دل آتے ہیں تو ان کی دلداریاں کی جاتی ہیں۔ فسق و فجور سے آلودہ آتے ہیں اور سچی توبہ کر کے پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا عزم لے کر جاتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ سپہر فقر وولایت کے اس نیر اعظم کی تابانیوں کو دیکھنے کے بعد بھی لوگ یہ کہنے کی جرأت کیونکر کرتے ہیں کہ تصوف افیون ہے؟ یہ قوائے عمل کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ زندگی کے متلاطم سمندر میں کودنے کی جرأت سلب کر لیتی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ عزم جو شکست قبول ہی نہیں کر سکتا، وہ دل میں پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب کسی مردِ کامل کی نگاہ کرم پڑتی ہے۔

ہندوستان میں نو صدیوں پر پھیلی ہوئی اپنی تاریخ کا آپ مطالعہ کریں۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ جن سلاطین کی شجاعت اور بیدار مغزی کے ہم گن گاتے ہیں، جن سپہ سالاروں کی کشور کشائیوں کا ذکر کر کے ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، جن علماء اور فضلاء کے علمی کارناموں سے ایک دنیا فیضیاب ہوئی، وہ قادر الکلام اور نغز گو شعراء جنہوں نے اپنے کلام معجز نظام سے نیکی اور بھلائی کو فروغ دیا اور برائی اور بدی کی بیخ کنی کی، ان میں سے اکثر کسی نہ کسی مردِ کامل کے بستہ فتراک تھے۔ محمود غزنوی سے لے کر شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہم تک، سب اولیائے کرام کے فیض یافتہ تھے۔ صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں، جہاں جہاں بھی اسلام کے جرنیلوں

Marfat.com

نے اپنی فتوحات کے پرچم گاڑے ہیں، ان کی پشت پناہی کرنے والی کوئی روحانی طاقت تھی۔ قسطنطنیہ کی فتح دنیائے حرب کا محیر العقول کارنامہ ہے، جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ جس ترکی سلطان کو اس شہر کی فتح کی سعادت نصیب ہوئی، اس کا نام نامی سلطان محمد ہے، جو فاتح کے لقب سے چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس خطرناک مہم کا محرک کون تھا؟ اور کس نے سلطان محمد فاتح کو یہ سعادت حاصل کرنے کا شوق دلایا؟ وہ اس کے شیخ طریقت تھے۔ سلطان کی عمر اس وقت صرف بائیس سال تھی۔ ان کے مرشد کامل نے کہا کہ تم قسطنطنیہ پر حملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے گا۔ اپنے شیخ طریقت کی ترغیب اور تشویق پر سلطان محمد فاتح نے جنگوں کی تاریخ کا یہ محیر العقول کارنامہ انجام دے کر دانش ورانِ عالم اور ماہرین فن حرب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اگر صوفیاء راہبانہ زندگی گزارنے کے خوگر ہوتے اور تصوف افیون ہوتا تو آپ کی تاریخ ان زریں کارناموں سے جگمگا نہ رہی ہوتی۔

اکبر کے زمانہ میں جب ساری الحادی قوتیں اسلام کو مٹانے کے لیے میدان میں نکل آئی تھیں، آپ کو معلوم ہے کہ اس طوفانِ بلاخیز کا رخ کس نے موڑا تھا۔ وہ ایک مرد درویش تھا جو خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ کا تربیت یافتہ تھا۔ جو فقر و درویشی کی آغوش میں پل کر جوان ہوا تھا۔ جسے دنیا مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

یہ تاریخی شواہد ان لوگوں کے باطل نظریہ کی تردید کے لیے کافی ہیں، جو تصوف پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ تصوف وہ نظام ہے جو انسان کی صرف جسمانی تربیت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی روحانی بالیدگی پر اپنی ساری مساعی کو وقف کر دیتا ہے۔ اس کے مکتب کے طالب علم جب نماز ادا کرتے ہیں تو صرف ان کی زبان ہی تسبیح و تہلیل نہیں کرتی، ان کے ظاہری اعضاء ہی قیام اور رکوع و سجود میں مصروف نظر نہیں آتے، بلکہ ان کا دل، ان کی روح، ان کے جسم کا رواں رواں ذکر الٰہی سے سرشار ہوتا ہے۔ ان میں تواضع، انکسار،

Marfat.com

بردباری، تحمل، ایثار، عفو و درگزر، محبت و مودت کے وہ مکارمِ اخلاق رونما ہوتے ہیں کہ دنیا ان کے نورانی چہرہ کی زیارت کر کے ان کا دین قبول کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب کسی نے حضور نبی کریم ﷺ کے خلق عظیم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ازحد مختصر اور جامع جواب دیا:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ

''یعنی حضور کا خلق قرآن کریم تھا''۔ (کنز العمال ج ۷ ص ۲۲۲ التراث الاسلامی)

اخلاقِ محمدی کا یہی پرتو صوفی کے دل کو منور کرتا ہے اور اس کے ظاہر و باطن کو صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ۔ ۱۳۸) کے رنگ سے رنگین بنا دیتا ہے۔ کسی انسان کو صحیح انسان بنانا، سب کاموں سے زیادہ اہم اور زیادہ مشکل کام ہے اور جو ہستیاں ایک نہیں، لاکھوں کو درندگی اور وحشت کی آلودگیوں سے پاک کر کے رافت و رحمت کا پیکر بنا دیتی ہیں ان سے بڑھ کر انسانیت کا محسن اور کون ہو سکتا ہے؟

تصوف کی تاریخ اور صوفیائے کرام کی پاکیزہ زندگیوں کو دیکھ کر ایک منصف مزاج محقق اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اسلام میں تصوف کا وہی مقام ہے، جو روح کا جسم میں، خوشبو کا پھول کی پتی میں اور روشنی کا مہتاب میں ہے۔ جب سے تصوف کی طرف ہماری رغبت کم ہوئی ہے، عبادات کے گلشن میں جو پھول کھلتے ہیں، وہ اس مہک سے عاری ہیں۔ اعمال کے جو درخت ہیں، وہ پھل سے محروم ہیں۔ جسم تو بارگاہِ الٰہی میں جھکتا ہے، لیکن روح کو خبر تک نہیں ہوتی۔ زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہوتی ہے، لیکن دل کسی اور صحرا میں بھٹک رہا ہوتا ہے۔ نہ عبادات میں لطف رہا ہے اور نہ ان اعمال کی نورانیت کے جلوے نمایاں ہوتے ہیں۔

Marfat.com

حضرت خواجہ

شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ

اور ان کا عہد

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صحیح روایات کے مطابق قدوۃ العاشقین حضرت قبلہ شمس الحق والدین سیالوی قدس سرہٗ العزیز کی ولادت باسعادت ۱۲۱۴ھ میں ہوئی اور ۸۴ سال کی عمر میں ۱۳۰۰ھ میں وصال فرمایا۔ عیسوی سن کے مطابق یہ انیسویں صدی کا دور بنتا ہے۔ جو لوگ تاریخ ہندوستان سے واقف ہیں، ان پر مخفی نہیں کہ یہ دور امت مسلمہ کے لیے کتنا جانکاہ اور صبر آزما تھا۔ وہ قوم جس نے تعداد کی قلت کے باوجود اپنی جرأت، سیاسی بصیرت، عملی برتری، اخلاقی بلندی اور قوت ایمانی کے باعث ہندوستان پر آٹھ سو سال تک حکومت کی تھی، آج وہ حوادثات دہر سے خوفزدہ اور ہراساں تھی۔ محمود، شہاب الدین، التمش، بابر، اورنگ زیب علیہم الرحمۃ کے وارث اپنے عظیم اسلاف کی صفات سے یکسر محروم ہو چکے تھے۔ عیش کوشی، سہل انگاری، جاہ طلبی اور سیم وزر کی محبت نے انہیں ناکارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس صدی میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہونے والا تھا۔ ہندوستان کی وسیع وعریض اسلامی مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ فرنگی استعمار اسلام کے ان قلعوں کو یکے بعد دیگرے بڑی آسانی سے مسمار کرتا ہوا فخر البلاد دہلی کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

پنجاب کی حالت سب سے زیادہ خستہ تھی۔ مرکز سے کٹ جانے کے بعد اس کی حیثیت بے جان لاش کی سی تھی، جسے چیلیں، گدھ اور کتے آپس میں بانٹ رہے ہوں۔ ہر علاقہ میں ایک خود مختار حکومت قائم تھی۔ ہر قابل ذکر شہر کسی نہ کسی طالع آزما رئیس کی راجدھانی بن چکا تھا۔ ان کے درمیان رقابتوں کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی۔ ایک دوسرے سے برافروختگی اور برہمی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشترکہ خطرہ کے مقابلہ میں بھی متحد ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان حالات میں سکھوں نے اپنی قلیل تعداد کو منظم کر کے ان کمزور اور باہم برسرپیکار رئیسوں کو لتاڑنا شروع کر دیا اور ایک ایک کر کے ان کے علاقوں پر

Marfat.com

قبضہ کرتے چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی سکھ ریاستیں رونما ہوگئیں۔ ان خود غرض اور عاقبت نااندیش نوابوں اور رئیسوں کی سزا مسلم رعایا کو مل رہی تھی۔ مسلمانوں کی دل آزاری اور ان کی تذلیل سکھوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ سارا ملک لاقانونیت کی زد میں آ گیا تھا۔ تمام مظالم کا تختۂ مشق مسلمان تھے۔ انہی کے گھر لوٹے جاتے، انہی کی بستیاں تاراج کی جاتیں، انہی کے گھر جلائے جاتے، انہی کی مساجد اور عبادت گاہوں کو اصطبلوں میں تبدیل کر دیا جاتا۔

افغانستان اپنی داخلی خانہ جنگی میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کے حکمران نہ دہلی کے مغل بادشاہ کی کوئی امداد کر سکے اور نہ ہی پنجاب کے مظلوم مسلمانوں کی فریاد سن کر ان کی مدد کو پہنچ سکے۔ جن حکمرانوں نے برصغیر کے حالات کو درست کرنے کے لیے اقدامات کیے وہ ادھورے اور ناکافی تھے۔ ادھر وہ پنجاب میں سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کابل سے روانہ ہوتے، پیچھے سے ان کے دشمن بغاوت کا پرچم لہرا دیتے۔ چار و ناچار اس حاکم کو پھر واپس لوٹنا پڑتا۔ سارا ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار تھا۔

تاریخ کی بوالعجبیوں پر جب نظر پڑتی ہے تو انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ ۱۷۹۹ء ہی وہ سال ہے جس میں دنیائے اسلام کے بطل جلیل سلطان ٹیپو اس ملک کو انگریزوں کے ناپاک تسلط سے بچانے کی مجاہدانہ کوششوں میں جامِ شہادت نوش کرتا ہے۔ ۱۷۹۹ء ہی میں رنجیت سنگھ لاہور پر قبضہ کرتا ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ یہ لمحے امت مسلمہ کے لیے کتنے کربناک اور مایوس کن ہوں گے، لیکن رحمت الٰہی نے مایوسیوں کے گھپ اندھیروں میں امید کا چراغ روشن کرنے کے لیے اسی سال ۱۷۹۹ء میں سیال کی ایک چھوٹی سی بستی میں حضرت شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ کو پیدا فرمایا۔

حضرت کے آباؤ اجداد پشتہا پشت سے دنیاوی وجاہت اور علم، دونوں میں بڑے ممتاز تھے۔ حضرت کے جد اعلیٰ حضرت شیر کرم علی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ قادریہ کے ایک شہباز لامکانی حضرت موسیٰ پاک شہید ملتانی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ آپ نے پشاور میں ایک فاضل

روزگار سے علم کی تکمیل کی۔ وہاں سے اپنے استاد کی معیت میں حج بیت اللہ شریف کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر محبوب رب العالمین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آستانہ اقدس پر حاضر ہوئے۔ بارہ سال تک نعمت حضوری اور شرف عتبہ بوسی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بغداد جانے کا حکم ملا۔ کچھ عرصہ حضرت غوثِ اعظم محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ کے درِ کرم پر محو ریاضت رہے۔ حضرت غوثِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے عالم خواب میں آپ کا ہاتھ حضرت موسیٰ پاک شہید کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہاں سے ملتان پہنچے۔ مرشد کامل پہلے ہی شدت سے انتظار فرما رہے تھے۔ فوراً سینہ سے لگالیا۔ شرف بیعت بخشا، خرقۂ خلافت مرحمت فرمایا، عرصہ تک مجاہدہ و ریاضت میں مشغول رہے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک نوے سال تھی۔ پیر کامل نے وطن واپس جانے اور شادی کرنے کا حکم دیا۔ ایک عظیم المرتبت فرزند کی بشارت دی۔ آپ اپنے آبائی وطن قصبہ ڈھول پہنچے۔ وہاں آپ کا کوئی پہچاننے والا موجود نہ تھا۔ عزیز و اقارب فوت ہو چکے تھے۔ نئی نسل کو آپ کے متعلق خبر تک نہ تھی۔ چنانچہ وہاں سے رخصت ہو کر ایک جنگل میں قیام فرمایا اور وہاں سیال نامی بستی آباد کی، جس کے مقدر میں اس علاقہ کی تاریخ کو نیا عنوان بخشنا رقم تھا۔

چنانچہ اس فرخندۂ روزگار کی نسل پاک سے اقلیم معرفت کا تاجدار، میدانِ جود و عطا کا شہسوار، کاروانِ عشق و مستی کا قافلہ سالار، مطلع ہدایت کا نیر تاباں، خضر گم کردہ راہاں، مسیحا نفس تاج، الاولیاء، فخر الاتقیاء خواجہ خواجگاں محمد شمس الدین ادام اللہ تعالیٰ برکاتہٗ وعمت فیوضہ کا تولد ہوا۔ حضرت کے والد بزرگوار کا اسم گرامی میاں محمد یار ابن میاں محمد شریف ابن میاں برخوردار ابن میاں تاج محمود بن میاں شیر کرم علی علیہم الرحمۃ والغفران ہے۔ حضرت والا گہر کا سلسلہ نسب پچاس واسطوں سے حضرت عباس علمدار شہید کربلا رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی حضرت جنت بی بی تھا رحمۃ اللہ علیہا، آپ پوہلہ گاؤں کی تھیں جو سیال شریف سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ آپ قرآنِ کریم کی حافظہ تھیں۔ عبادت و ریاضت میں شب و روز مصروف رہتیں۔ آپ نے ایک درس قرآن جاری کر رکھا

Marfat.com

تھا جس میں بچیاں قرآنِ کریم یاد کرتی تھیں۔ آپ خود تدریس کے فرائض انجام دیا کرتیں۔ آج بھی موضع پوہلہ میں عورتیں بکثرت حافظۂ قرآن ہیں۔ یہ آپ ہی کا فیضان ہے۔ جب اس نورِ ولایت کی امانت آپ کے بطن مبارک میں منتقل ہوئی تو ذکر و عبادت کے معمولات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ شب و روز بکثرت درود شریف زبان پر جاری رہتا۔ سونے سے پہلے ہر شب اکتالیس بار سورۂ یٰسین تلاوت فرماتیں۔ تین ہمشیرگان کے بعد حضرت میاں محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں وہ آفتاب طلوع ہوا جس نے ان گنت تیرہ بختوں کو بلند اقبال کیا۔ جس نے بے شمار غافل دلوں کو ذکرِ الٰہی کی لذت سے بہرہ ور کیا۔ جس کے یمن و برکت سے ہزاروں سالکان راہِ محبت کو منزلِ وصل تک رسائی نصیب ہوئی۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نورِ باطن سے نوازا تھا جب وہ اس خورد سال نونہال کو دیکھتے تو دست بستہ سراپا ادب بن کر کھڑے ہو جاتے۔

آپ کے چچا حضرت میاں احمد یار صاحب کی شادی لالی قوم کی ایک خاتون سے ہوئی تھی۔ ان محترمہ کے والد روشن ضمیر درویش تھے۔ ان کا اسم گرامی میاں نور نبی تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنی بچی سے ملنے کے لیے سیال شریف آئے۔ اس وقت حضرت کم سن تھے، مگر آنگن میں گھٹنوں کے بل چل رہے تھے۔ آپ کی جبین سعادت پر جونہی نگاہ پڑی ازراہِ ادب کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پوچھا: اس طفل صغیر کے سامنے ایسی تعظیم بجالانے کا کیا مطلب؟

اس درویش نے کہا کہ تم اس بچے کی شان کو پہچانتے نہیں۔ اس کی پیشانی پر اسم اعظم لکھا ہے۔ جب یہ اپنے مرتبۂ کمال پر فائز ہو گا تو اپنے روحانی فیوض و کمال سے ایک عالم کو سیراب کر دے گا اور اس کے دروازے پر صدہا باکمال دست بستہ کھڑا ہونا باعث سعادت سمجھیں گے۔

میاں نور نبی صاحب نے اپنی بیٹی کو کہا: میں نے دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بچی عطا فرمائے۔ تم اپنی بچی کا رشتہ اس کو دینا تاکہ قیامت کے روز میں بھی اس مردِ کامل کے رشتہ داروں میں اٹھایا جاؤں۔

میاں محمد اکرم صاحب لغاری، جو موضع دین پور کے بزرگ تھے۔ ان کا واقعہ آپ ابھی پڑھیں گے۔ آج دوسرے رسائل فلمی ایکٹریسوں کی ہیجان خیز تصاویر سے اپنے صفحات کو منور کرنا وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ لوگ سیاسی لیڈروں، سرمایہ دار صنعت کاروں کے گن گاتے ہیں ضیائے حرم ارباب وفا کے تذکروں سے قلب کی پاکیزگی، نفس کی طہارت اور سیرت میں پختگی پیدا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ آج ان مردانِ پاکباز کی للّٰہیت و اخلاص، راہِ حق پر استقامت و ثبات کی یادوں کو تازہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس اہم ترین کام کی توفیق دے۔ آمین

حضرت میاں محمد یار علیہ الرحمۃ کا یہ اکلوتا فرزند ارجمند جمال ظاہری میں بھی فرید روزگار تھا۔ چمکتا ہوا چہرہ، نرگسیں آنکھیں، خمدار ابرو، خوبصورت ناک، کشادہ پیشانی، گلاب کی پتیوں کو شرما دینے والے پتلے پتلے ہونٹ اور اس پر جمال ربانی کا پرتو، دل کو دیکھے بغیر قرار نہ تھا اور آنکھ کو کو یارائے دیدار نہ تھا۔ جب آپ کی عمر مبارک ساڑھے چار سال ہوئی تو تعلیم قرآن کریم کے لیے مکتب میں بٹھائے گئے۔ سات سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد مزید علم حاصل کرنے کے لیے دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ علاقہ پنڈی گھیپ کے ایک گاؤں میکی ڈھوک میں ایک مدرسہ تھا۔ اپنے ماموں میاں احمد دین صاحب کی معیت میں پہلے وہاں گئے۔ فارسی کی ابتدائی کتب وہاں پڑھیں، لیکن استاذ صاحب کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ان کے انتقال کے بعد مکھڈ شریف پہنچے۔ اس وقت وہاں حضرت مولانا محمد علی صاحب علیہ الرحمۃ نے علم کی شمع روشن کررکھی تھی اور طالبانِ علم جوق در جوق اس چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے تھے۔ آپ نے تیرہ سال تک اپنے استاد گرامی کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا۔ اس عرصہ میں مکھڈ کے ایک تاجر میاں محمد امین، جو مولانا موصوف کے بڑے عقیدت مند تھے، انہوں نے تجارتی مقاصد کے لیے کابل کے سفر کا قصد کیا۔ ان کی درخواست پر مولانا نے اپنے اس تلمیذ ارشد کو ان کی معیت میں کابل روانہ کیا۔ تاجر موصوف کو اپنے کاروباری مشاغل کی وجہ سے وہاں کافی عرصہ رکنا پڑا۔ حضرت نے اس

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کابل کے مایہ ناز اور متبحر عالم حضرت مولانا حافظ دراز صاحب کے درس سے استفادہ شروع کیا۔ ہدایہ شریف وہاں پڑھی اور حدیث شریف کی سند بھی آپ سے حاصل کی۔ کابل کے قیام کے دوران میں جو بروایت حضرت ثالث غریب نواز رحمۃ اللہ حضرت خواجہ فخر الدین سیالوی مدظلہ نے یوں بیان فرمائی:

آپ حافظ صاحب کے درس میں اکتساب علم فرما رہے تھے۔ طلبہ کے لیے رہائش کا خاطر خواہ بندوبست نہ تھا۔ ایک روز افغانستان کے حکمران امیر شیر علی کی سواری شاہی تزک واحتشام کے ساتھ گزر رہی تھی۔ آپ نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور پر جلال لہجے میں فرمایا:

''برائے اقامت ما جا دہی یا نہ دہی''۔

یعنی ہمارے رہنے کے لیے کوئی جگہ دو گے یا نہیں۔ امیر ایک درویش کی جرأت اور بے ساختہ پن سے بڑا متاثر ہوا اور اپنے کابلی لہجے میں کہا:

''چرا نہ دہم بہ سر و چشم مے دہم''

کیوں نہیں دوں گا، سر آنکھوں پر دوں گا۔ حضرت کے استاد صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف ایک صاحبزادی تھی۔ اس نوجوان شاگرد میں صوری اور معنوی خوبیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد دل میں طے کر لیا تھا کہ انہیں دامادی کا شرف بھی بخشیں گے اور اپنی مسند ارشاد و تدریس کا وارث بھی بنائیں گے۔ اپنے اس عزم کا اظہار آپ سے بھی کر دیا۔ ہونہار شاگرد ادب سے برملا انکار نہ کر سکا، لیکن آپ نے میاں محمد امین صاحب، جن کے ہمراہ آپ کابل آئے ہوئے تھے، یہ ماجرا بیان کر دیا اور اپنی پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ میاں محمد امین نے تسلی دی۔ چنانچہ کابل سے روانہ ہونے سے پہلے میاں صاحب استاد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مؤثر انداز میں حالات بیان کیے کہ انہوں نے بخوشی حضرت کو واپسی کی اجازت دے دی۔

جب میاں محمد امین اپنے مشاغل سے فارغ ہوئے تو حضرت ان کی معیت میں پھر

Marfat.com

اپنے مشفق استاد کی خدمت میں پہنچ کر تحصیل علم میں مصروف ہو گئے۔

حضرت مولانا محمد علی اگرچہ علم و فضل میں بے نظیر اور زہد و ورع میں منفرد اور مرجع خلائق تھے، لیکن دل ابھی کسی صاحب کمال کے لیے تڑپ رہا تھا جو ایک نگاہ میں گھائل کر دے اور اپنی توجہ باطنی سے حریم ذات کے دروازے کھول دے۔ کئی بزرگوں کی شہرت سنی، گئے، دیکھا اور لوٹ آئے۔ دل کی تسکین کا سامان کہیں نظر نہ آیا۔ ایک روز کسی راہ نورد نے حضرت پیر پٹھان قبلۂ عالمیان شاہ محمد سلیمان تونسوی قدس سرہٗ کا تذکرہ اس انداز سے کیا کہ سنتے ہی دل بے چین ہو گیا اور تونسہ مقدسہ کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر ہمایوں اثر میں اپنے اسی تلمیذ ارشد کو اپنے ہمراہ لیا۔ جب کشتی دائرہ دین پناہ کے مضافات میں پہنچی، آپ اترے اور ملاحوں کو رخصت عطا فرمائی۔ وہاں ایک گدھا کرایہ پر لیا اور قبلۂ عالمیان، شہنشاہ اقلیم ولایت، حضرت شاہ محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کے درِ اقدس پر پہنچے۔ حضور نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ عرض کی: مکھڈ سے۔ مزید استفسار فرمایا: مولوی صاحب بخیریت تھے؟ عرض کی: وہ خاکسار میں ہی ہوں۔ حضور نے اٹھ کر گلے سے لگا لیا اور بڑی عزت و تکریم کی۔ رہائش کے لیے انہیں ایک الگ حجرہ مرحمت فرمایا۔ مولانا تو اپنی اقامت گاہ پر فروکش ہو گئے، لیکن شمس معرفت حضرت پیر پٹھان کو دیکھتے ہی ہزار جان اور ہزار دل سے فریفتہ ہو گئے اور اتنا یارائے صبر بھی نہ رہا کہ اپنے استاد محترم کا انتظار کریں۔ موقع ملتے ہی بارگاہ ناز میں حاضر ہوئے اور بیعت کے لیے گزارش کی۔ مرشد کامل نے ازراہ غایت بندہ نوازی شرف بیعت سے سرفراز فرمایا اور نماز مغرب کے بعد نفل اوابین اور حفظ الایمان اور ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ درود پاک پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا: سردست تمہارے لیے اتنا وظیفہ کافی ہے۔ جب تحصیل علم سے فراغت پا کر آؤ گے اس وقت مزید کرم فرمایا جائے گا۔ اس سعادتِ ازلی سے بہرہ اندوز ہو کر اپنے استاد محترم کے پاس حاضر ہوئے اور آرام فرمایا۔

مولانا نے چند روز توقف کے بعد بیعت کے لیے عرض کی۔ حضور نے فرمایا: آپ بہر وجہ افضل و اکمل ہیں۔ آپ کا علم و فضل مشہور عالم ہے۔ آپ کو اس فقیر سے بیعت کرنے کی

کیا ضرورت ہے؟ حضرت مولانا نے بصد ادب و نیاز عرض کی۔ قبلہ میں نے علم اس لیے تو نہیں پڑھا تھا کہ یہ میری محرومی کا باعث ہو اور میں اس نعمت سرمدی سے بے بہرہ رہوں۔ میں نے تو علم ہدایت پذیری کے لیے پڑھا ہے۔ اس لیے حضور اس خاکسار پر نظر کرم فرمائیں اور مجھے اپنی غلامی کی عزت سے محروم نہ رکھیں۔ علم و فضل کے باوجود مولانا کی اس ادائے نیاز مندی کو حضور نے بہت پسند فرمایا اور کچھ اوراد پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ ان وظائف کے پڑھنے سے مولانا کے دل کی پہلی صفائی بھی جاتی رہی۔ ذوق و شوق کی جو چنگاری سلگ رہی تھی وہ پھر سرد ہو گئی۔ آپ اس صورتِ حال سے بڑے غمزدہ ہوئے اور اپنی کیفیت عرض کی۔ حضرت پیر پٹھان نے اپنی زبان میں فرمایا کہ (بابا ایک لڈے تے بیا آوے) یعنی ایک رخصت ہو تو دوسرا آوے۔ آپ کے پہلے واردات رخصت ہوں گے۔ تب نئی کیفیات کا ورود ہوگا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد مولانا کے دل میں درد و سوز اور ذوق و شوق کی وہ کیفیت پیدا ہو گئی جس کا بیان زبانِ قلم سے ممکن نہیں۔

مولانا نے چھ ماہ تک شہباز لامکانی کے آستانہ عالیہ پر قیام کیا۔ نعمت دیدار، توجہ باطنی اور کرمہائے بے پایاں سے محظوظ ہوتے رہے۔ چھ ماہ بعد حضور نے آپ کو طلب فرمایا۔ بیعت بھی کیا اور نعمت باطنی سے مالا مال کر کے خرقۂ خلافت بھی مرحمت فرمایا اور واپس مکھڈ جانے کی اجازت دی۔ مولانا ہمراہی سرد گلبن وحدت مراجعت فرمائے مکھڈ شریف ہوئے۔

حضرت شمس العارفین کو طالب علمی کے زمانہ میں بھی جس صاحب کمال نے دیکھا حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھی آپ مکھڈ سے اپنے والدین کی ملاقات کے لیے تشریف لایا کرتے تو دین پور کے قصبہ سے گزر ہوتا۔ وہاں ایک باکمال بزرگ میاں محمد اکرم صاحب رہا کرتے تھے۔ جب اس خجستہ خصال نوجوان کو دیکھتے تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور رخصت کرنے کے لیے کافی دور تک دین پور سے باہر آتے۔ آپ کے کسی خادم نے اس تکریم پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ شاید آپ اس نوجوان طالب علم کی اس لیے عزت کرتے ہیں کہ یہ میاں شیر کرم علی صاحب کی اولاد میں سے ہے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ تم درج

Marfat.com

ولایت کے اس گوہر تاباں کی قدر نہیں پہچانتے۔ ایک دن آئے گا جب یہ نوجوان اقلیم فقر کا فرمانروا ہوگا۔ اس کی عظمت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجے گا۔ بڑے بڑے ارباب کمال یہاں حاضر ہوکر اپنی منزل مراد کو پائیں گے۔ میاں کرم علی صاحب جیسے بزرگ اور میرے جیسے لقمہ خوار، ہزاروں ہزار اس کے آستان پر دربان ہوں گے۔

استاد محترم نے نجابت و شرافت اور سعادت ازلی کے آثار اپنے اس فرشتہ سیرت شاگرد میں ملاحظہ فرمائے تھے۔ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ انہوں نے خیال فرمایا کہ اپنے شاگرد رشید کو جانشین بنائیں گے تاکہ ان کی وفات کے بعد اس کے دم قدم کی برکت سے یہ سلسلۂ فیض جاری وساری رہے۔ اس چیز کا علم جب آپ کے والدین کو ہوا تو وہ ہجر و فراق کا تصور کر کے تڑپ اٹھے۔ تونسہ شریف حاضر ہوکر حضرت شاہ سلیمان قدس سرہٗ کی خدمت میں اپنا ماجرا عرض کیا۔ ملجائے بیکساں نے مولانا کو تحریر فرمایا کہ آپ نے اس فقیر کو اسیر کر رکھا ہے، اس کو اپنے باپ کے ساتھ روانہ کرو۔ لوگوں کے فرزندوں کو قید نہیں کر لیا کرتے۔ نیز شمس العارفین کو حکم نامہ تحریر فرمایا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ جائیں اور سنت نکاح ادا کریں۔

حسب فرمان مرشد اپنے گھر واپس تشریف لائے اور حسب ہدایت اوراد و اذکار پوری پابندی سے انجام دیتے رہے۔ فرصت کے وقت تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ سال میں کئی کئی بار پیادہ منزل جاناں کی زیارت کرنے کے لیے آتے اور کم سے کم چالیس روز قیام فرماتے۔ جب بتقاضائے عمر ظاہری قوتوں میں اضمحلال آشکارا ہوا تو پھر بامر مجبوری سوار ہوکر تونسہ شریف حاضر ہوتے۔

اپنے مرشد کی خدمت اور غلامی کو سرچشمۂ سعادات و برکات یقین کرتے۔ چودہ مرتبہ حضرت پیر پٹھان کی معیت میں تونسہ مقدسہ سے مہار سدا بہار کا سفر کیا۔ اس شان سے کہ حضور ایک تیز گھوڑی پر سوار ہوئے۔ یہ پیکر صدق و وفا اپنے مرشد کا قرآن کریم مع رحل بغل میں لیے، بادۂ محبت سے سرشار ہوکر، حضرت کی گھوڑی کے آگے آگے دوڑتے۔ لوگ اس حسین و رعنا نوجوان کے جسم نازک اور اس پر یہ مشقت، جفاکشی، پھر شوق و مستی کا عالم اور

Marfat.com

ہمت کی بلندی کا مشاہدہ کر کے دنگ رہ جاتے۔ دیکھنے والا ایک نظر سے پہچان جاتا کہ یہ کس منزل کا مسافر ہے اور اس کی منور آنکھیں کس کے درد محبت کی غمازی کرتی ہیں۔

تونسہ شریف سے مہار شریف ایک سو کوس یعنی ایک سو پچاس میل کی مسافت ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً سارا علاقہ جنگل بیابان یا چٹیل ریگستان تھا۔ پانی نایاب، آبادیاں خال خال، سڑکیں اور شاہراہیں مفقود۔ ایک دفعہ حضرت پیر پٹھان قدس سرہٗ دیار محبوب کی طرف روانہ ہوئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ نوجوان سیال بڑے ذوق وشوق سے وجد کناں اپنے مرشد کی گھوڑی کے آگے آگے دوڑتے جا رہے تھے۔ آپ برہنہ پا تھے۔ ریشم سے نرم و نازک پاؤں کے تلوؤں میں کانٹے چبھتے۔ آبلے بنتے رہے اور دھوپ قیامت ڈھا رہی تھی۔ زمین تپ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس بلند اقبال اور اولوالعزم نوجوان کے ذوق وشوق میں ذرا فرق نہیں آ رہا تھا۔ اچانک مرشد کامل نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اپنی پاپوش مبارک اتار کر آپ کو دی کہ انہیں پہن لو تا کہ گرم ریت، راہ میں بکھرے ہوئے کانٹے اور سنگریزے نہ چبھیں۔ آپ نے اس تحفہ کو بصد شکریہ قبول کیا اور چوم لیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر حضرت پیر پٹھان نے آپ کو حسب سابق ننگے پاؤں دیکھا اور پوچھا: جوتے کہاں ہیں؟ عرض کیا جوان کا صحیح مقام تھا میں نے انہیں وہاں سجا لیا ہے۔ حضرت اس جذبۂ نیاز مندی پر از حد مسرور ہوئے۔ اپنی گھوڑی سے نیچے اترے اور اپنے جوان بخت مرید کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسرار و معارف کے کتنے خزینے بخش دیے۔

حضرت پیر سیال فرمایا کرتے کہ میں نے اپنے مرشد کی خدمت میں چودہ سال کا طویل عرصہ اس انتظار میں گزارا کہ کوئی رحمت کی گھڑی آئے اور لطف خسروانہ ابر کرم بن کر برسے، اتنے عرصے میں مجھے دو بار یہ خصوصی لمحے نصیب ہوئے۔ اس وقت آپ ایک اسی واقعہ کا ذکر کرتے اور دوسرا زیارت خضر کا واقعہ، جس کا بیان ابھی آ رہا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب تک اپنے مرشد کے ساتھ اتنی والہانہ عقیدت نہ ہو، افادہ اور

Marfat.com

استفادہ کا دروازہ نہیں کھلتا۔ طالب کو گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ اپنے شیخ سے کامل درجہ کی محبت نے باطن کو تو ہمرنگ کر ہی دیا تھا، ظاہری شکل وصورت میں بھی ایسی مماثلت پیدا ہوگئی تھی کہ حضرت کو دیکھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ اس نے حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی کی زیارت کی ہے۔ آپ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں جب تونسہ شریف حاضر ہوئے تو آستانہ عالیہ کے تالاب پر تشریف فرما تھے۔ جس نے دیکھا یہی سمجھا کہ خود حضرت پیر پٹھان تشریف فرما ہیں۔ کسی خادم نے دوڑ کر حضرت خواجہ کریم تونسوی کی خدمت میں گزارش کی کہ قبلہ! میں اپنی آنکھوں سے حضرت پیر پٹھان کو تالاب پر بیٹھے دیکھ کر آیا ہوں۔ حضرت خواجہ کریم نے سن کر فرمایا: پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب سیالاں والے آگئے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت پیر پٹھان کے پوتے حضرت خواجہ خیر محمد صاحب سیال شریف تشریف لائے اور حضرت باوجود ضعف پیری اور نقاہت کے، اپنے شیخ کے پوتے کی خدمت میں دن میں کئی بار حاضر ہوتے اور کافی دیر زانو شکستہ دست بستہ بیٹھے رہتے۔ اس اثناء میں حضرت صاحبزادہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جب سے ہمارے جد امجد خواجہ محمد سلیمان صاحب کا انتقال ہوا ہے تب سے حضرت خواجہ سیالوی کی زیارت سے ہمارے دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے جد امجد اور خواجہ سیالوی کی صورت اور سیرت میں ایک بال کا فرق نہیں۔

بعض حضار مجلس نے یہ کلمات طیبات اعلیٰ حضرت سیالوی کی خدمت میں عرض کیے، لیکن حضرت نے ازراہِ کسر نفسی فرمایا: مور (چیونٹی) کو سلیمان کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ ے

خاک دہلیز سلیمان پہ یہ پیشانی ہے
چشم اس مور کی بر لطف سلیمانی ہے

میاں حفیظ ماہی صاحب ساکن سور کی شریف، حضرت مولانا سلطان محمود صاحب ساکن تاڑہ، دونوں حضرت پیر پٹھان کے جانثار مرید تھے۔ حضرت پیر پٹھان کے انتقال کے بعد ان کی دنیا تاریک ہوگئی۔ نہ رات کو آرام نہ دن کو قرار۔ ہجر محبوب میں ہمہ وقت رویا

Marfat.com

کرتے۔ ایک رات حضرت پیر پٹھان نے میاں حفیظ ماہی صاحب کوخواب میں ارشادفرمایا کہ تم روتے کیوں ہو؟ میں تو اب تمہارے نزدیک سیالاں میں رہتا ہوں۔ آپ بیدار ہوئے، اسی وقت بستر باندھا، سر پر رکھااور سیال شریف کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں ہی اپنے پیر بھائی مولانا سلطان محمود صاحب کے پاس سے گزرے۔ دیکھا وہ بھی بستر باندھے بیٹھے ہیں اور آمادۂ سفر ہیں۔ آپ نے پوچھا: حضرت کہاں کی تیاری ہے؟ فرمایا: رات کو میرا دل ازحد سوگوار تھا۔ روتے روتے آنکھ لگ گئی۔ حضرت پیر پٹھان نے شرفِ زیارت بخشا اور فرمایا: مولوی صاحب! آپ اتنا کیوں روتے ہیں؟ میں تو اب تمہارے بالکل قریب سیالاں میں آ گیا ہوں۔ بعینہٖ یہی خواب حفیظ ماہی صاحب دیکھ کر روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا: بخدا! مجھے بھی آج رات یہی حکم ملا ہے۔ چنانچہ دونوں حضرت پیر سیال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے روئے تاباں کی زیارت سے ان کے غمزدہ دلوں کو قرار آ گیا اور پھر ساری عمر حضرت پیر سیال کی محبت کا دم بھرتے رہے۔ حضرت نے ان کو خلافت عطا فرمائی۔

جب حضرت پیر سیال کی عمر مبارک چھتیس برس ہوگئی، زہد و ریاضت سے سینہ گنجینۂ نور بن گیا تو شاہ شاہاں خواجہ محمد سلیمان قدس سرہٗ نے خرقۂ خلافت ارزانی فرمایا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ میں تجھے گم کردہ راہوں کو راہِ ہدایت پر لانے کے لیے آوارگانِ دشت محبت کو منزل محبوب تک پہنچانے کے لیے بیعت اور خلافت کی اجازت دیتا ہوں۔ آپ نے بصد نیاز عرض کی کہ مخدوما! میں اس بارگراں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس سے معذور سمجھا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ ''تو کہاں ہے؟ جب تو میں ہو گیا تو پھر تو کہاں رہا؟ تیرے ہر کام کا میں ذمہ دار ہوں۔ اپنے آپ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجھے اس کا مجاز کرتا ہوں''۔ چنانچہ ظاہری و باطنی انعامات سے سرفراز فرما کر گھر رخصت کیا اور روانگی کے وقت سخت تاکید کی کہ جس فیض کا تمہیں امین اور جس خزینۂ سعادت کا تجھے قاسم مقرر کیا گیا ہے، اس سے کوئی محروم واپس نہ جائے۔ جو بیعت کا خواہش مند ہو کر آئے اس کی دستگیری ضرور کی جائے۔

جب دوبارہ اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دریافت فرمایا کہ کیا کسی کو بیعت

Marfat.com

کیا ہے؟ عرض کی: صرف میرے والدین نے میری بیعت کی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بیعت نہیں ہوا۔ حضرت پیر پٹھان نے جلال میں آ کر فرمایا کہ میں نے تو تجھے شہباز بنایا ہے۔ سارا عالم تیرا صید زبوں ہے۔ اپنی ہمت خداداد کو مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت میں صرف کر۔ ایک دفعہ حضرت پیر پٹھان تشریف فرما تھے۔ مشتاقانِ دید کا ہجوم تھا۔ اس اثناء میں ایک نورانی پیکر بزرگ حاضر ہوئے اور کچھ دیر محو گفتگو ہو کر رخصت ہو گئے۔ جب وہ تھوڑا سا دور گئے تو حضرت نے حاضرین مجلس کو کہا کہ جس شخص کے دل میں خضر کی زیارت کا شوق ہو، وہ جائے اور زیارت کرے۔ یہی خضر تھے جو یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں۔ لوگ دیوانہ وار خضر کی زیارت کرنے کے لیے دوڑ پڑے، لیکن حضرت پیر سیال وہیں بیٹھے رہے۔ حضور نے فرمایا: مولوی صاحب! کیا خضر کی زیارت کرنے کا اشتیاق نہیں؟ عرض کی: میں تو اس کی زیارت کروں گا، جس کی زیارت کے لیے خضر آتا ہے۔ حضرت پیر پٹھان حضور کی اس سعادت مندی اور خلوص پر بڑے خوش ہوئے اور دعا فرمائی: ''اللہ سائیں! میرے سیال نوں رنگ لائیں''۔ اے اللہ تعالیٰ! میرے اس مرید باصفا کو ابدی عزت و سعادت سے سرفراز فرما۔ اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ شرق و غرب سے لوگ کسب فیض کے لیے پروانہ وار سیال شریف آنے لگے۔ آپ کو اپنے شیخ کا اتنا احترام ملحوظ تھا کہ تونسہ شریف کی حدود میں قضائے حاجت نہیں کی۔ تین میل دور تشریف لے جاتے۔

ایک دفعہ آپ سیال شریف سے تونسہ مقدسہ زیارتِ شیخ کے لیے جا رہے تھے، راستہ میں ایک جنگل سے گزر ہوا، وہاں ایک نورانی شکل بزرگ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے فرمایا: درود کبریت احمر پڑھا کرو۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے پیر کا فرمان کافی ہے۔ تونسہ شریف حاضر ہوئے تو مرشد کریم نے فرمایا کہ راستہ میں تمہیں ایک آدمی ملا تھا۔ اس نے جو وظیفہ بتایا ہے وہ پڑھا کرو۔ وہ حضرت پیرانِ پیر غوث الاعظم تھے۔ یہ درود پاک ''کبریت احمر'' اس سے پہلے طریقہ چشتیہ کے اوراد میں شامل نہ تھا۔ حضرت پیر سیال کے ذریعہ یہ نعمت عظمیٰ چشتیہ سلسلہ کو نصیب ہوئی۔

Marfat.com

اعلیٰ حضرت سیالوی پھر اس کی تلاوت پر مداومت فرمایا کرتے۔ آں والا مرتبت نے معہودہ طریقہ کے مطابق اس کی زکوٰۃ بھی دی۔ اس کے اختتام پر بارگاہِ رسالت سے آپ پر جو خصوصی کرم ہوا، اس کے ذکر سے قارئین "ضیائے حرم" کو محروم رکھنا بہت بڑی زیادتی ہے۔

میری خصوصی درخواست پر شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف نے یہ واقعہ اپنی زبانِ مبارک سے یوں بیان کیا:

مجھے مولانا محمد امین صاحب چکوڑوی نے بتایا کہ حضرت مولانا معظم الدین صاحب مرولوی کبریت احمر کی زکوٰۃ کے ایام میں خدمت عالی میں حاضر رہا کرتے اور ہر طرح کی خدمت بجالاتے۔ انہوں نے اپنا چشم دید واقعہ یوں بیان کیا کہ اعلیٰ حضرت نے سیال شریف سے باہر مغرب کی طرف ایک جگہ کو کبریت احمر شریف کی زکوٰۃ کے لیے مقرر فرمایا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں کسی کو اس خلوت میں مخل نہ ہونے دوں، چنانچہ جس روز زکوٰۃ کا اختتام تھا، چاشت کا وقت تھا۔ آپ تلاوت میں مصروف تھے۔ میں کافی پیچھے ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک اندھیرا سا ہوا جیسے صبح صادق کا وقت ہو اسی اثناء میں چند گھوڑ سوار آسماں کی طرف سے اترے۔ حضرت نے آگے بڑھ کر ایک شہسوار کی قدم بوسی کی۔ یہ حضور نور مجسم سرور عالم ﷺ کی ذات ستودہ صفات تھی۔ حضور کے دست مبارک میں ایک دستار تھی، جو آپ کے سر پر باندھی گئی۔ اس عزت سے مشرف کرنے کے بعد حضور ﷺ روپوش ہو گئے۔ میں نے حاضر خدمت ہو کر اس عزت افزائی پر مبارکباد عرض کی۔ اعلیٰ حضرت نے دریافت فرمایا کہ آپ نے بھی زیارت کی ہے؟ میں نے عرض کیا: آپ کے صدقے مجھے بھی یہ عزت نصیب ہوئی ہے۔ حضرت نے مجھے تاکید کی کہ میں اس واقعہ کا کسی کے سامنے ذکر نہ کروں۔

جب تک حضرت پیر سیال اس جہانِ فانی میں جلوہ افروز رہے، مرید صادق نے اس راز کو افشا نہیں کیا، لیکن آں جناب کے وصال کے بعد آپ نے مناسب نہ سمجھا کہ اپنے مرشد کے اس کمال کو مخفی رکھیں۔ اس لیے آپ نے احباب سے اس کا تذکرہ فرمایا۔

Marfat.com

حضرت کا اندازِ تبلیغ وارشاد بالکل نرالا تھا۔ اسوۂ نبوت کا کامل نمونہ۔ مناظرہ، مجادلہ، بحث وتکرار کا تو وہاں گزر ہی نہ تھا۔ جو بات فرماتے، محبت و پیار کے رنگ میں رنگی ہوتی اور بڑے سے بڑا جھگڑالو مد مقابل بھی خلوص کی مہک سے از خود رفتہ ہو کر سر نیاز قدموں میں رکھ دیتا۔ بڑے بڑے علماء وفضلاء مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ لیکن ناوک نگاہ کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لیے غلام بے دام بن کر رہ گئے۔ بے شمار ایمان افروز واقعات سے ایک دو روح پرور باتیں آپ بھی سن لیجئے۔

تحصیل خوشاب میں انگہ ایک مشہور قصبہ ہے۔ قاضی سلطان محمود صاحب کا زمانہ تھا۔ آپ کے علم وفضل کی شہرت دور دراز علاقوں میں پہنچ چکی تھی۔ آپ کے تبحر علمی کے باعث علمائے عصر آپ کو استاد کل کہا کرتے۔ ان کے فضل وکمال کی بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ حضرت قبلہ سید مہر علی شاہ صاحب آپ کے شاگرد تھے۔ حضرت کئی سال تک انگہ میں قیام پذیر رہے اور آپ کے چشمۂ علوم ومعارف سے سیراب ہوتے رہے۔

قاضی صاحب مذکور کو پتہ چلا کہ ان ہی کے ضلع شاہ پور میں سیال کے مقام پر ایک فقیر ظاہر ہوا ہے، جو سماع سنتا ہے اور لوگ جوق در جوق اس کے مرید بنتے جا رہے ہیں۔ قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق سماع شریعت میں ناجائز تھا۔ ان کی ایمانی غیرت یہ گوارا نہ کر سکی کہ ان کے علاقہ میں خلافِ شریعت فعل کو اتنا فروغ نصیب ہو۔ چنانچہ ایک گدھے پر اپنی کتابوں کے انبار لادے اور مناظرہ کرنے کے ارادہ سے سیال شریف روانہ ہوئے۔ وہاں اپنے معتقدین اور ساز وسامان کے ساتھ ایسے وقت پہنچے جب حضرت شمس العارفین اپنی مجلس آراستہ کیے ہوئے، معرفت کے موتی لٹا رہے تھے۔ قاضی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آدابِ مجلس کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جو شرعاً ممنوع ہیں۔ حضرت نے قاضی صاحب کی بات سن کر بڑے تحمل سے فرمایا: قاضی صاحب! میری گردن بلکہ میری سات

پشتوں کی گردن شریعت کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے خلافِ شریعت کام کرنے سے بچائے۔ یہ جواب سننے کے بعد قاضی صاحب تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وضو کرنے کے لیے شرقی کنواں پر تشریف لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حضرت نے قوالوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے پنجابی کے ان بولوں سے محفل سماع کا آغاز کیا۔

جھنگ کنوں دل تنگ پیو سے پچھاں ہزارے دیاں داتاں

میرے ماہی دیاں مٹھیاں باتاں جیویں کھنڈ شکر نباتاں

قاضی صاحب سماع کی آواز سن کر غصے سے دوڑے ہوئے آئے، بار بار کہہ رہے تھے: پھر بھی آپ باز نہ آئے۔ پھر بھی آپ باز نہ آئے۔

جب قاضی صاحب قریب پہنچے تو حضرت نے ایک بار نگاہ بھر کر دیکھا، ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور غش کھا کر گرے۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے اور قوال برابر ان بولوں کو دہرا دہرا کر قاضی صاحب کی آتش شوق کو بھڑکا رہے تھے۔ قاضی صاحب بہت بڑی دستار باندھا کرتے تھے جو ان کے علم وفضل کی گواہی دیتی تھی۔ اس مستی وشوق میں اپنی دستار سر سے اتاری اور قوالوں کو جا کر دی۔ اس محفل پر کیف ومستی کا جو رنگ چڑھا ہوگا اس کی ماہیت کیونکر بیان کی جاسکتی ہے! قوال جب اس بول کا تکرار کرتے تو آپ تڑپتے اور یہ نعرہ لگاتے:

حق او یارو! حق او یارو!

حضرت ثانی غریب نواز اس محفل پاک میں حاضر تھے۔ جب قاضی صاحب نے اپنی دستار قوالوں کو جا کر نذر کی تو آپ چپکے سے اٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔ گھر میں سونے چاندی کے جتنے زیورات تھے، سب اٹھا کر لائے اور قوالوں کو پیش کر کے ان کے عوض قاضی صاحب کی دستار ان سے لے لی اور فرمایا: یہ عالم کی دستار ہے اور اسی کے سر پر زیب دیتی ہے۔ پھر قاضی صاحب کے سر پر وہ دستار باندھ دی۔ اعلیٰ حضرت غریب نواز اپنے فرزند دلبند کی اس ادا شناسی پر بڑے مسرور ہوئے اور آپ کو دعاؤں سے نوازا۔

Marfat.com

مردانِ خدا مناظرہ کے اکھاڑوں کو یوں اپنی چشم کرم سے عشق و محبت کے خیابان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی نہیں، بلکہ ہر روز کا معمول تھا۔ خدنگ ناز کی زد میں جو آیا، جانے نہیں پایا۔

حضرت کی خدمت اقدس میں ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے۔ فقیر بھی، امیر بھی، گدا بھی، نواب بھی، سالک بھی، قلندر بھی، عالم بھی اور ان پڑھ بھی اور اس کریم کے دروازے سے ہر شخص اپنی استعداد اور اپنے ظرف کے مطابق بہرہ ور ہوا کرتا۔ ہر شخص کی اصلاح اور تربیت کے لیے ایسا انداز اختیار فرماتے جو اس کی نفسیات کے عین مطابق ہوتا۔

ضلع جھنگ میں شاہ جیونہ کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ جہاں حضرت محبوب عالم، جو شاہ جیونہ کے نام سے مشہور ہیں، کا مزار شریف ہے۔ آپ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے بزرگ تھے۔ آپ کی اولاد میں سے ایک مشہور ہستی سید محمد غوث شاہ صاحب گزرے ہیں۔ آپ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ آپ علاقہ کے رئیس اعظم تھے۔ سات سو مربع زمین کے مالک تھے۔ پیرانہ سالی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حضرت پیر سیال غریب نواز کی شہرت سن کر آستانہ عالیہ کی طرف روانہ ہوئے اور اپنی داستانِ غم مرد خدا کی خدمت میں بصد ادب و نیاز پیش کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا: شاہ جی غم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دو بچے دے گا۔ ایک کا نام صالح شاہ اور دوسرے کا نام راجہ شاہ رکھنا۔ اس مژدۂ جانفزا کو سن کر شاہ صاحب نے حضرت کے دست اقدس پر بیعت کی۔ اللہ تعالیٰ نے مردِ کامل کی زبان سے نکلی ہوئی بات کو پورا فرمایا اور پیرانہ سالی میں دولڑکے عطا فرمائے، جن کو صالح شاہ اور راجہ شاہ کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔ دوسرے سادات کو جب پتہ چلا کہ سید محمد غوث شاہ صاحب نے ایک جٹ کی بیعت کی ہے تو ملامت کرنے لگے کہ تم اتنے رئیس اعظم اور ایک ولی کی اولاد اور پھر سید۔ تمہیں اگر کسی کو مرشد بنانا تھا تو کسی سید کو بنایا ہوتا۔ ایک جٹ کا مرید بننا قطعاً آپ کے شایانِ شان نہیں۔ سید محمد غوث شاہ صاحب نے ان ملامت کرنے والوں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں نے جٹ کے کھیت کو سرسبز دیکھا ہے، تب ہی اس کا فیصلہ کیا ہے۔

Marfat.com

ضلع جھنگ کے ایک دوسرے سید صاحب جو ٹھٹھہ محمد شاہ کے واحد مالک تھے، انہوں نے جب سنا کہ شاہ جیونہ صاحب کے سجادہ نشین نے سیال شریف بیعت کی ہے تو ان کے دل میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق پیدا ہوا اور دل میں یہ طے کیا کہ اگر میری یہ تین شرطیں پوری ہوئیں تو بیعت کروں گا، ورنہ واپس چلا آؤں گا۔ ایک شرط یہ تھی کہ میری جب آپ سے ملاقات ہو تو مغرب کی طرف سے آرہے ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ بتائے بغیر آپ مجھے پہچان لیں اور تیسری شرط یہ تھی آپ مجھے گلاب کا پھول عطا کریں۔ دل میں یہ طے کرنے کے بعد سیال شریف جا پہنچے۔ حضرت کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ حضرت قبرستان تشریف لے گئے ہیں۔ یہ قبرستان سیال شریف سے مغرب کی سمت میں واقع ہے۔ میں ادھر ہی چل پڑا۔ راستہ میں دیکھا کہ اعلیٰ حضرت قبرستان سے شہر کی طرف واپس آرہے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ میری ایک شرط تو پوری ہوگئی، لیکن دیکھتا ہوں کہ دوسری دو شرطیں کیسے پوری ہوتی ہیں۔ میں ادھر سے جا رہا تھا۔ حضرت قبرستان کے مغربی سمت سے شہر کی طرف آرہے تھے۔ راستہ میں ساہیوال کا ایک خادم حاضر ہوا اور ایک پھولوں سے بھرا ہوا لوٹا حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ اتنے میں میں بھی قریب پہنچ گیا۔ حضرت نے پھولوں میں سے ایک پھول اٹھایا اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا: لو شاہ صاحب! یہ پھول لے لو۔ میں اپنی تین شرطوں کو اس حیرت انگیز طریقہ پر پورا ہوتے دیکھ کر اس مردِ خدا کی عظمت کا قائل ہو گیا اور عرض کی کہ حضرت مجھے ابھی بیعت فرمائیے۔ چنانچہ حضرت نے وہیں راستہ میں مجھے شرف بیعت سے سرفراز فرمایا۔

ملک شیر خان مرحوم بندیال کے رئیس اعظم تھے اور حضرت کے نیاز مند بھی۔ رؤسا کی طرح یہ بھی کتوں کے بہت شوقین تھے۔ اعلیٰ نسل کے کتے پال رکھے تھے اور سفر میں بھی انہیں اپنے ساتھ رکھا کرتے۔ ایک دفعہ اپنے مرشد کی زیارت کرنے سیال شریف حاضر ہوئے۔ کتوں کو حویلی میں باندھ دیا۔ شام کی اذان ہو گئی تھی، اس لیے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں چلے آئے۔ ایک پستہ کتا چپکے چپکے پیچھے آ گیا۔ انہیں اس کی خبر نہ ہوئی۔ کتا جو توں

Marfat.com

کی جگہ بیٹھ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرض با جماعت ادا کر کے مسجد سے اپنی عبادت گاہ کی طرف جانے لگے، ایک خادم ہمراہ تھا۔ جب باہر نکلے اور پستہ کتا بیٹھے ہوئے دیکھا، حضرت نے اپنے خادم کو حکم دیا: ملک شیر خاں آیا ہے، یہ کتا اسی کا معلوم ہوتا ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ اس کی حفاظت کرو۔ مبادا عبداللہ سبز پوش اسے مارے۔ ملک کو اپنے کتے بڑے پیارے ہیں۔ (عبداللہ ایک درویش تھا جو آستانہ عالیہ پر کسی کتے کو آنے نہیں دیتا تھا۔ جو کتا اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو اس کی خوب پٹائی کرتا)۔

ملک شیر خان کہتا ہے کہ میں نے حضرت کا یہ ارشاد سنا تو مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ دوڑ کر آیا اور اس درویش سے کہا کہ تم حضرت کے ساتھ جاؤ۔ میں اب اس کی رکھوالی کرلوں گا۔ ملک صاحب لوگوں کو اپنے مرشد کا یہ واقعہ سناتے اور آب دیدہ ہو جاتے۔ حضرت نے مجھے ڈانٹا نہیں، ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ میرے پاس خاطر کے لیے اس کی حفاظت کا اہتمام فرمایا۔ وہ کہا کرتے تھے: اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو آپ کو ضرور ملتی۔ اس کے بعد انہیں کتوں سے اس قدر نفرت ہوگئی کہ انہیں رکھنا ہی چھوڑ دیا۔

آپ کا وجودِ مسعود سراپا کرامت تھا۔ آپ کی نشست و برخاست، گفتار و کردار میں دلوں کو لوٹ لینے والا بانکپن تھا۔ اس کے باوجود آپ انتہائی ضبط سے کام لیتے تھے اور کرامات کے اظہار کو پسند نہیں فرمایا کرتے تھے اور اگر کسی درویش سے کرامات کا ظہور ہوتا تھا تو اسے سخت سرزنش فرماتے۔ اس ضمن میں سید عباس علی شاہ کا واقعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالوی مدظلہ کی روایت سے ہدیۂ ناظرین ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ لاہور گیا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ بلال گنج میں ایک درویش حافظ شفیق احمد قادری رہتے ہیں، ان کی زیارت کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس ساتھی کو لے کر میں حافظ صاحب کے مکان پر گیا، دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا۔ ایک درویش نے بڑے تپاک سے ہمیں خوش آمدید کہا اور پہلے سے آراستہ مسند پر مجھے بٹھایا۔ یہی حافظ شفیق احمد قادری تھے۔ انہوں نے کہا کہ میرے مرشد نے مجھے بتایا کہ آج تیرے پاس ایک مہمان آنے والا

Marfat.com

ہے۔ میں صبح سے آپ کے لیے چشم براہ ہوں اور یہ مسند میں نے اس ہدایت کے مطابق بچھا رکھی ہے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد انہوں نے اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ بتایا کہ میں موسیٰ زئی شریف میں بیعت تھا۔ میرے مرشد کا انتقال ہو گیا۔ میں جس مراقبہ میں سرگرداں تھا، وہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ دن بدن میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ میں روزانہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دیا کرتا۔ کافی عرصہ کے بعد مجھے حضرت داتا صاحب نے خواب میں فرمایا کہ جموں میں سید عباس علی شاہ کے پاس جاؤ۔ وہ تمہاری یہ مشکل حل کرے گا۔ میں گوہر مراد کی تلاش میں جموں پہنچا۔ تلاش بسیار کے بعد میں نے سید عباس علی شاہ کو پالیا، لیکن ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ جس کے لیل ونہار ایک برہمن کی نوکری میں گزرتے ہیں، وہ میری مشکل کیا خاک حل کرے گا؟ چنانچہ اظہار کیے بغیر میں واپس آ گیا۔ ایک بار پھر داتا صاحب نے خواب میں شرف دیدار بخشا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اسی جموں والے درویش کے ہاتھ میں دے دیا اور ان کے پاس جانے کی تاکید فرمائی۔ میں پھر جموں پہنچا۔ جب گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی درویش پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہے۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجذوبانہ انداز میں کہا کہ اب داتا صاحب نے بھی لوگوں کی چغلی کھانی شروع کر دی ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس برہمن کے مکان پر لے گئے جس کی گائیں چرایا کرتے تھے۔ کافی دن انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا، پھر ایک روز مجھے اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے اور خلوت میں ایسی توجہ فرمائی کہ میرا عقدہ حل ہو گیا۔ چشم زدن میں وہ مرحلہ طے ہو گیا جس میں میں عرصہ سے سرگرداں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ میں سید ہوں اور پنڈی گھیپ کے ایک نواحی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ حضرت خواجہ شمس العارفین کا مرید ہوں آپ کی خدمت میں ہی رہا کرتا تھا۔ مجھ سے کرامات کا بکثرت ظہور ہونے لگا تو حضرت نے بطور سزا تیس سال کے لیے مجھے یہاں گائیں چرانے بھیج دیا۔ اب میری سزا ختم ہونے والی ہے۔ میں عنقریب گھر چلا جاؤں گا۔ تم فلاں ماہ کی فلاں تاریخ

Marfat.com

میرے، گاؤں میں آنا۔ جب تم وہاں پہنچو گے تو مسجد میں چند آدمی قل کے لیے بیٹھے ہوں گے۔ وہ تمہیں بتائیں گے کہ ایک شاہ صاحب، جن کا نام عباس علی شاہ تھا ساری عمر باہر رہے، چند روز ہوئے واپس آئے، وہ انتقال کر گئے، آج تیسرا دن ہے۔ شاہ صاحب نے مجھے کچھ روپے دیے کہ وہاں جا کر کھانا پکا کر میری فاتحہ پڑھ کر تقسیم کر دینا۔

میں واپس آگیا۔ جب وہ مقررہ تاریخ آئی تو وصیت کے مطابق میں ان کے گاؤں پہنچا۔ جس طرح انہوں نے بتایا تھا۔ لوگ مسجد میں جمع تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بعینہٖ وہی بات بتائی جو شاہ صاحب نے بتائی تھی۔ میں نے ایصالِ ثواب کے لیے کھانا پکایا اور تقسیم کیا۔ ان کی قبر پر حاضری دی، سلام عرض کیا اور واپس چلا آیا۔

اعلیٰ حضرت کی کرامات جو سورج کی کرنوں کی طرح از خود صادر ہوا کرتی تھیں، بے حد و بے حساب ہیں۔ ان کے احاطہ کے لیے تو دفاتر بھی ناکافی ہیں۔ یہاں صرف دو واقعات عرض کرتا ہوں، جن میں اپنے مریدین کی جان و مال کی حفاظت کے لیے آپ کے روحانی تصرفات کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ یہ دو واقعات اتنے سچے اور متقی لوگوں سے مروی ہیں کہ جن کے بارے میں غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کا گمان تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے واقعہ کے راوی حضرت مولانا معظم الدین صاحب مرولوی قدس سرہٗ ہیں جن کو بارگاہِ عالی میں طویل حاضری کا امتیازی شرف حاصل ہے۔ یہاں یہ واقعہ حضرت شیخ الاسلام سجادہ نشین سیال شریف کی زبان مبارک سے سن کر لکھ رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک روز اعلیٰ حضرت سیالوی قدس سرہٗ ظہر کی نماز کے لیے وضو فرما رہے تھے اور خادم نیاز وضو کرا رہا تھا۔ اچانک حضرت نے اس کے ہاتھ سے کوزہ جھپٹ کر کسی غیر مرئی چیز پر دے مارا۔ خادم پریشان ہو گیا کہ مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ افسردہ خاطر ہو کر مولانا مرولوی کی خدمت میں حاضر ہوا جو قریب ہی ایک حجرہ میں مقیم تھے اور یہ ماجرا بیان کیا۔ مولانا نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فقیر کا کوئی کام حکمت کے بغیر نہیں ہوا کرتا۔ تم اس کوزہ کی ٹھیکریاں سنبھال کر رکھ لو۔ واپس آیا تو ٹھیکریاں بھی موجود نہ

Marfat.com

تھیں۔صرف چند ٹکڑے پڑے ہوئے ملے جو اس نے سنبھال کر رکھ لیے۔ چند ماہ بعد ایک بخارا کے علاقہ کا آدمی وہاں پہنچا جو فارسی زبان بولتا تھا۔ جب سیال شریف پہنچا اور حضرت کی زیارت کی تو زور سے کہنے لگا: "ہمیں بود، ہمیں بود" یعنی یہی وہ شخص ہے، یہی وہ شخص ہے۔ہم نے اس سے ماجرا پوچھا تو اس نے بتایا کہ بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگا کرتا تھا کہ الٰہ العالمین مجھے غوث زماں کی زیارت کی سعادت نصیب فرما۔ مجھے حضرت کی زیارت کرائی گئی اور سیالاں کا نام بھی بتایا گیا۔ میں اپنے علاقہ سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔راستہ میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ ایک شیر گرجتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے پکارا: "اے سیالاں کے غوث! میری مدد کر"۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیر کے ماتھے پر ایک کوزہ آ کر لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کوزے کی ٹھیکریاں اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیں۔ جب پشاور سے آگے آیا تو سیالاں کے بارے میں دریافت کیا۔ کسی نے مجھے سیالکوٹ کا پتہ دیا۔ میں وہاں پہنچا۔آپ کو گلی گلی، کوچے کوچے تلاش کیا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وہاں سے مجھے کسی نے جھنگ سیال کا پتہ بتا دیا، وہاں پہنچا، لیکن جس کی تلاش تھی وہ نہ ملا۔ میں حیران و پریشان تھا کہ اس شہر کا سراغ کیسے لگے؟ کسی نے مجھے ساہیوال جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس طرح پوچھتا پوچھتا سیال حاضر ہوا۔ جب اس نے وہ ٹھیکریاں پیش کیں اور ہم نے ان کو جوڑا تو وہ ہو بہو حضرت کا کوزہ تھا۔صرف چند جگہ سے کچھ ٹھیکریاں غائب تھیں۔ ہمارے پاس جو تھیں وہ ہم نے وہاں جوڑیں، مکمل کوزہ بن گیا۔ یہ واقعہ حضرت کی ظاہری زندگی کا ہے۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے اور حضرات اولیائے کرام کے تصرفات پر برہان قاطع ہے۔ اس کی تفصیل تو آپ ضیائے حرم کے شمس العارفین نمبر میں حضرت صاحبزادہ حافظ محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم معجز رقم سے مطالعہ کریں گے۔ یہاں اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں کھیرے میں ایک سادات کا خاندان ہے۔ اس کے ایک بزرگ حضرت سید الٰہ بخش شاہ صاحب بڑے عالم و فاضل تھے اور اعلیٰ حضرت سیالوی کے

Marfat.com

نیاز مند تھے۔ حضرت بھی ان پر خصوصی لطف وکرم فرمایا کرتے تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد سیال شریف میں ان کی حاضری پہلے کم ہوئی، بعدازاں آمدورفت کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ حضرت قبلہ ثانی صاحب کے عہد میں یہ اطلاعیں آنے لگیں کہ شاہ صاحب نے اپنے گاؤں میں الگ کعبہ بنالیا ہے۔ اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اسی کے گرد طواف کرتے ہیں۔ حضرت ثانی صاحب سنتے تو بصد افسوس فرماتے: بیچارے شاہ کو کوئی مغالطہ لگ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے۔ ان کی یہی حالت رہی۔ حتیٰ کہ حضرت ثانی صاحب نے رحلت فرمائی اور حضرت خواجہ ضیاء الحق والدین مسند آرائے سیال شریف ہوئے۔

ایک دفعہ حضرت ثانی صاحب کے عرس مبارک پر یہ غل برپا ہوا کہ کعبہ بنانے والے شاہ صاحب آئے ہیں۔ ہم (حضرت صاحبزادہ عبداللہ صاحب) بھی ان کو دیکھنے کے لیے گئے اور ان سے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے پہلے تو اظہارِ حال سے معذرت چاہی، لیکن پھر ہمارے شدید اصرار پر یوں گویا ہوئے:

میرے حضرت کے وصال کے بعد کچھ عرصہ تو میں ان وظائف واوراد کو پابندی سے ادا کرتا رہا جو میرے شیخ نے مجھے بتائے تھے، پھر مجھے غیب سے آوازے آنے لگے کہ اے الہ بخش! تو میرا محبوب ہے، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تو خود کعبہ بنا اور سنت خلیلی کو زندہ کر۔ میں حیران تھا کہ مجھ سے پہلے بھی کئی اولیائے کرام کو خلعت محبوبیت عطا ہوئی، لیکن کسی نے نیا کعبہ نہیں بنایا۔ میں یہ جسارت کیسے کر سکتا ہوں؟ ایک سال تو میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا لیکن اس کے بعد غضبناک لہجہ میں دھمکیاں ملنے لگیں، جن کی تاب نہ لا سکا۔ اس طرح میں ایک کوٹھا بنا کر اس کے گرد طواف کرنے لگ گیا۔

کچھ مدت گزری تو غیبی آوازوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے کہا جاتا کہ سنت خلیلی تو تم نے ادا کر دی، اب سنت اسماعیلی ادا کرو اور ذبیح اللہ کے مقام پر فائز ہو جاؤ۔ میں نے سوچا کہ یہ تو خودکشی ہے جو حرام ہے۔ میں اس کا ارتکاب ہرگز نہیں کروں گا۔ کافی عرصہ میں اپنی ضد پر اڑا رہا، لیکن پھر تو جھڑکیوں اور سرزنشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ تو کیسا محبوب

Marfat.com

ہے کہ اپنے مالک حقیقی کے حکم پر جان بھی نہیں دے سکتا؟ تجھ سے تو وہ ہندو زن بہتر ہے جو اپنے خاوند کی ارتھی پر بیٹھ کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ اگر تو ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا تو کیا تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا؟ روز حشر کیا منہ لے کر ہمارے روبرو حاضر ہو گا؟ آئے روز کی ان جھڑکیوں نے مجھے بے بس کر دیا اور میں اپنا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو گیا۔ ایک روز تیز استرا لے کر اپنی گردن پر چلا دیا۔ فوراً میرے شیخ حضرت خواجہ شمس العارفین بجسم ظاہر تشریف لے آئے۔ میرے ہاتھ سے استرا چھین کر دور پھینک دیا۔ فرمایا: خبردار! اے الہٰ بخش! یہ رحمانی آواز نہیں شیطانی ہے پھر آپ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

یوں میں اپنے مرشد کامل کی دستگیری سے دوزخ کا ایندھن بننے سے بچ گیا۔ شاہ صاحب نے گردن پر استرے کا وہ زخم بھی دکھایا جو ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا، وہ اڑھائی انچ کے برابر تھا۔

بے شک عارف رومی نے سچ کہا ہے:

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث طیبہ اس کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أَكُونَ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَ بَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ۔ (بخاری شریف ج ۲ ص ۹۶۳ وزارت تعلیم)

ایک روز حضور پیر سیال، سیال شریف میں تشریف فرما تھے، ہزاروں لوگ جمع تھے، صبح کا وقت تھا، حضور اپنے حجرہ میں اپنے اوراد و وظائف پڑھ رہے تھے اور قوال الگ الگ جگہ دردِ سوز سے محبت بھرے اشعار سنا کر لوگوں کے ایمان کو تازہ کر رہے تھے۔ قوالوں کی آواز جب حضور نے سنی تو دل میں ان کے سننے کا شوق پیدا ہوا۔ وظائف سے فراغت پا کر حضور حجرہ سے نکل کر مجلس میں تشریف لے آئے۔ قوال حضرت کے عظمت و جلال کے باعث خاموش ہو گئے۔ حضور نے فرمایا:

چوں در خسرد آمد مے در سبو نماند

Marfat.com

حضور کے ایک خادم مولانا حفیظ ماہی صاحب نے جب یہ سنا تو عرض کی کہ عالی جاہ! ابھی حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ چنانچہ قوالوں نے اپنے درد بھرے انداز سے یہ غزل پڑھنی شروع کی:

شراب عشق کاندر جام کردند
نصیب عاشق بدنام کردند
ثنائے زلف و رخسار تو اے ماہ!
ملائک ورد، صبح و شام کردند

قوال یہ غزل گا رہے تھے اور حضور انور پر وجد و کیف کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ضبط اور وقار کا یہ پہاڑ جو بڑے سے بڑے واردات کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتا تھا، اس نے اپنے دلی جذبات کو کبھی ظاہر ہونے کی اجازت نہ دی تھی، آج فرطِ ذوق وشوق سے بے تاب ہو گیا۔ حضور کی چشم پرنم سے ایک رنگین آنسو ٹپکا اور دایاں زانو اٹھا اور دوسرے کو دبا لیا۔ اس وقت ساری فضا میں کیف و مستی کا ایک عجیب سماں تھا اور محبوب کی محبت میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ بڑے بڑے خواص اپنے ضبط و ہوش سے محروم ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں اس محفل میں محبت و عشق کی دولت کس فیاضی سے تقسیم ہوئی کہ ہر شخص اپنے دامن مراد کو محبت خداوندی اور عشق رسالت پناہی سے مالا مال پا رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت فقط کشور فقر و درویشی کے تاجدار ہی نہ تھے، بلکہ ظاہری علوم وفنون میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ قرآنِ کریم کی آیات طیبات کی تفسیر، نبی رحمت ﷺ کی احادیث مبارکہ کی تشریح اور اکابر علمائے ربانیین کے اقوال کی توضیح، جب آپ اپنی زبانِ فیض ترجمان سے کرتے تو بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے۔ مثنوی کے پہلے دو شعروں کی جو توضیح حضرت نے اپنی محفل میں ایک روز فرمائی، مولانا امام دین، صاحب مراۃ السالکین کی زبان سے سماعت فرمائیے:

Marfat.com

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

بشنو کا آمر حق سبحانہٗ وتعالیٰ ہے مولوی معنوی کی زبان حق ترجمان پر۔ اور مامور اس کا طالب ذات باری تعالیٰ۔ اور نے سے مراد عموماً انسان کامل اور خصوصاً ذات مقدس مولوی معنوی۔ اور جدائی سے مراد مہجوری اور دوری، روح کی مرتبہٗ احدیت اور بے رنگی اور لاتعین سے ہے، اور شکایت سے مراد روح کا ابتلاء کثرت اور ناسوتی کے رنگ میں یعنی نزول وجود مطلق کا بیج مراتب تنزلات کی طرف موجودات کا مقید ہے۔ جیسا قولہ تعالیٰ رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُوالْعَرْشِ میں تنزلات ششگانہ کی طرف اشارہ ہے اور نائی نے سے مراد عشق کے سالک کا دل ہے۔ وہ گویا عین ذات، حق تعالیٰ کی ہے۔ جب مفردات کے معنی معلوم ہوئے، پس حاصل مطلب یہ ہوا کہ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ منصب میر اتخن سرائی مثنوی میں، نے سے زیادہ نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں عشق کے نے کی آواز ہے میری آواز نہیں۔

از وجود خود چو نے گشتم تہی
نیست از غیر خدایم آگہی
بالب دمساز خویشم کرد جفت
ے نیارم بر لب الا آں چہ گفت
از نیستاں تامرا ببریدہ اند
از نفیریم مرد و زن نالیدہ اند

نیستاں سے مراد ارواح کا ذات اجتماع صفات کے ساتھ پردۂ غیب میں ہے۔ اس لیے کہ ارواح، بلکہ تمام عالم اس مرتبہ میں ذرے میں مندرج تھے۔ کالشجر فی البنات، مثل درخت مع شاخ و برگ وگل وثمر وغیرہ کے، جو تخم میں پوشیدہ اور مندرج ہوتا ہے۔ یعنی ذات اسباب کی قابلیت رکھتی تھی کہ جس صورت میں چاہے اپنے آپ کو ظاہر کرے اور نفیر سے مراد جدائی اعتباری، جو اسماء وصفات کے ظہور میں پیش آئی اور مرد سے مراد اسماء وصفات

Marfat.com

فاعلی اور زن سے مراد اسماء وصفات انفعالی ہے۔ (ص ۵۵۴، مرأة السالکین)

ہم دیکھتے ہیں کہ معقول ومنقول کے یکتائے روزگار علماء آپ کے نیازمندوں کی صف میں بصد ادب واحترام سر جھکائے بیٹھے ہیں اور حضرت کے علم وفضل سے اس قدر مرعوب ہیں کہ لب کشائی کی جرأت مفقود ہے۔ اپنے نورانی عہد میں جس کثرت سے علمائے ظاہر حضرت کے آستانۂ قدسی پر حاضر ہو کر فیضیاب ہوئے، اس پائے کے علماء اتنی بڑی تعداد میں ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ حضرت قبلہ سید پیر مہر علی شاہ صاحب جو بجا طور پر نابغۂ عصر تھے، وہ آپ کے چشمۂ فقر ودرویشی سے بھی سیراب ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے دسترخوان علم وفضل کے سامنے دم بخود نظر آتے ہیں۔ اپنے بے نظیر علمی کارناموں کو محض اپنے پیر ومرشد کا فیض اور روحانی تصرف سمجھتے ہیں اور بار بار اس کا برملا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ یہاں ہم مہر منیر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

"رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ لاہور میں قادیانی معرکہ سے مظفر ومنصور ہو کر واپس آئے تو جناب حضرت ثانی صاحب سیالوی کا مبارک نامہ پہنچا۔ اس کے جواب میں لکھا:

کہ یہ مبارکیں عالمگیر خطۂ خاک پاک سیال شریف کو شایاں ہے۔

از رہ گزرے خاک سر کوئے شما بود
ہر نافہ کو در دست نسیم سحر افتاد

اپنے شیخ کریم حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان اور فیضان میں بے ساختہ یہ بیس اشعار وحدت وجود کے رنگ میں قلمبند فرمائے ہیں اور انہیں ظاہر کیا ہے کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکا ہے وہ اسی شمس نورانی کے نورِ مطلق کی بدولت ہوا ہے، جو میرے اندر کارفرما تھا۔ حضرت نے سیف چشتیائی میں بھی ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ گویا میرے شیخ میرے پاس موجود ہیں اور اپنی توجہ سے مدعی قادیان کے جواب میں یہ دلائل میرے قلب میں القاء فرما رہے ہیں۔ اس خط کے آخر میں آپ نے

Marfat.com

اپنے مرشد برحق کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو مکمل کسی دوسرے مقام پر ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں اس کے چند اشعار ذکر کیے جا رہے ہیں:

شمس نورانی کہ نور مطلق است
در ہماں آفاق نورش مطبق است
گر ندادے نام یاکت دست را
کس ندیدے در جہاں ایں مست را
ہر دو عالم در ہوائش باختہ
پائے از دیدہ براہش ساختہ
سیما آں سر دبستان خدا
شاہباز قدس، آں شمس العلی

حضرت کے سوانح نگاروں نے حضرت کے چند اشعار بھی اپنے تذکروں میں نقل کیے ہیں، جن سے حضرت کے ذوق رفیع، قادر الکلامی اور جذبۂ عشق ومحبت کی طغیانیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ آپ کے استاد حضرت مولانا محمد علی صاحب نے ایک غزل لکھ کر اپنے مرشد کی خدمت اقدس میں روانہ کی جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا:

شہید تیر آں ترکم کہ از ابرو کمال دارد

مولانا نے اپنے شاگرد رشید کو بھی فرمایا کہ تم بھی اس زمین میں غزل کہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں نے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا، لیکن استادِ محترم کے حکم کی تعمیل میں یہ غزل موزوں ہوگئی:

مقیم کوئے آں شاہم کہ اعلیٰ آستاں دارد
ملوکش جملہ مفتون و ملائک پاسباں دارد
مثال عشق با آں شہہ خوبان عبرانی
چوں آں زالے کو درست تیندہ ریشماں دارد

چہ طاقت بندۂ عاجز را کہ با مولا سخن راند
ولے از لطف و رحم او نظر بر فیض آں دارد

آپ سے پنجابی کے چند اشعار بھی منقول ہیں جو حضرت نے اپنے مرشد کامل کی وفات کے موقع پر فرمائے تھے:

تانگ تساڈی دی سانگ مینوں میری چانگ آسمانوں تے جاری اے
برہوں تیر فراق دا چیر گیا، مارو پیر کلیجڑے دی کھاری اے
بھکھ، مکھ تساڈے دے، دیکھنے دی خوش چین سو مینوں رجھا رئی اے
شمس روگ لگا تن بھوگ میرے ملاں ہور طبیب بجھا رئی اے

اس مختصر مقالہ میں اتنی وسعت کہاں کہ فیض وعطا کے اس بحر بیکراں کے حالات کا احاطہ کرسکے۔ اس ناچیز کے پاس نہ وہ آنکھ جو جمال شمس الہدیٰ کو دیکھنے کی تاب رکھتی ہو، نہ وہ دل جو عالم محبت کی ان لطافتوں اور نزاکتوں کا آشنا ہو، نہ اتنا علم کہ اس فیاض جہاں کے کارناموں کو تفصیلاً بیان کرسکے اور نہ ہی وہ قلم جو نوک زبان پر ان اسرار و معارف کو لا سکے۔ دیکھنے والے اور پہچاننے والے حضرت پیر سیال کے فیض یافتگان میں سے کسی کو دیکھ لیں۔ خود ہی استاد کامل کے کمال کا پتہ چل جائے گا۔ انیسویں صدی کے تاریک ماحول میں اس محبوبِ الٰہی نے جو شمعیں روشن کیں، ان ایام میں جبکہ خزاں کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں، جس کی مسیحا نفسی نے خزاں زدہ گلشن کو آشنائے بہار کیا، اس کی عظمت کا ذکر کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟

حضرت سے فیض یافتگان کا شمار تو کہاں؟ حضرت نے جن طالبان حق کو واصل بحق کر کے خلافت بخشی ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔ جلالپور، گولڑہ، خواجہ آباد، مرولہ، بھیرہ، لاہور، ڈیرہ غازیخان میں چشتی خانوادوں کی جو خانقاہیں دین کی عظیم تر خدمات انجام دے رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ سب اسی مرشد کامل کی نگاہِ کرم کا فیض ہے۔ جس کے چشمے یہاں بھی اور عرب وعجم میں بھی بہہ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس شمس الہدیٰ کی تابناک کرنوں سے

Marfat.com

اپنے تاریک دل منور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جس طرح آپ پڑھ چکے ہیں کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی ولادتِ باسعادت ۱۲۱۴ھ میں ہوئی۔ چھتیس سال کی عمر میں یعنی ۱۲۵۰ھ میں آپ کو اپنے شیخ طریقت نے خلافت عطا فرمائی۔ چنانچہ آپ نصف صدی تک مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز رہے۔ اپنی صوری اور معنوی رعنائیوں سے دلوں کو فریفتہ کرتے رہے۔ اپنے روحانی تصرفات اور باطنی توجہات سے بندگانِ خدا کا ٹوٹا ہوا تعلق اپنے رب سے جوڑتے رہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے باکمال خلفاء، ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور بڑے سوز و گداز سے دعوتِ حق میں مشغول ہو گئے۔ افسردگی، غفلت نے جہاں ڈیرے جما رکھے تھے وہاں ذکر و فکر کی محفلیں ذہنوں کو جلا اور دلوں کو ضیاء بخشنے لگیں۔ ویران مسجدیں آباد ہوگئیں۔ گوشے گوشے سے اللہ اکبر کی دلنواز صدائیں اور حی علی الصلوٰۃ کی روح پرور دعوتیں فردوس گوش بننے لگیں۔ آپ کے خلفاء نے اپنے اپنے مقام پر خانقاہیں قائم کیں۔ ساتھ ہی قرآن و سنت کی تدریس و تعلیم کے لیے مدارس معرضِ وجود میں آ گئے۔ ہر خانقاہ حال و قال کا ایسا حسین امتزاج پیش کرنے لگی کہ عقول اور قلوب دونوں سیراب ہونے لگے۔

آپ کے دست حق پرست پر جس نے بھی بیعت کی، اس کا دل فسق و فجور کی آلائشوں سے متنفر ہوگیا۔ ذکر الٰہی کے بغیر اسے قرار ہی نہیں آتا تھا۔ شریعت کی پابندی اس خانوادہ کا امتیازی نشان ہے۔

پچاس سال یہ شمس منیر مطلع رشد و ہدایت پر نور افشانیاں کرتا رہا اور جس کا بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ اس تاجدار فقر و معرفت کے ساتھ قلبی ربط قائم ہوا، اس کی دنیا بدل گئی اس کا بخت خفتہ بیدار ہوگیا۔

انتقال پر ملال

جب ۱۳۰۰ھ کا آغاز ہوا۔ محرم الحرام کی پندرہ تاریخ تھی۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے ولی عہد اور فرزند ارجمند حضرت خواجہ محمد الدین صاحب (جو حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

کے لقب سے معروف ہیں) کو اپنے خاص حجرہ میں بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور ارشاد فرمایا: اے فرزند! دنیا کے حالات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی خوشحالی، کبھی تنگدستی۔ ہمارے دادا صاحب کئی گاؤں کے مالک تھے اور دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔ اس طرح والد ماجد بھی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب میرا زمانہ آیا، میں نے تحصیل علوم کے لیے سفر اختیار کیا۔ بعد ازاں خواجۂ خواجگان محمد سلیمان تونسوی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی۔ دن بدن معاشی حالت بگڑنے لگی۔ یہاں تک کہ فاقہ کی نوبت آنے لگی اور کبھی کبھی تو سات سات دن فاقہ میں گزر جاتے، لیکن میں نے یہ راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور خواجہ تونسوی کی برکت سے کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن اس دنیائے فانی کی کسی چیز کے ساتھ مجھے قطعاً کوئی الفت نہیں۔ البتہ دو چیزوں سے مجھے پیار ہے، کیونکہ یہی دونوں چیزیں پیرانِ عظام سے مجھے مرحمت ہوئی ہیں۔ اول محبت درویشاں، دوم اطاعت پیر و مرشد۔ تم توکل، تسلیم اور صبر و قناعت کو اپنا معمول بنانا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آنا۔ درویشوں اور عالموں سے محبت رکھنا۔ صاحبزادہ صاحب (ثانی صاحب) نے حضور سے التماس کی کہ یا حضرت! دولت ظاہری کی حاجت نہیں ہے، نعمت باطنی جو پیرانِ عظام نے آنحضرت کو عطا فرمائی ہے، اس سے عنایت فرمائیے۔ حضور نے ارشاد فرمایا: ''املاک ظاہری قبول کرو۔ املاک معنوی باطنی سے اللہ تعالیٰ تم کو مالا مال فرمائے گا''۔ صاحبزادہ صاحب نے پھر گزارش کی، میری تمنا ہے کہ حضور چالیس برس تک اور سلامت رہیں تاکہ اس چشمۂ شیریں سے پیاسے سیراب ہوتے رہیں۔ یہ سن کر حضرت خاموش ہو گئے، پھر فرمایا: اے فرزند! ہمیں چالیس روز تک جینے کا بھی اعتبار نہیں، کیونکہ میں نے اپنے پروردگار سے یہ التجاء کی ہے کہ میری عمر، میرے پیر و مرشد خواجہ تونسوی کی عمر کے موافق ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ ماہ صفر میں میرے مرشد نے انتقال فرمایا تھا۔ شاید ہماری رحلت بھی اس ماہِ صفر میں ہووے۔

جدائی کی یہ خبر حضور ثانی کے خرمن صبر و ضبط پر بجلی بن کر گری اور آپ نے زار و قطار رونا

Marfat.com

شروع کر دیا۔ صاحبزادہ صاحب کی آہ وزاری اور بے چینی کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے فرمایا:
اے نورِ چشم! میں چاہتا تھا کہ اسرار یزدانی سے تم کو آگاہ کروں، مگر تم تھوڑی سی بات سے بے خود ہو گئے ہو۔ دنیا کی زندگی کا اعتبار نہیں۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ کے مطابق ہر شخص نے موت کا شربت پینا ہے، پھر آپ نے دوسرے صاحبزادوں، جناب حافظ فضل الدین صاحب، جناب صاحبزادہ شعاع الدین صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اگر مندوبات اور مستحبات تم سے ادا نہ ہو سکیں تو فرائض کو مت ترک کرنا، بلکہ تم پر لازم ہے کہ پیرانِ عظام کی متابعت اور حق تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہو۔

ایک روز حضرت صاحبزادہ محمد دین صاحب کو فرمایا کہ آپ تونسہ شریف میں حضرت خواجہ کریم کی خدمت میں حاضر ہوں، مگر یاد رکھنا، جلدی واپس آنا، دیر مت لگانا۔ چنانچہ حسب ارشاد قبلہ صاحبزادہ صاحب تونسہ شریف روانہ ہوئے۔ ۱۸ ماہ صفر کو نمازِ تہجد سے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو بخار کا عارضہ لاحق ہوا۔ حکماء واطباء نے بڑی کوشش کی، لیکن فائدہ نہ ہوا۔ صاحبزادہ صاحب ۲۱، ماہ صفر کو منگل کے دن تونسہ شریف کی حاضری سے واپس آئے، حاضر خدمت ہو کر مزاج پرسی کی، آستانہ عالیہ کے حالات سے آگاہ کیا اور جو ادویہ آپ واپسی کے وقت لیے کے کسی حاذق طبیب سے لے آئے تھے، ان کا استعمال شروع ہوا۔ آخری عمر میں سماعت کم ہو گئی تھی۔ اس لیے لوگ اپنے حالات لکھ کر خدمت بابرکت میں پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت صاحبزادہ فضل الدین صاحب نے وظائف کی اجازت طلب کی۔ حضور نے ارشاد فرمایا: اے فضل الدین! ہمارے تمام وظائف کی تمہیں اجازت ہے۔ ۲۲ ماہ صفر حضرت خواجہ نے مولانا مرولوی کو فرمایا کہ تم بھی کچھ لکھو۔ مولانا نے صاحبزادوں کی طرف سے ایک درخواست پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آنجناب کے آستانہ عالیہ سے سعادت دارین اور مطالب کونین کے حصول کے لیے بے شمار لوگ آتے ہیں۔ کسی صاحبزادہ صاحب پر نظر شفقت فرمایئے تا کہ خاندان چشت کا یہ فیض ہمیشہ جاری ہے۔ حضور نے درخواست کا مطالعہ فرمایا، لیکن خاموشی اختیار کی۔ تھوڑی

Marfat.com

دیر کے بعد مولانا نے پھر درخواست پیش کی۔ اعلیٰ حضرت نے ملاحظہ فرما کر دعا کے لیے دست مبارک اٹھائے اور زبانِ مبارک سے بھی کچھ فرمایا جو سمجھا نہ جا سکا۔ نقاہت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ صفر کی چوبیسویں رات تھی۔ حضور حاضرین سے بار بار دریافت فرماتے کہ فجر طلوع ہوئی ہے یا نہیں۔ پھر پوچھا آج کون سا دن ہے اور کیا تاریخ ہے؟ کسی نے عرض کیا اے جانِ عالم! آج جمعہ کا دن ہے اور ۲۴ ماہ صفر۔ حضور نے دست مبارک میں تسبیح لے کر چند بار درود شریف پڑھا پھر ذکر پاک انفاس میں مشغول ہو گئے۔ حاضرین کی طرف محبت بھری اور الوداعی نگاہوں سے دیکھا اور قبلہ رو ہو گئے اور علاماتِ وصال آپ پر ظاہر ہوئیں۔ اس طرح شمس مطلع ہدایت ومحبت، نصف صدی تک محبت اور عشق کی دولت لٹانے کے بعد اپنے محبوب حقیقی سے جاملا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

ہر سال ماہ صفر کی ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ تاریخ کو آستانہ عالیہ سیال شریف پر عرس مبارک منعقد ہوتا ہے جس میں آج بھی ملک اور بیرون ملک سے بے شمار مخلوق فیضیاب ہونے کے لیے حاضر ہوتی ہے اور حضرت کے آستانہ عالیہ کے موجودہ سجادہ نشین شیخ الاسلام والمسلمین علامہ حافظ محمد قمر الدین مدظلہٗ الاقدس (1) کی ذاتِ گرامی اپنے علمی کارناموں، دینی عظمت، سیاسی اور ملکی خدمات جلیلہ کے باعث فخر روزگار ہے۔ مولا کریم اس عظیم ہستی کو تا ابد سلامت باکرامت رکھے اور حضرت کے سارے خاندان اور صاجزادگان والا تبار کو ان روحانی، علمی، اخلاقی عظمتوں کا وارث کرے، جو ان کے اسلاف کا حصہ تھیں۔ آمین

1۔ ضیائے حرم کا شمس العارفین نمبر شائع ہونے کے موقع پر حضور خواجہ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ظاہری زندگی کے ساتھ موجود تھے۔

Marfat.com

مولانا الشاہ

احمد رضا خان بریلوی

قدس سرہ العزیز

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جو شخص برصغیر پاک و ہند کی ماضی قریب کی تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ یہ عرصہ کتنا پرآشوب اور ہنگامہ ہائے رستاخیز سے معمور تھا۔ انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل میں اس کے عصری حالات جو فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ اپنے عصر کے تقاضوں سے منفعل اور متاثر ہوتے اور بعض لوگ خود ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے زمانہ کے احوال سے صرفِ نظر قطعاً مستحسن نہیں۔ اس لیے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلسنت حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات کو سمجھنے کے لیے آپ کے عہد کے مزاج کو سمجھنا اور ان تاریخی عوامل کا جائزہ لینا از احد اہم ہے، جو اس وقت کارفرما تھے۔

ذرا چشم تصور کو وا کیجئے اور دیکھئے کہ افق ہند پر ایک ہزار سال تک درخشاں رہنے کے بعد اب مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہوا چاہتا ہے۔ بابر اور اورنگ زیب کی اولاد اب شمشیر وسناں سے راہ ورسم توڑ چکی ہے اور طاؤس ورباب پر فریفتہ ہونے لگی ہے جہاں جوانوں کا خون گرمانے کے لیے رجز پڑھے جاتے تھے وہاں اب عصمت فروش رقاصائیں اپنی پائیلوں کی جھنکار سے غیرت وحمیت کے جذبات کو لوریاں دے رہی ہیں۔ جہاں مائیں بچوں کو خالد وطارق کے قصے سنا کر پروان چڑھاتی تھیں، وہاں اب عشق وحسن کی بدمستیوں کی کہانیاں وجہ تسکین خاطر اور باعث گرمی محفل بن گئی ہیں۔ روحوں کی پاکیزگی، حوصلوں کی بلندی اور عزائم کی پختگی کو عیش وعشرت کی دیمک نے چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے۔ جن کے آباؤ اجداد کے نام سن کر اغیار کے دل لرز لرز جایا کرتے تھے، آج لال قلعہ کی مضبوط اور سنگین دیواریں اور گہری خندقیں بھی دشمنوں کی یلغار سے انہیں پناہ نہ دے سکتیں۔ ملک کے

Marfat.com

طول و عرض میں ہر طرف فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ ایک مملکت سینکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی ہے۔ کہیں مرہٹوں کی بربریت نے کہرام مچا رکھا ہے اور کہیں سکھوں کے وحشیانہ مظالم سے قیامت برپا ہے۔ مغل اقتدار اس کماری اور درۂ خیبر سے سمٹ کر قلعہ معلّٰی میں محصور ہو گیا ہے۔

انگریز اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر اپنی گرفت دن بدن مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ان کے زیر نگیں ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان المناک حالات میں اسلامی حمیت نے پھر جھرجھری لی۔ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے نعرۂ جہاد سے سارا ہندوستان گونج اٹھا۔ فرنگی استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے علمائے حق کفن بدوش، سربکف میدانِ عمل میں اتر آئے۔ ہندوستان کا ہر قابل ذکر شہر میدانِ کارزار بن گیا اور شمع آزادی کو روشن رکھنے کے لیے مسلمانوں نے بے دریغ قربانیاں دیں، لیکن جاہ طلب اور مصلحت اندیش امراء کی غداری اور صحیح فوجی قیادت کے فقدان کے باعث ملک و ملت کے سرفروش مجاہدین کی یہ کوشش بر آور نہ ہو سکی۔ فاتح انگریز کی آتش انتقام بھڑک اٹھی اور جنگ آزادی کے سپاہیوں کو چن چن کر تہ تیغ کیا جانے لگا۔

چونکہ آزادی کا صور اسرافیل پھونکنے والے، جہاد کے نقارہ پر پہلی چوٹ لگانے والے میدانِ جنگ میں کفر و باطل کو للکارنے والے، اکثر و بیشتر علمائے اہل سنت اور ان کے پیروکار تھے، اس لیے انتقام کے شعلے انہیں کی طرف لپکے۔ انگریز کی آتش غضب انہی کے خرمن امن و عافیت کو خاکستر بناتی رہی۔ حریت کیش مجاہدین کو سزا دینے کے لیے جگہ جگہ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ چند سفاک اور خون آشام لوگوں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ مردانِ حر کو جنہوں نے خوشی سے غلامی کی بیڑیاں پہننے سے انکار کر دیا تھا، جو چاہیں سزا دیں۔ ان کا سفاک قلم عدل و انصاف کے سارے تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیتا ہے جلیل القدر فضلاء کو، جن کی نظیر مادر گیتی بار بار پیدا نہیں کرتی، عبور دریائے شور کی سزا دی جاتی ہے۔ سینکڑوں کو جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ ہزاروں علمائے کرام کو درختوں کے تنوں سے باندھ کر گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔

Marfat.com

فطرت بڑی کفایت شعار ہے۔ دیدۂ بینا اور عقل رسا کی نعمت ارزاں اور عام نہیں ہوتی۔ برسوں کی تگ ودو کے بعد کہیں کوئی مردِ حکیم بزم آرا ہوتا ہے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

(کلیات اقبال فارسی ص ۴۶۵، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ایک عالم ربانی کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے، اس کا پر ہونا مشکل ہوتا ہے، یہاں تو سینکڑوں نابغہ روزگار ہستیاں بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھیں۔ ان کی شہادت اور جلاوطنی سے ایک ناقابل تلافی اور ہولناک خلا کا پایا جانا ایک قدرتی امر تھا۔ قوم اپنے ذہنی ارتقاء، علمی نشوونما، تہذیبی اقدار کی حفاظت اور اپنے عقائد کے تحفظ کے لیے علماء کی محتاج ہوتی ہے۔ جب تک قوم میں ایسے مردانِ حر موجود ہوتے ہیں، جن کی نگاہیں حقیقت شناس اور زبانیں حق گوئی میں بے باک ہوتیں ہیں تو کوئی فتنہ قوم کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ ادھر کوئی فتنہ کھڑا ہوا، ادھر ان کی تلوار بے نیام ہوئی اور بجلی بن کر گری اور اس فتنہ کو خاک کا ڈھیر بنا دیا، لیکن جب ایسے نفوس سے قوم کی بزم خالی ہو جاتی ہے تو ہر بہروپیے کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ اپنی شاطرانہ چابکدستی سے لوگوں کو اپنے دامن تزویر میں پھنسا لیتا ہے۔ جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ملت اسلامیہ کو اس قسم کے حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ اس طوفان نے ان دہکتے ہوئے ان گنت چراغوں کو گل کر دیا جن سے رشد و ہدایت کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف مایوسی اور اداسی کے اندھیرے چھا گئے، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اہل نظر کو ایک بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ انگریز کا ہندوستان پر تسلط فوجی قوت کی بالادستی میں محدود نہ تھا، بلکہ ان کے ہمرکاب ان کی مادی ترقی کی مبالغہ آمیز داستانیں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ سائنس کے جدید اور تعجب خیز انکشافات بھی تھے۔ ان کے پاس صنعتی اور فنی محیر العقول ایجادات بھی تھیں۔ مزید برآں وہ ایک ملحدانہ فلسفۂ حیات بھی اپنے ہمراہ

لائے تھے۔ ان میں سے ہر ایک چیز مفتوح اور مغلوب قوم کے متاعِ ہوش و خرد کو لوٹ لینے کے لیے کافی تھی۔ دشمن بڑے مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر یہاں آیا تھا اور یہاں اس کی دعوتِ مبارزت کو قبول کرنے والے اور اس کی نخوت و رعونت کو خاک میں ملانے کا دم خم رکھنے والے یا تو اپنی پر انوار مرقدوں میں آرام فرما تھے یا اسیرانِ زندانِ جفا۔ میدان خالی تھا۔ انگریز نے اسلامی حکومت کا چراغ گل کرنے کے بعد انہیں دولت دین و ایمان سے محروم کرنے کا بھی عزم بالجزم کر لیا، کیونکہ ملت صالح اور حکیمانہ قیادت سے محروم ہو چکی تھی۔ اس لیے بعض نوجوانوں کو، جن میں حکمت کی متانت کم اور جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے، انگریز نے اپنے دامِ فریب میں آسانی سے اسیر کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی کھیتی تیار ہو گئی، جن کے قلب و نظر کو اغیار کی عشوہ طرازیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ برملا اسلامی تعلیمات کا استخفاف کرنے لگے۔ دین کے اصول، دین کے مسلمات کا انکار ان کے لیے قطعاً کوئی اہم بات نہ رہی۔ انہیں اپنے اسلامی تمدن سے بھی گھن آنے لگی۔ وہ اپنے تاباں ماضی سے بھی نفرت کرنے لگے اور اپنے اسلاف کرام سے قطع تعلق کرنے میں ہی اپنی عزت اور توقیر سمجھنے لگے اور خود خوشامد پسند کاسہ لیسوں کے سرخیل ہوتے ہوئے ان پیکرانِ استغناء، واستقامت پر تملق پیشگی اور شاہ پرستی کی تہمت لگانے لگے، جن کی سیر چشمی اور بے نیازی کی قسم فرشتے بھی کھا سکتے ہیں۔

غرضیکہ ہر وہ چیز جو اسلام کے تقدس اور روحانی عظمت کی آئینہ دار تھی، اس کو بے توقیر اور بے وقعت کر دینے کی کوشش کو خدمت اسلام کا نام دیا جانے لگا۔ عظمت اسلام کو ہدف طعن بنانے کی خدمت وہ نوجوان انجام دینے لگے، جو ملت کی امیدوں کا مرکز اور خوابوں کی تعبیر بننے کی اہلیت رکھتے تھے۔ شجر اسلام کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے وہ لوگ پیش پیش تھے، جن کے آباؤ اجداد نے اپنے خونِ ناب سے اسے سینچا تھا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشہ کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

Marfat.com

نور دیدۂ پیر کنعان، چشم زلیخا کو کیوں روشن کرنے لگا؟ اپنوں سے کٹ کر بیگانوں سے محبت کی پینگیں کیوں بڑھانی شروع کر دیں؟ ضروریاتِ دین اور مسلمات پر اس کا یقین کیوں متزلزل ہو گیا؟ آیاتِ قرآنی کی بے جا تاویلات بلکہ تحریفات کی جرأت اس میں کیوں پیدا ہو گئی؟ یہ سوالات اتنے غیر اہم نہیں ہیں کہ ان سے پہلو تہی کر کے انسان آگے گزر جائے، بلکہ یہ ہر مخلص مسلمان کے لیے دعوتِ فکر ہے، جن پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔ میرے نزدیک اس کے کئی اسباب تھے۔ سیاسی ادبار کے بعد احساس کمتری، جدید فاتح قوم کی مادی قوت، علمی سر بلندی اور دل ونظر کو مسحور کر دینے والے افکار و نظریات اور ایسے علماء کا فقدان، جو ان عوامل و محرکات کی طغیانیوں کے سامنے سد سکندری بن کر کھڑے ہونے کی ہمت رکھتے ہوں۔ ان کے علاوہ ایک ایسی تحریک، جس نے مسلمانوں کے دل سے حضور نبی کریم ﷺ کی عظمت کے نقوش دھندلا دینے کے بعد محبت حبیب کبریا علیہ اطیب التحیۃ والثناء کے چشمۂ فیاض کو گدلا کرنے کی مساعی کو دین حق کی صحیح خدمت خیال کر لیا۔ جب آنکھیں خاکِ مدینہ و نجف سے سرگیں نہ ہوں تو دانش فرنگ کے جلوے اسے بہ آسانی خیرہ کر لیتے ہیں۔ جب دل محبوبِ رب العالمین کے صہبائے عشق سے سرشار نہ ہو تو نفس کی ہوسنا کیاں اسے بآسانی بدمست کر سکتی ہیں۔ جب ذہن کی لوح پر عظمت مصطفیٰ ﷺ کا نقش، جلی قلم سے مرقوم نہ ہو تو اس لوح پر آپ کوئی سا نقش بھی کندہ کر سکتے ہیں۔ جب سرور عالم و عالمیان سے بندۂ مومن کا رشتہ عقیدت ٹوٹ جائے تو اس کو ہر صیاد اپنا نخچیر زبوں بنا سکتا ہے۔

سیاسی ادبار کے ساتھ ذہنی اور فکری اتحاد بھی پارہ پارہ ہونے لگا۔ وہ اساسِ محکم کمزور ہونے لگی جس کے سہارے فقر اسلام حوادثاتِ دہر کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایسی چیزیں بھی ظہور پذیر ہونے لگیں جن کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان میں سے ہی ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

دین کے ایک ایک مقصد سے برملا غداری کی۔ جہاد کو حرام کر دیا۔ اتنی جسارت کے

Marfat.com

باوجود اسی ملت میں سے اسے اپنے حواری تلاش کرنے میں بھی کوئی دقت نہ ہوئی۔ جو سانحہ اسلام کی تیرہ صد سالہ تاریخ میں رونما نہیں ہوا تھا، وہ انگریزی اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتے ہی وقوع پذیر ہو گیا۔

ان حالات میں بریلی کے ایک معزز خاندان میں ایک روحِ ارجمند تشریف فرما ہوئی، جس کے مقدر میں ان تمام داخلی اور مذہبی فتنوں سے نبرد آزما ہونا رقم تھا اور پیکر حسن و جمال، مصدرِ جود و نوال، منبع فضل و کمال اور مرکز عشق و محبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملت کا رشتۂ عقیدت و نیاز مندی استوار کرنا تھا۔ رحمت الٰہی نے بڑی فیاضی سے انہیں بے نظیر صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ بلا کا حافظہ، ذہن وقاد، طبع رسا، اقلیم فصاحت و بلاغت کی سروری۔ قدرت کے یہ وہ عطیے تھے، جن میں سبقت تو کجا، کوئی ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی متداول اور غیر متداول علم و فن ایسا نہ تھا، جس میں آپ کی قابلیت کا لوہا نہ مانا جاتا ہو۔ علومِ دینیہ، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں آپ کو جو عدیم النظیر مہارت حاصل تھی، اس میں تو کسی کو کلام نہیں، لیکن ریاضی، تکسیر اور نجوم وغیرہا علوم جن کے مبادیات سے بھی اکثر فضلاء بے خبر ہوتے ہیں، ان علوم میں آپ کے تبحر، مہارت کا یہ عالم تھا کہ چوٹی کے ریاضی دان مشکل سے مشکل مسائل حل کرانے کے لیے آپ کی بارگاہ کا رخ کیا کرتے تھے اور جن مسائل کو وہ لا ینحل قرار دے چکے ہوتے، آپ اشاروں اشاروں میں حل کر کے انہیں محو حیرت کر دیتے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے زمانے میں ریاضی کے مسلم ماہر تھے۔ حضرت مولانا شاہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ پروفیسر دینیات مسلم یونیورسٹی نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ریاضی کے چند مسائل میں متفکر ہیں اور وہ حضرت سے مل کر ان کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اجازت ہو تو شرف باریابی حاصل کریں۔

اعلیٰ حضرت نے بصد مسرت اجازت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب چند روز بعد بریلی تشریف لے گئے۔ نماز عصر کا وقت تھا نماز ادا ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت اپنی مسند

Marfat.com

پر تشریف فرما ہوئے اور سلسلۂ گفتگو شروع ہوا۔ دورانِ گفتگو اعلیٰ حضرت نے اپنا ایک قلمی رسالہ جس میں مثلث اور دائرے کے اشکال بنے ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کیا، جس کو دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے اور بولے کہ میں نے اس علم کو حاصل کرنے کے لیے بارہا غیر ممالک کے سفر کیے مگر یہ باتیں کہیں بھی حاصل نہ ہوئیں۔ میں تو اپنے آپ کو اس وقت طفل مکتب سمجھ رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر یہ فرمائیں کہ اس فن میں آپ کا استاد کون ہے؟ اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میرا کوئی استاد نہیں ہے۔ میں نے اپنے والد ماجد علیہ الرحمۃ سے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کے چار قاعدے اس لیے سیکھ لیے تھے کہ ترکہ کے مسائل میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ شرح چغمینی شروع کی تھی کہ میرے والد ماجد نے فرمایا کہ اس میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو؟ مصطفیٰ پیارے کی بارگاہ سے یہ علوم تم کو از خود سکھا دیے جائیں گے۔ چنانچہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، مکان کی چار دیواری کے اندر بیٹھا خود ہی کرتا رہتا ہوں۔ یہ سب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کرم ہے۔ اس کے بعد کسور اعشاریہ متوالیہ کا ذکر چل پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا بس صرف تیسری قوت تک کا سوال حل کیا جا سکتا ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت نے سید قناعت علی اور سید ایوب علی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے ان دونوں بچوں کو کچھ قاعدے سکھا دیے ہیں۔ آپ انہیں جس قوت کا سوال دے دیں، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بچے حل کر دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب محو حیرت ہو کر دونوں بچوں کا منہ تکنے لگے۔

یہ بے مثل فہم و ذکاء، یہ بے نظیر علم و فضل اور یہ گوناگوں صلاحیتیں قدرت نے کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لیے ارزاں فرمائی تھیں۔ چنانچہ آپ نے پونے چودہ سال کی عمر میں تمام علوم کی تکمیل فرمائی اور اس کے بعد تدریس و تالیف و تصنیف، وعظ و ارشاد، ریاضات و مجاہدات، ان فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہوئے اور آخری دم تک بڑی جرأت، ہمت اور بے باکی کے ساتھ اسلام کے دفاع میں مصروف رہے۔ کوئی فتنہ ہو، اس نے کہیں سر اٹھایا ہو، احمد رضا کا قلم اس پر صاعقہ بن کر گرتا اور اسے خاک سیاہ بنا کر رکھ دیتا۔ مخالفت کی

Marfat.com

آندھیاں اٹھیں، بہتان تراشیوں کے طوفان اُمڈے، لیکن اسلام کا یہ نڈر اور بے باک سپاہی حضور رحمت عالم ﷺ کا عاشق صادق بلا خوف لومۃ لائم سینہ سپر رہا۔ کسی موقع پر نہ اس میں لچک پیدا ہوئی اور نہ پائے استقامت ڈگمگایا۔ آپ کی ساری زندگی حضرت حسان کے اس شعر کی آئینہ دار رہی۔

فَاِنَّ اَبِیْ وَ والدتی وَ عِرْضِی
لِعِرْض مُحَمَّدٍ مِنْکُمْ وِقَاءٌ

(تاریخ ابن عساکر ج ۱۲ صفحہ ۳۹۶ مطبوعہ دار الفکر)

یہ درست ہے کہ آپ کا اصل میدانِ عمل، دین اور علومِ دین کی خدمت کرنا تھا اور آپ کا طبعی رجحان سیاست کی طرف نہ تھا، لیکن آپ کی ایمانی بصیرت اور مومنانہ فراست نے نہ آپ کو بعض لوگوں کی طرح انگریز کا حلقہ بگوش بننے دیا اور نہ کبھی ہندو کا دام زر دار انہیں اپنی گرفت میں لے سکا۔ آپ کے قلب مومن نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اسلامی غیرت اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتی کہ مومن گداگروں کی طرح غیر مسلم حکومت سے مراعات اور عطیات کی دریوزہ گری کرے اور نہ اسے یہ گوارا ہے کہ لالہ جی کے مکر وفریب میں اسیر ہو کر ملت اسلامیہ کا مقدر اس بنیا کے ہاتھ میں دے دیں، جو شرف انسانیت سے بالکل بے بہرہ ہیں، لیکن جب قائد اعظم علیہ الرحمۃ کی قیادت میں ملت مسلمہ نے پاکستان کو اپنی منزل مقصود قرار دیا تو یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ آپ کے مکتب فکر سے وابستہ جتنے علماء و مشائخ، اساتذہ وطلباء، مدارس و خانقاہیں تھیں، سب نے بلا استثناء اپنی کوششیں پاکستان کے حصول کے لیے وقف کر دیں اور اس کے لیے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ جس وقت پاکستان کا نام لینا ہزاروں مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا، جبکہ میدانِ سیاست کے بڑے بڑے روسا اور نواب پاکستان کی حمایت میں ایک لفظ کہنا خود کشی کے مترادف سمجھتے، جب کہ بڑے بڑے مدارس کے فضلا قیام پاکستان کو اسلام کے مزاج کے خلاف یقین کرتے تھے، اس وقت ایک اعلیٰ حضرت بریلوی کا مکتب فکر تھا، جس

کے وابستگان نے چٹا گانگ سے پشاور تک اور سلہٹ سے کراچی تک پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا۔ کیا کوئی اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ یہ آپ کی ایمانی بصیرت کا فیضان تھا؟ یقیناً یہ آپ کے فیض نظر کی برکت تھی۔ یقیناً یہ آپ کے نورِ نظر کا اجالا تھا، جس نے شک وشبہ اور تذبذب اور تردد کے سارے پردے چاک کر دیے۔

آپ کی زندگی کے یہ چند سال، جن کا گوشہ گوشہ علم وعمل کے نور سے منور ہے، جن کا لمحہ لمحہ ذکر خدا اور یاد مصطفیٰ علیہ اجمل التحیۃ والثناء سے معمور ہے، جو دو ہزار تالیفات کی تصنیف سے مشرف ہے، جو پند وموعظت اور ذکر ورشاد کی محفلوں سے گونج رہا ہے، جو پھیلا تو کائنات کی پہنائیوں کو شرمسار کرتا گیا اور جو سمٹا تو عشق مصطفیٰ بن کر رہ گیا۔ یہی آپ کا ایمان تھا کہ حب حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جان اور روحِ دین ہے۔ اس کے پرچار میں آپ نے اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اس کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔

Marfat.com

کتابِ رشد و ہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور و سرور اور جذبہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

تفسیر احکام القرآن 7 جلد

مولانا محمد جلال الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ

آیات احکام کا مفصل لغوی و تفسیری حل، امہاتِ کتبِ تفسیر کی روشنی میں مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

یہ تفسیر طلباء، علماء، وکلاء، ججز اور عوام و خواص کے لئے قیمتی سرمایہ

آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

Marfat.com

شہرہ آفاق، عالمگیر اور متداول مجموعہ ہائے حدیث

صحاح ستہ

کا نیا ایمان افروز
اور
روح پرور ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین
بھیرہ شریف
کی زیر نگرانی

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی نئی کاوش

بخاری شریف
3 جلد

صحیح مسلم
3 جلد

سنن ابی داؤد
3 جلد

سنن نسائی
3 جلد

جامع ترمذی
2 جلد

ابن ماجہ
2 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر
منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

Marfat.com

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی
بھیرہ شریف

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر دُرِّ منثور 6 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضور ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی
یادگار تصانیف

تفسیر ضیاء القرآن ۵ جلد
فہم قرآن کا بہترین ذریعہ
اہل دل کے لیے ایک نایاب تحفہ

جمال القرآن ترجمۃ القرآن
قرآن پاک کا انتہائی خوبصورت ترجمہ جس کے
ہر لفظ سے اعجاز قرآن کا حسن نظر آتا ہے

سیرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتاب
ضیاء النبی ۷ جلد
دردوسوز اور تحقیق و آگہی سے
معمور تصنیف

سنت خیر الانام
فتنہ انکار سنت پر تحقیقی اور تنقیدی کتاب

مقالات ۲ جلد
مختلف علمی، دینی اور سیاسی موضوعات پر جامع مقالات کا مجموعہ

قصیدہ اطیب النغم
خوبصورت نعتیہ قصیدہ پرسوز
اور دلآویز شرح

مجموعہ وظائف مع دلائل الخیرات شریف
مشائخ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ اور دیگر سلاسل
کے معمولات اور اوراد و وظائف کا مجموعہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
گنج بخش روڈ لاہور 042-37221953- Fax: 042-37238010
دالکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 042-37247350 Fax:042-37225085
۱۴ انفال سنٹر اردو بازار کراچی 021-32212011- 32630411
Fax: 021-32210212
Email:Info@zia-ul-quran.com

Marfat.com